بیگم بادشاہ غلام

شوکت تھانوی

برقِ تبسم

شوکت تھانوی



برقِ تبسم

شوکت تھانوی



رابی کتاب گھر
C-20۔ جیوتی کالونی، لونی روڈ، شاہدرہ، دہلی۔110032

نام کتاب : برقِ تبسم
مصنف : شوکت تھانوی
سن اشاعت : ۲۰۰۹ء
قیمت : =/180 روپے
مطبوعہ : فائن آفسیٹ پریس، شاہدرہ، دہلی۔32
ناشر : راہی کتاب گھر، C-20۔ جیوتی کالونی،
لونی روڈ، شاہدرہ، دہلی۔110032

ISBN-81-88645-46-X

'arq-e-Tabbassum
y.: Shaukat Thanvi
rice : Rs.180/=
:dition : 2009
AHI KITAB GHAR
-20, Jyoti Colony, Loni Road,
hahdara, DELHI-110032
lobile : 9818786196

ole Distributors:-
ITAB WALA
794, Gali Jhot Wali,
'hari Bhojla, DELHI-110006
'n.: (O)23281499, 9810277298

انتساب

اپنے بھائی مولانا ارشد تھانوی

کے نام

دنیا میں اب صرف وہی باقی رہ گئے ہیں

جو ہم کو خوبصورت سمجھتے ہیں

شوکت تھانوی



افیونی کی جنت

میر صاحب نے اپنے دونوں گھٹنوں کے اندر سے سر نکالتے ہوئے کہا۔

"بھائی سچ تو یہ ہے کہ غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں۔ چند روزہ زندگی خدا اسی طرح کاٹ دے پھر مرنے کے بعد تو خدا جانے ہم افیونیوں کا کیا حشر ہوگا۔"

مرزا صاحب نے جو اپنی پیالی کے اندر گویا خود ہی حل ہو جانے کے قریب تھے خفیف سا اُبھرتے ہوئے کہا۔ "مرنے کے بعد حشر کیا ہوگا۔ اماں جنت میں ہم افیونی نہ جائیں گے تو اور کون جائے گا۔ ہم نہ کسی کے اچھے میں نہ بُرے میں، نہ ہم کو چوری سے مطلب نہ کسی اور بُرے کام سے۔ بس ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ہم کو تو سچ پوچھیے گناہ کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی اور یہی سب سے بڑا ثواب ہے کہ انسان گناہ نہ کرے۔ پھر بھلا جنت ہمارے لیے نہیں تو کیا ان لوگوں کے لیے ہے جو پینک کو تو بُرا کہتے ہیں مگر دنیا بھر کی روسیاہیوں کو نہیں دیکھتے۔"

خان صاحب نے طلسم ہوشربا کی جلد کے اندر سے نکلتے ہوئے فرمایا۔ "سچ کہتے ہو بھائی مرزا ہم لوگ تو واقعی جنتی ہیں۔ سولہ آنہ جنتی اور جو ہم کو جنتی نہ سمجھے اسے اسی کالی گولی کی مار پڑے۔"

مرزا صاحب نے اپنی نیم وا آنکھوں سے خاں صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اماں آج اس افیون اور ہم افیونیوں پر ہنسنے والے ہنس لیں ہم کو بُرا کہنے والے خوب جی کھول کر بُرا کہہ لیں مگر جب جنت میں دیکھیں گے تو......''

میر صاحب نے بات کاٹتے ہوئے ہمہ تن نون غنہ بن کر کہا۔''جی ہاں پھر پچھتائیں گے کہ زندگی میں اس افیون کی قدر نہ کی جو دنیا بھر کے گناہوں سے بچاتی ہے۔''

خاں صاحب نے چونکتے ہوئے کہا۔'' بھائی بات تو جب ہے کہ ہم افیونیوں کو جنت میں بھی یہی صحبت ملے اور یہی محفلیں گرم رہیں۔ اللہ ہی جانے کہ وہاں افیون بھی ملے گی یا نہیں۔''

میر صاحب نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا۔''یہ بھی آپ نے ایک ہی کہی کہ وہاں بھی افیون ملے گی یا نہیں۔ بھائی یہ تو سمجھو کہ وہاں سوائے افیون کے اور ہوگا کیا۔ میں تم کو اپنا ہی ایک قصہ سناتا ہوں کہ میں نے کیوں کر ذرا اسے دھوکے میں جنت کی سیر کی اور کل حالات معلوم کر لیے۔ ہوا یہ کہ اب سے دور میرا انتقال ہوگیا۔

خان صاحب نے تعجب سے پوچھا۔''ایں کیا کہا انتقال ہوگیا؟ کیا تمھارا انتقال ہو چکا ہے؟''

میر صاحب نے کہا۔''ہاں ہاں بھائی انتقال ہوگیا تھا سنو تو سہی۔ بات یہ ہوئی کہ اوّل تو وقت کچھ ایسا آپڑا تھا کہ دو دن تک پینے کو نہ ملی۔ ایک غیرت دار افیونی کے لیے یہی موت ہے۔ دوسرے ایک عجیب دھوکا یہ ہوا کہ میرے ہی محلّہ میں میرا ایک ہم نام قلعی گر رہتا تھا اس کو ہوا سرسام مگر نام کے دھوکے سے روح میری قبض کر لی گئی۔ اور فرشتے مجھ کو لے کر سیدھے جنت میں پہونچے۔ بس کچھ نہ پوچھئے کہ میں نے وہاں کیا دیکھا۔ سب سے پہلے تو جنت کے دروازہ ہی پر میرا پرانا دوست

منجھو جس کا تین برس ہوئے انتقال ہو چکا ہے ملا۔ اور مجھ کو دیکھ کر تعجب سے پوچھا۔

''ارے بھائی میر صاحب تم کہاں؟''

میں نے اس کو اپنے انتقال پُر ملال کی خبر وحشت اثر سنائی۔ اس کو بھی سخت صدمہ ہوا۔ اور مجھ کو صبر کی تلقین کرنے لگا۔ کہ مشیت ایزدی یہی تھی اب رونے سے کیا ہوتا ہے خدا تم کو نعم البدل دے گا وغیرہ۔ مگر پھر وہ پینک سے خود ہی چونکا۔ اور اس نے کہا کہ اماں میر صاب بھلا یہ افسوس کرنے یا رونے کا کیا مقام ہے؟ اچھا ہوا کہ تم مر گئے۔ خدا ہر افیونی کو مرنا نصیب کرے اور سب مر کر یہاں آجائیں۔ اب تو اس کی اس بددعا پر مجھ کو بھی تعجب ہوا کہ آخر کہہ کیا رہا ہے۔ مگر اس نے میرے تعجب پر مسکرا کر کہا۔ میر صاحب کچھ کو خبر بھی ہے کہ تم جنت میں ہو۔ اس جنت میں جس کو دیکھ کر تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی۔ چلو تم کو ذرا جنت کی سیر کراؤں۔ اس کے اس کہنے پر میں داروغۂ جنت کے دفتر تک گیا بلکہ سیدھا اس کے ساتھ ہوگیا اور اس کے پیچھے پیچھے جنت میں داخل ہوگیا۔ میں تم سے کیا بتاؤں کہ میں نے وہاں کیا دیکھا۔ اماں دیکھتا ہوں کہ نہایت کشادہ سڑکوں پر دو رویہ افیون کے نہایت عالیشان محلات کھڑے ہوئے ہیں۔ اور سڑکوں کے دونوں طرف پوستے کے درخت قطار در قطار لگے ہوئے ہیں۔ جن سڑکوں پر ہم لوگ چل رہے تھے وہ سنگ مرمر کی معلوم ہوتی تھیں مگر سفید رنگ کی باریک ریت اور سفید چمکدار ڈھیلے بھی جابجا پڑے ہوئے تھے۔ میرے دوست منجھو مرحوم نے کہا کہ اس سڑک کو بھی سمجھے کہ کس چیز کی ہے۔ میں نے ابھی کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ اس نے مٹھی بھر دھول اٹھا کر میرے منہ میں ڈال دی۔ بس سمجھ لو کہ منہ سے لے کر معدہ تک شیرینی کی لہر دوڑ گئی۔ اماں ایسی میٹھی شکر تو میں نے کبھی کھائی ہی نہیں تھی۔ میں تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر منہ کھول دیا تو منجھو مرحوم نے ایک ڈھیلا میرے منہ میں دے دیا۔ یہ دراصل مصری کا ڈلا تھا۔ بھائی ایسی

مصری اس دنیا میں سو روپیہ تولہ بھی ڈھونڈھو تو نہ ملے۔ عطر میں پسی ہوئی برف سے زیادہ ٹھنڈی رُوئی سے زیادہ ہلکی اور ایسی مفرح کہ میں کیا کہوں۔ بہرحال میں مزے لے لے کر مصری کھا ہی رہا تھا کہ منجھو مرحوم نے مسکرا کر پوچھا۔ کہو کچھ شغل ہوگا؟ میں تو چار دن کا ترسا ہوا تھا ہی نہایت اشتیاق کے ساتھ کہا کہ "نیکی اور پوچھ پوچھ۔"

منجھو مرحوم نے وہیں پر ٹھہر کر کہا۔ "تو پھر تکلف کس بات کا ہے۔ آخر یہ سب کس کے لیے ہے۔ جس عمارت سے چاہو اور جتنی چاہو افیون نوچ لو اور اگر گھلی گھلائی چاہتے ہو تو وہ دیکھو سامنے حوض ہے جس میں تم غوطہ تک لگا سکتے ہو۔"

افیون کی یہ کثرت دیکھ کر مجھ کو ایک قسم کا اطمینان سا ہو گیا اور میں نے اسی کو مناسب سمجھا کہ پہلے ذرا یہاں کی سیر ہو جائے اس کے بعد اطمینان سے بیٹھ کر شغل ہوگا۔ چنانچہ منجھو مرحوم کے ہمراہ چلتے چلتے میں ایک باغ میں پہونچا جہاں گنڈیریوں کے نہایت شاداب درخت قطاروں میں لگے ہوئے تھے۔ یہ گنے کے درخت نہ تھے بلکہ چھلی ہوئی اور کٹی ہوئی گنڈیریوں کے درخت تھے بس یہ سمجھ لو کہ ان کو دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آیا منجھو مرحوم نے فوراً ایک گنڈیری توڑ کر جو مجھ کو کھلائی تو آنکھیں کھل گئیں۔ اے سبحان اللہ کیا تعریف کی جائے اس گنڈیری کی۔ معلوم یہ ہوا کہ برفی کی لوزات میں انگور کا رس کسی نے معطر اور ٹھنڈا کر کے بھر دیا ہے یا پورا خطۂ کشمیر، دنیا بھر کی شیرینیوں میں لپٹ کر اور تمام دنیا کی خوشبوؤں میں بسنے کے بعد سمٹ کر گنڈیری بن گیا ہے۔ میں ابھی اس گنڈیری کا لطف ہی لے رہا تھا کہ منجھو مرحوم نے مجھ سے کہا۔

"میر صاحب وہ دیکھو سامنے چاء کی نہر بہتی ہے۔"

میں نے حیرت سے کہا۔ "چاء کی نہر۔" تو منجھو نے مجھ کو نہر کی طرف چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! یہ چاء کی نہر ہے۔ اس میں نہایت اعلیٰ درجہ کی کشمیری چاء ہر وقت موج در موج بہتی ہے۔ اس نہر پر تین چار نہایت خوب صورت پل بھی بنائے گئے ہیں۔ ایک پل حلوہ سوہن کا ہے جو اس قدر خوش ذائقہ حلوہ سوہن کا بنا ہوا ہے کہ دہلی کا حلوہ سوہن آپ بھول جائیں۔ دوسرا پل رامدانے کی لیا کا ہے جس کو نہایت نزاکت سے بنایا گیا ہے۔ تیسرا پل قلاقند کا ہے۔ ذرا اس پل کا ایک ٹکڑا کھا کر دیکھو کس قدر مزیدار ہے۔ چوتھا پنچ میل مٹھائی کا ہے۔ ان پلوں پر جا کر تم اس نہر کی سیر کر سکتے ہو۔" میں آئینۂ حیرت بنا ہوا منجھو مرحوم کے پیچھے پیچھے نہر تک پہنچ گیا۔ اور حلوہ سوہن کے پل کے اوپر جا کر نہر کی سیر کرنے لگا۔ اس نہر میں واقعی نہایت لاجواب قسم کی کشمیری چاء کا دھارا بہہ رہا تھا۔ جس میں برابر کی بالائی پڑی ہوئی تھی اور خوشبو سے باپ دادا تک کی روحوں کے دماغ معطر ہوئے جاتے تھے۔ پھر اس نہر کا منظر عجیب وغریب تھا۔ کہیں تو سنبوسوں کی خوب صورت کشتیاں رواں تھیں، کہیں شیر مالوں کے بجرے لنگر انداز تھے۔ اور پھر لطف یہ کہ اس نہر کا ہر بھنور ایک باقرخانی تیار کرتا تھا اور ہر حباب سے ایک بتاشہ بنتا تھا۔ میں دیر تک اس منظر میں گم رہا۔ آخر منجھو مرحوم نے مجھ سے کہا کہ "چلو بھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ ریوڑیوں کی بارہ دری، گزک کا قلعہ، فیرینی کا کنواں، شربت کا آبشار، گاجر کے حلوہ کی دلدل، گڑ کا پہاڑ وغیرہ۔" میں ان میں سے ہر چیز کا نام سن کر سخت حیران ہوا۔ اور نہایت خاموشی کے ساتھ منجھو مرحوم کے ساتھ چل دیا۔ سب سے پہلے منجھو مرحوم نے مجھ کو ریوڑیوں کی بارہ دری دکھائی۔ اس بارہ دری کی ادنیٰ تعریف یہ ہے کہ دیکھو تو دیکھتے رہ جاؤ۔ اور کھاؤ تو ڈکار تک لینے کا ہوش باقی نہ رہے۔ چھوٹی اور بڑی خوشبودار ریوڑیوں سے اس بارہ دری کو کچھ اس طرح بنایا گیا تھا کہ ریوڑیوں پر جواہرات کا شبہ ہوتا تھا اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ پچہ کاری کے فن کو اس عمارت پر ختم کر دیا گیا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اس عمارت کے ستون

آپ کھائیے، مگر وہاں کوئی کمی نہ ہوتی تھی۔ اور جو ریوڑی جس جگہ سے آپ کھائیں اس کی جگہ ویسی ہی دوسری ریوڑی موجود۔ اگر یہ صنعت نہ رکھی گئی ہوتی تو اس بارہ دری کو لوگ کب کے ہضم کر چکے ہوتے۔ ریوڑیوں کی بارہ دری کے بعد گزک کا قلعہ بھی دیکھا۔ اماں یہ آگرہ اور دہلی کے قلعے اس کے سامنے بچوں کا کھیل معلوم ہوتے ہیں۔ اس قدر عظیم الشان قلعہ کہ جیسے پہاڑ کا پہاڑ کھڑا ہوا ہے اور کیا مجال کہ گزک کے علاوہ اس میں کوئی اور چیز لگی ہو۔ میں نے اس قلعہ میں بھی ایک اینٹ نکال کر کھائی۔ اور آج تک اس کا مزہ بھولا نہیں ہوں۔ حد یہ ہے کہ میں آگرہ وغیرہ کی گزک کو بھی اب نہیں چھوتا۔ جس کو سب بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ گزک کا قلعہ دیکھنے کے بعد فیرینی کے کنویں پر گیا۔ اس کو کنواں کیوں کہا جائے یہ سمجھو کہ اچھی خاصی باؤلی ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کنویں میں نہایت نفیس قسم کی خوشبودار فیرینی بھری ہوئی ہے۔ جس پر چاندی کے ورق نہایت سلیقہ سے لگے ہوئے ہیں اور جس طرح عام طور پر کنوؤں میں کائی جم جاتی ہے اسی طرح اس کنویں میں بھی کائی جمی ہوئی تھی۔ مگر وہ کائی پستے اور بادام کی ہوائیوں کی تھی۔ منجھو مرحوم نے اس کنویں سے ایک سونے کا ڈول کھینچا اور اب جو میں اس فیرینی کو چکھتا ہوں تو روح تازہ ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ شکر میں لپیٹ کر چوپائی کھا گئے۔ بھائی ایسی کھیر تو میں نے کبھی خواب میں نہ دیکھی تھی۔ حد یہ ہے کہ اب تک زبان میٹھی ہے۔ خیر صاحب اس کنوئیں سے چل کر شربت کا آبشار دیکھا۔ پھر گاجر کے حلوہ کی دلدل دیکھی اور آخر میں گڑ کا پہاڑ دیکھا۔ مگر سچ پوچھو تو اس وقت حقہ کی کمی نہایت بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی میں نے منجھو مرحوم سے حقہ کا ذکر کیا، اس نے فوراً ہی اپنے جیب سے ایک طلائی نے نکال کر کہا۔ ''لو پیو۔''

میں نے کہا کہ ''آخر کیا پیوں؟ نہ حقہ نہ چلم تم بھی بڑے مسخرے ہو۔''

تو منجھو مرحوم نے نہایت متانت سے کہا۔ ''بھائی یہ حقہ ہی ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ جنت ہے، یہاں آگ نہیں آسکتی۔ لہٰذا اس کی چلم تو ہے دوزخ میں اور نے آپ کے ہاتھ میں دوزخ کے فرشتے برابر چلم بھرتے رہتے ہیں۔ ذرا تم پی کر تو دیکھو۔''

اب جو میں اس نے کا ایک کش لیتا ہوں تو آپ سے کیا کہوں کہ میرا کیا حال ہوا۔ ایسا خمیرہ تو میں نے کبھی پیا کیا معنی کبھی گلستاں بوستاں میں بھی نہ دیکھا تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ جیسے اس کی خوشبو میرے جسم کے ہر حصہ میں دوڑ گئی۔ میں دیر تک حقہ پیتا رہا۔ آخر مجھ کو خیال آیا اور میں نے منجھو مرحوم سے کہا کہ ''ایسا حقہ مجھ کو کہاں سے مل سکتا ہے؟''

منجھو نے کہا کہ ''یہ سب چیزیں جنت کے داروغہ سے مل سکتی ہیں۔'' اب تو مجھ کو بھی جنت کے داروغہ سے ملنے کا خیال پیدا ہوا اور میں سیدھا ان کے دفتر کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں ایک عالیشان افیون کی عمارت دکھا کر منجھو مرحوم نے کہا۔

''یہ جنت کا کتب خانہ ہے۔ اس میں طلسم ہوشربا، الف لیلیٰ، قصہ گل بکاؤلی، قصہ طوطا مینا اور تمام ان کتابوں کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے جو افیونیوں کے ذوق کی سمجھی جاتی ہیں خصوصاً طلسم ہوشربا کی باقی دو سو پچاس جلدیں جو دنیا میں نایاب ہیں، کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ مگر مجھ کو تو اس وقت داروغۂ جنت سے ملنے کی جلدی تھی۔ لہٰذا کتب خانہ کی عمارت کو باہر ہی سے دیکھتا ہوا داروغۂ جنت کے دفتر پہونچ گیا۔ منجھو مرحوم کو باہر ہی چھوڑ کر میں خود دفتر میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں بظاہر تو کوئی نہیں ہے مگر میرے پہونچتے ہی ایک آواز آئی کہ ''آپ کا نام'' میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''میر جعفر ہے اس غلام کا نام'' پھر آواز آئی ''باپ کا نام'' میں نے حافظہ پر زور دیا مگر کچھ یاد نہ آیا تو گھبرا کر کہہ دیا۔ ''غلام کو یاد نہیں۔''

پھر آواز آئی "پشہ......"

میں نے کہا۔ "صرف افیونی ہے یہ ناچیز۔"

اس مرتبہ آواز ذرا تیز آئی کہ "کیا تم میر جعفر قلعی گر ابن میر باقر ہو؟"

نہیں میں نے گھبرا کر کہا۔ "ہرگز نہیں وہ تو میرا ہم محلہ ایک غیر افیونی ہے۔"

اس کے جواب میں مجھ کو یہ خبر سنائی گئی کہ میری روح غلطی سے قبض کر لی گئی ہے۔ دراصل موت آئی تھی اس قلعی گر کی لہٰذا اب جو میں وہاں سے پھینکا جاتا ہوں تو اپنی چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ اور سب کہہ رہے تھے کہ "میر صاحب مرے نہیں بلکہ پینک میں ہیں۔"

خاں صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اپنی اپنی تقدیر ہے بھائی۔ تم کو جیتے جی جنت مل گئی۔"

مرزا صاحب نے کہا۔ "خیر یہی معلوم یہ ہوا کہ جنت بھی ہے کام کی چیز۔"

اگر میں لڑکی ہوتا

حضرت جگر مراد آبادی نے ایک عجیب شعر بہت خوب کہا ہے۔

خدا گواہ جو ہم آپ کی جگہ ہوتے
محبتوں کے خزانے لٹا دیا کرتے

مگر خدا جانے یہ شعر کس دنیا کے متعلق ہے۔ اس لیے کہ ایک ہندوستانی عورت محبتوں کے خزانے کسی حالت میں لٹا ہی نہیں سکتی۔ ہندوستانی بہو بیٹیوں کے متعلق تو جب کبھی ہم غور کرتے ہیں، یہ شعر کچھ اس طرح ہمارے ذہن میں گونجنا شروع کر دیتا ہے کہ۔

خدا گواہ جو ہم آپ کی جگہ ہوتے
تو ہم کو خود بھی یہی فکر ہے کہ کیا کرتے

یعنی اگر خدانخواستہ ہم اپنے والدین کے برخوردار سعادت آثار ہونے کے بجائے کہیں دختر نیک اختر واقع ہو گئے ہوتے تو عجیب مہمل زندگی ہوتی ہماری بھی۔ یہ خیال ان لڑکیوں یا ان عورتوں کے ذہن میں نہیں آ سکتا جو پیدائشی طور پر لڑکیاں یا عورتیں واقع ہوئی ہیں۔ مگر اس خیال اور اس خیال کی اہمیت کو لڑکی نہ بن سکنے والے لڑکے یعنی عورت بن کر نہ پیدا ہونے والے مرد ہی کچھ محسوس کر سکتے ہیں۔ کہ اگر وہ بجائے مرد بننے کے عورت یعنی بجائے لڑکا ہونے کے لڑکی بن جاتے تو کیا ہوتا۔ کم

سے کم ہم اپنی حالت کا اندازہ خود ہی کر سکتے ہیں۔ کہ جب کبھی ہم نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے تو غور کرتے کرتے الجھ گئے ہیں۔ اُلجھنے کے بعد اختلاج کی سی کیفیت محسوس ہوئی ہے۔ اور آخر کار کپڑے پھاڑ کر نکل بھاگنے کی حد تک پہونچ کر یہ خیال آیا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ ہم تو مرد ہیں۔ ہم کو اس طرح پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ حالانکہ اگر ہم واقعی لڑکی ہوتے تو اپنی اسی زندگی کے عادی ہو کر رہ جاتے اور لڑکی ہونا ہمارے نزدیک کوئی مصیبت نہ ہوتا۔ مگر لڑکا ہو کر لڑکی کی زندگی پر غور کرنا ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ نہایت بھیانک ہوتا ہے۔

میدانوں میں ہاکی اور کرکیٹ کھیلنے والے لڑکے گھروں میں گڑیاں کھیلنے والی لڑکیوں کی زندگی کا تصور اس وقت تک کر ہی نہیں سکتے، جب تک کہ وہ ہماری طرح اس خیال کو اپنے اوپر طاری نہ کرلیں۔ کہ اگر ہم لڑکی ہوتے تو کیا ہوتا۔ ریشمی برقعہ پہن کر اونچی ایڑی کے جوتے کے ساتھ وحشی ہرنیوں کی سی چال کس نوجوان کو اچھی نہیں لگتی۔ زرق برق ساریوں میں سورج کی باریک کرن کی طرح تھرتھراتا کس لڑکے کو اچھا نہیں معلوم ہوتا؟ گھنگھور گھٹاؤں کی طرح کے بال کون مرد پسند نہیں کرتا؟ لیکن اگر یہی پسند آنے والی چیزیں ان پسند کرنے والے لڑکوں اور مردوں کے سامنے پیش کی جائیں۔ کہ اگر یہ برقعہ پسند ہے تو حاضر ہے۔ یہ اونچی ایڑی کا جوتا اچھا معلوم ہوتا ہے تو ہماری طرف سے قبول فرمائیے۔ یہ زرق برق ساری تو لے ہی لیجیے۔ اور ان گھنگھور گھٹاؤں کی طرح کے بالوں کو اپنے ہی سر اقدس کی زینت بنائیے تو ہم سچ کہتے ہیں کہ یہ تمام لڑکے اور مرد سر پر پیر رکھ کر بھاگیں گے۔ اور ان ہی تمام پسندیدہ چیزوں کو اپنے لیے نہایت خوفناک سمجھیں گے۔ اس لیے کہ دراصل وہ ان تمام چیزوں کو اپنے لیے نہیں بلکہ ایک عورت ہی کے لیے پسند کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان چیزوں کو قبول کرنے کے بعد خود ان کو اپنے متعلق عورت ہوجانے کا خطرہ

ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ کانوں پر ہاتھ اور سر پر پیر رکھ کر بھاگتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ خواہ کیسے ہی بدصورت مرد کیوں نہ ہوں، مگر ان کو حسین سے حسین عورت بننا بھی گوارہ نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے کہ اسی طرح عورتیں بھی مرد بننا پسند کرتی ہوں لیکن یہ افسوس تو ان کو ضرور ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے تھے تو آخر مرد بن کر کیوں نہ پیدا ہوئے کہ زندگی کو زندگی کی طرح بسر کرتے۔ یہ کیا کہ ایک طولانی موت کا نام زندگی رکھ چھوڑا ہے۔ اور خوش ہیں کہ زندہ تو ہیں۔ خیر صاحب ہم اس مبحث کو یہیں پر ختم کیے دیتے ہیں، ورنہ بہت سے حضرات کہیں گے کہ یہ شخص عورتوں کو شہ دے رہا ہے۔ حالانکہ مردوں کا یہ سمجھنا ہی مات کھا جانے کی علامت ہے۔

بہرحال ہم کو عرض کرنا ہے کہ اگر ہم لڑکی ہوتے تو کیا ہوتا۔ اس سلسلہ میں اپنی پیدائش سے لے کر تادم تحریر تمام واقعات اگر تفصیل کے ساتھ نہیں تو اجمال کے ساتھ ہم پیش کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ہماری اس زندگی کا اندازہ آپ کو ہو سکے، جو بفضلہٖ مرد بن کر ہم کو بسر کرنا نہیں پڑی۔ لیکن اگر عورت پیدا ہو کر بسر کرنا پڑتی تو یہی ہوتا کہ جب ہماری پیدائش کی اطلاع والد صاحب کو ہوتی کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے، تو وہ لڑکے کے منتظر والد صاحب دل میں تو یہی کہتے کہ ع

برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

مگر زبان سے کہتے کہ ''اچھا بھائی پیدا ہوئی تو خدا نصیبہ ور کرے اور صاحبِ عمر۔'' اس کے بعد ان کی گردن کچھ جھک سی جاتی۔ اور یہ ہوتا گویا مجھ لڑکی کا خیر مقدم۔ اس کے بعد مجھ کو لڑکا یا لڑکی سمجھ کر نہیں بلکہ اپنا بچہ سمجھ کر میرے والدین پالتے۔ یہاں تک کہ میں اس قابل ہو جاتی کہ پڑھنے بٹھائی جاؤں۔ لہٰذا میرے لیے ماسٹر صاحب نہیں بلکہ استانی جی مقرر ہوتیں اور میں اوڑھنی اوڑھ کر ان کے سامنے پڑھنے کو بیٹھا کرتی۔ حالانکہ میرے بھائی ننگے سر اپنے ماسٹر صاحب کے پاس

پڑھا کرتے۔ پڑھنے سے فارغ ہو کر میرے بھائی اچھل کود شروع کر دیتے لیکن اگر میں ذرا بھی دوڑتی تو اماں جان فوراً مجکو جھڑک دیتیں کہ "واہ یہ بھی کوئی لڑکیوں کا انداز ہے کہ لڑکی ذات ہو کر لونڈوں کی طرح اچھلتی پھرتی ہے موئی گھوڑی جیسے" میں کھسیانی ہو کر اور اپنا دل مار کر سست کر بیٹھ رہتی۔ میرے بھائی شکار کو جاتے اور میں گڑیاں کھیلتی۔ میرے بھائی فٹ بال کھیلتے اور میں ہنڈکلھیا پکاتی۔ میرے بھائیوں کو ورزش سکھائی جاتی اور مجھ کو سینا پرونا۔ میرے بھائی گھوڑوں پر سوار ہوتے اور میں پٹرے پر بیٹھ کر روٹی پکانا سیکھتی۔ میرے بھائی اپنی بائیسکلوں پر فراٹے بھرتے ہوئے اسکول جایا کرتے اور میں اسکول کی بند لاری میں گھٹ گھٹ کر اسکول جایا کرتی۔

میرے بھائی ابا جان کے ساتھ ان کے دوستوں کے یہاں جایا کرتے، اور اماں جان میری وجہ سے خود بھی کہیں نہ جاتیں کہ جوان جہان لڑکی کو گھر میں کیسے چھوڑیں۔ اور سیانی لڑکی کو کسی کے یہاں لے کر کیوں کر جائیں۔ میرے بھائی اسکولوں سے نکل کر کالج میں داخل ہوتے اور میں اسکول ہی سے اٹھا لی جاتی، کہ اب لڑکی ماشاءاللہ سیانی ہوگئی ہے، اب اسکول بھیجنا ٹھیک نہیں ہے۔ کالج میں داخل ہو کر میرے بھائی گھر چھوڑ کر بورڈنگ میں چلے جاتے اور اسکول چھوڑ کر میرے سر تمام گھر کا انتظام آپڑتا۔ اور اماں جان صرف معمولی سی نگرانی کے لیے رہ جاتیں۔ یہاں تک کہ میری وہ عمر آجاتی کہ ابا جان کو اور ابا جان سے بہت زیادہ اماں جان کو دن رات یہی فکر ہوتی کہ کیوں کر مجھ کو گھر سے نکالیں۔ ان کی راتوں کی نیند اور دن کا آرام اسی فکر میں حرام ہو جاتا۔ وہ تو وہ آئے گئے سب ہی کو میری صورت دیکھ کر یہی فکر ہوتی کہ آخر میں اب تک اس گھر میں کیوں ہوں۔ مہترانی ہے تو اماں جان سے تقاضہ کر رہی ہے کہ "بیوی اب تو ہمارے ہماری بٹن کا بیاہ ہو جانا چاہیے۔" "دھوبن ہے تو اس کو یہی غم کھائے جاتا ہے کہ۔ "بی کی بات کہیں لگی یا نہیں؟" منہیارن ہے کہ چوڑیاں پہناتی جاتی

ہے اور یہی کہتی جاتی ہے کہ "اللہ رکھے یہی شادی کے دن ہیں۔ جوان جہان لڑکی کا بٹھائے رکھنا بھی تو ٹھیک نہیں۔" اور اماں جان ان تمام تذکروں پر اس طرح ٹھنڈی سانسیں بھرتیں کہ گویا واقعی تمام دنیا کے لڑکے رفتہ رفتہ ختم ہو گئے اور میں بیٹھی رہ گئی۔ میں رات کے سناٹے میں اپنے بستر پر لیٹ کر ابا جان اور اماں جان کی اسی معاملہ میں جھڑپ سنا کرتی کہ اماں جان نے رازدارانہ طریقہ پر پوچھا کیا سو گئے:۔

ابا جان نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "نہیں تو۔ ابھی سوجاتا کیا؟"

اماں جان نے کہا۔ "میں کہتی ہوں کہ آخر لڑکی کو کب تک کلیجہ سے لگائے بیٹھے رہو گے۔"

ابا جان نے جواب دیا۔ "تو آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟ کیا میں کسی راہ چلتے کے ہاتھ پکڑا دوں۔"

اماں جان نے کہا۔ "نہیں میں کہتی ہوں کہ تم کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہوئے ہو۔"

ابا جان نے جل کر کہا۔ "تو آپ ہی کانوں کا تیل نکال کر کوئی فکر کریں۔ مجھ سے یہ تو نہیں ہوسکتا کہ میں لڑکی کو جان بوجھ کسی گڑھے میں جھونک دوں۔"

اماں جان نے کہا۔ "آخر وہ تحصیلدار کے لڑکے کا کیا ہوا؟"

ابا جان نے کہا۔ "لا حول ولا قوۃ۔ اجی وہ سخت نالائق ہے۔ آوارہ گرد۔ سنا ہے کہ ناچنے گانے کا بھی شوق ہے۔"

اماں جان نے کہا۔ "اور وہ جو بھوپال سے نسبت آئی تھی۔"

ابا جان نے کہا۔ "جی ہاں ان حضرت کے متعلق معلوم ہوا کہ بھائی صاحب مرحوم کی عمر کے ہیں۔"

اماں جان نے کہا۔ "کیا سچ مچ عمر زیادہ ہے لڑکے کی؟"

ابا جان نے کہا۔ ''ہاں صاحب۔ وہ لڑکا نہیں ہے لڑکوں کا دادا ہے۔''

اماجان نے کہا۔ ''لڑکے اور لڑکی میں بیس برس کا فرق ہو تو خیر! مگر اس سے زیادہ نہیں۔''

اباجان نے کہا۔ ''تو آپ گویا مجھ سے بیس برس چھوٹی ہیں۔''

اماں جان نے جل کر کہا۔ ''اے ہٹو بھی! تمھارا کون ساذکر ہے یہاں۔ چلے وہاں سے بوڑھا چونچلا لے کے۔''

اباجان نے کہا۔ ''میرے خیال میں تم مجھ سے دوچار سال خود ہی بڑی ہوگی۔''

اماں جان نے اور بھی جل کر کہا۔ ''اور کیا ایسے ہی تو ننھے ہو چھوٹے۔''

اباجان ہنس کر چپ ہوگئے ہوتے مگر اماں جان دیر تک ان بھوپال والے بڑے میاں کی تائید میں اباجان کو سمجھاتی رہتیں۔ یہاں تک کہ وہ دونوں سو جاتے۔ مگر میری نیند اُڑ جاتی کہ یا اللہ کیا میں اسی کھونسٹ کے پالے پڑوں گی، جس کے نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ تمام رات ان بڑے میاں کا خوفناک خیال ستاتا رہتا۔ اور اس حد تک میں پریشان ہو جاتی۔ کہ رونے کو دل چاہتا، مگر زبان سے ایک لفظ نہ کہہ سکتی کہ للّٰلہ مجھ کو اس ٹوٹی ہوئی قبر میں دفن نہ کرو۔ اگر واقعی وہ کمبخت اتنا ہی بوڑھا ہے تو اس موئے کے جسم سے تو کافور کی بو بھی آتی ہوگی۔ اور اس کے جسم پر لباس کفن معلوم ہوتا ہوگا۔ مگر ہمارے خاندان کی بہو بیٹیاں ان معاملات میں گونگی اور بہری دونوں ہوتی ہیں۔ لہٰذا میں بھی کچھ نہ کہہ سکتی۔ البتہ نہایت رشک کے ساتھ اپنے بھائیوں کو دیکھتی کہ وہ نہایت آزادی کے ساتھ اپنی اپنی شادیوں کا ذکر کرتے اور اپنی دلہنوں کے لیے آزادی سے شرائط پیش کرتے۔ کہ صاحب پہلے لڑکی کو خود دیکھیں گے۔ اور صاحب پہلے لڑکی کی تصویر آنا چاہیے۔ وہ انگریزی بھی جانتی ہے یا نہیں؟

اس کے بال کتنے بڑے ہیں؟ اور اس کی آواز کیسی ہے؟ میں حسرت سے اپنے بھائیوں کی اس آزادی کو دیکھتی اور کلیجہ مسوس کر رہ جاتی۔ اماں جان میرے بھائیوں کی اس بے باکی پر ہنس دیا کرتیں۔ لیکن اگر میری زبان سے ایک لفظ بھی میری شادی کے متعلق سن لیتیں تو گویا اپنی عزت آبرو کے جنازہ پر کہرام مچا دیتیں۔ لہٰذا میں چپ رہتی خواہ وہ کسی کے ساتھ میری شادی کردیتیں۔ البتہ دل ہی دل میں یہ فکر مجھ کو بھی پریشان رکھتی کہ دیکھیے میری قسمت میں کیا لکھا ہے اور میں کس کے حوالے کی جاتی ہوں؟ اگر کسی نسبت کا ذکر سنتی تو دل کو ایک کھوج سی ہوتی کہ یہ صاحب کون ہیں؟ اور کیا ہیں۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہہ سکتی۔ آخر کار ایک دن میں اباجان کو اماں جان سے یہ کہتا ہوا بھی سُن لیتی کہ:۔

''میرے نزدیک یہ نسبت ہر طرح بہتر ہے۔ یہ دیکھو لڑکے کی تصویر ہے۔''

اماں جان تصویر دیکھ کر کہتیں۔ ''اے ہے! لڑکا دُبلا کتنا ہے۔ کہیں کوئی عارضہ تو نہیں ہے؟''

اباجان کہتے۔ ''لاحول ولاقوۃ۔ جو بات کہتی ہو ایسی ہی کہتی ہو۔ نہایت اچھی تندرستی ہے اس کی۔ شریف گھرانے کا ہے۔ روزگار سے لگا ہوا ہے۔ ایک اخبار کا ایڈیٹر ہے۔ بہت سی کتابیں لکھ چکا ہے اور کافی مشہور آدمی ہے۔''

اماں جان کہتیں کہ۔ ''چشمہ تو دیکھو کیسا موٹا سا لگائے ہوئے ہے۔''

اباجان جل کر کہتے۔ ''توبہ ہے! یہ فضول باتیں کروگی اور کوئی صاف بات نہ بتاؤ گی کہ ان کو جواب کیا دیا جائے۔''

اماں جان کہتیں۔ ''تو میں کیا بتاؤں؟ تم کو اگر اطمینان ہو تو بسم اللہ کرو۔''

اباجان کہتے۔ ''ہاں مجکو اطمینان ہے۔ لڑکا سمجھا بوجھا ہوا ہے اور ہر طرح مناسب ہے۔''

اماں جان بھی راضی ہو جاتیں اور ابا جان تو گویا پہلے ہی سے رضامند ہوتے۔مگر میں یعنی جس کا اصل معاملہ ہوتا وہ گویا کوئی چیز ہی نہیں۔مگر مجکو قدرتی طور پر یہ فکر ہوتی کہ جن صاحب کے لیے میرا مالک ہو جانا طے کردیا گیا ہے وہ آخر ہیں کون؟ میرا دل چاہتا کہ تصویر بھی دیکھوں مگر نہ دیکھ سکتی۔آخر میری ہم جولیاں مجکو چھیڑ چھیڑ کر اور گدگدا کر ان صاحب سے غائبانہ طور پر متعارف کراتیں اور میں یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتی کہ خیر جو کچھ ہو اور وہ جیسے بھی ہوں مگر کم سے کم بھوپال والے بڑے میاں تو نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ میری شادی کے لیے دن اور تاریخ مقرر ہوتی۔اور ایک دن شالباف میں مجھ کو لپیٹ کر بٹھا دیا جاتا۔اور نکاح کے وکیل آ کر مجھ سے پوچھتے کہ۔''میں نے اپنی وکالت میں تمھارا نکاح شوکت تھانوی ولد منشی صدیق احمد صاحب کے ساتھ بعوض پندرہ ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت کیا۔تم کو منظور ہے؟''میں اس وقت کچھ بن بن کر اور کچھ واقعی سسکیاں لے لے کر روتی اور آخر کار تیسری مرتبہ نکاح کے وکیل کے جواب میں مجکو خفیف سا''ہوں'' کہنا پڑتا اور یہیں سے میری دنیا بدل جاتی۔

اپنے نکاح کے بعد میں شوکت دلھن کہلاتی اور جیسی کچھ بھی میری زندگی ہوتی میں اسی میں خوش رہتی۔میرے مزاح نگار شوہر مجھ کو اپنا موضوع مزاح بناتے اور میں اس بات پر ان سے لڑتی۔آخر کار تھوڑے دنوں کے بعد اس بات کی عادی ہو جاتی۔میرے دو بچے ہوتے جو مجکو اپنی تتلی زبان سے امّی جان کہتے۔اور میں ان کو دیکھ کر پھولی نہ سماتی۔مگر الحمدللہ کہ میں لڑکی نہیں لڑکا ہوں۔عورت نہیں مرد ہوں۔شوکت دلھن نہیں شوکت تھانوی۔

تکلفات

تھانوی ہونا دوسری بات ہے مگر یہ خاکسار حاضر ہوا ہے اسی لکھنؤ سے جہاں ''پہلے آپ'' اور ''نہیں حضت پہلے آپ'' کے تکلفات میں ٹرین چھوڑ دی جاتی ہے مگر وضع نہیں چھوڑی جاتی۔اب ذرا اس خاکسار کا لکھنؤ سے حاضر ہونا ملاحظہ فرمائیے اور گنتی کے پندرہ منٹ ریڈیو پر مضمون پڑھنے کے لیے دیکھیے۔انصاف سے کہیے گا کہ ایک لکھنؤ سے آنے والا اس پندرہ منٹ میں کتنی دیر اپنی شیروانی کا دامن درست کر کے ایک مناسب زاویہ سے بیٹھنے کی کوشش کرے گا کتنی ریشمیں رومال سے لبوں کو صاف کرے گا۔کتنی دیر کھنکھار کر آواز کے سر درست کریگا۔کتنی دیر شرمائے گا اور کتنی دیر اس کا انتظار کرے گا کہ سامعین ''ارشاد'' کہہ کر تقاضہ کریں۔یہاں کل پندرہ منٹ ہیں حالانکہ یقین جانئے کہ ان میں سے ہر ادا کے لیے فرداً فرداً پندرہ منٹ کی ضرورت ہے اور اس کے بعد بھی یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ مضمون سنایا بھی جائے۔ اس لیے کہ بہت ممکن ہے کہ خاکسار لکھنؤ سے حاضر ہونے کی رعایت سے محض ناسازی طبع۔یعنی زکام،نزلہ،گلوگرفتگی،اختلاج قلب،دوران سر وغیرہ وغیرہ تمام ممکن اور ناممکن امراض کو بطور عذر پیش کر کے معذرت چاہے۔اور پھر جب تمام ہندوستان کے ریڈیو نواز بصیغہ غائب اور ریڈیو اسٹیشن دہلی والے بصیغہ حاضر اس خاکسار سے اصرار کریں تو یہ کم ترین گویا مجبور ہو کر محض تعمیل ارشاد میں ایک شعر حاصل مضمون

روانی کے ساتھ سنا جائے۔ مگر ان تمام مراحل کو طے کرنے کے لیے منٹوں کی نہیں بلکہ گھنٹوں کی ضرورت ہے۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ گھڑی دیکھتے رہو۔ جیسے ہی چھوٹی سوئی آٹھ پر اور بڑی بارہ پر پہونچے فوراً شروع کر دو اپنا مضمون جو ایک ایک سکنڈ کے حساب سے ٹھیک اس وقت ختم ہو جائے جب کہ بڑی سوئی تین پر پہونچ جائے۔ گویا ہم لکھنؤ سے آنے والے ایک آدمی نہیں ہیں بلکہ سوئٹزرلینڈ سے آنے والی کوئی ٹائم پیس ہیں۔

-x-x-

ممکن ہے کہ آپ کو اس باقاعدگی اور تہذیب کے مقابلہ میں شیخ ابراہیم، ذوقؔ سے اتفاق ہو جن کا نظریہ یہ تھا کہ ؎

اے ذوقؔ تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے

مگر غور کیجیے تو یہ تعلیم سوائے خودغرضی کے اور کچھ نہیں سکھاتی۔ یقیناً آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے مگر جس کے ساتھ تکلف نہیں کرتے اس غریب کی کیا گت بناتے ہیں اس پر بھی تو غور کرنا چاہیے۔ یہ کیا کہ محض اپنی تکلیف دور کرنے کی تو ایک راہ نکال لی اس کے بعد تمام دنیا گئی جہنم میں۔ لیکن لکھنؤ کا تکلف، ایثار، قربانی، نفس کشی اور اسی قسم کی خدا جانے کتنی خوبیاں سکھاتا ہے۔ اس تکلف کے ماتحت انسان ہر مصیبت خود ہی جھیل لے جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ بے تکلف بن کر دوسروں کے لیے عذاب بن جائے۔ مارے بے تکلفی کے بغیر کسی اطلاع کے رات کو ٹھیک دس بجے نازل ہو گئے کسی دوست کے یہاں اور مان نہ مان میں تیرا مہمان کے اصول پر عمل کرتے ہوئے طلب کیا اُس سے کھانا معہ چند فرمائشات کے جن کی تعمیل کے لیے خواہ وہ چوری کرے یا بال بچوں کا پیٹ کاٹے، کسی سے قرض لائے یا خود پیٹ پر پتھر

باندھ کر سو رہے مگر آپ کی بلا سے۔ آپ کو اپنے کام سے کام۔ ایسے مہمان کے لیے میزبان کے دل کی گہرائیوں سے جو بددعائیں نکلتی ہیں، وہ قبول ہوتی ہوں یا نہ ہوتی ہوں، مگر شیخ ابراہیم ذوقؔ کی روح ضرور شرمندہ ہوتی ہوگی کہ وہ کیسا غلط نظریہ قائم کر گئے ہیں۔ ایک لکھنوی صاحب تکلف کے لیے اس قسم کی بے تکلفی قطعاً ناممکن ہے۔ وہ اگر ناوقت کسی شہر میں پہونچے گا بھی تو اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر شٹنگ کر کے دیوار پر چسپاں ٹائم ٹیبل کو بار بار رواں اور ہجے لگا کر پڑھ کر، میر تقی میر کی غزلیں گنگنا کر وقت کاٹ دے گا اور صبح شریف آدمیوں کی طرح مہمان بن کر میزبان کے دروازہ پر پہونچے گا۔ اور اس وقت بھی یہ عالی ظرفی ملاحظہ ہو کہ جب میزبان ناشتہ چنے گا تو یہ مرد معقول جو بلا مبالغہ دو تین فاقوں سے ہوگا یہی کہے گا کہ حضت میں تو ناشتہ کر کے حاضر ہوا ہوں۔ اب یہ اور بات ہے کہ قسماقسمی اور اصرار سے مجبور ہو کر اسی ناشتہ کو اس صفائی سے تناول فرما جائے کہ صرف میزبان کو تکلفاً چھوڑ دے۔

-x-x-

ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ لکھنؤ کے تکلف کو دنیا نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور اس کا مذاق اڑا کر اس کے فوائد کو نظرانداز کر دیا، ورنہ یہ تکلف اُن تمام سیاسی، ہندوستانی اور بین الاقوامی مسائل کا واحد حل ثابت ہوتا جو آج کل مفکرین عالم اور مدبرین وقت کا دماغ چرخ کیے ہوئے ہیں۔ بے تکلفی اور اکھڑپن ہی کا نتیجہ یہ ہے کہ تخفیف اور توسیع اسلحہ کی گتھی کسی طرح سلجھنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ہندوستان کے لیے جدید دستور کی بھی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ اور اس دستور کے لیے ہڑتال کی بھی ضرورت ہے۔ اسپین میں خانہ جنگی ہو رہی ہے اور چین و جاپان میں الگ کشیدگی بڑھتی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ تمام دنیا میں ایک آگ لگی ہوئی ہے اور امن و سکون کا کہیں پتہ نہیں۔ کاش تکلف کو اس طرح نظرانداز نہ کیا گیا ہوتا اور بجائے اس کے کہ تخفیف

اورتوسیع اسلحہ کی گتھیاں سلجھائی جارہی ہیں یہ ہوتا کہ جرمنی برطانیہ کولکھتا کہ اگر آپ کو ناگوار نہ ہوتو میں ایک ہزار توپیں بنانا چاہتا ہوں۔اس کے جواب میں برطانیہ پانچ سو توپیں معہ اس مضمون کے خط کے بھیج دیتا کہ آپ نے غیریت برتی اور بجائے برطانیہ سے توپیں طلب کرنے کے خود توپیں بنانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔بہرحال اس وقت برطانیہ کے پاس پانچ سو توپیں تیار تھیں جو ارسال خدمت ہیں۔باقی انشااللہ بہت جلد تیار کراکے روانہ کی جائیں گی۔مگر آپ کو ہمارے سر کی قسم کہ ان کو اپنی ہی چیز سمجھ کر قبول فرمائیگا۔اور آئندہ بھی خدمات لائقہ سے یاد فرماتے رہیے گا۔اس کے جواب میں جرمنی کی طرف سے ان توپوں کی قیمت روانہ ہوتی۔اور پھر مسٹر بالڈون اور ہٹلر کے درمیان اس قسم کے بحری پیغامات کا سلسلہ شروع ہوجاتا کہ ''نہیں حضت یہ نہ ہوگا۔''

''واللہ بھائی بالڈون۔آپ کو یہ دام تو قبول ہی کرنا پڑیں گے۔''

''آپ کے سرعزیز کی قسم ہٹلر صاحب۔یہ قیامت تک نہ ہوگا۔''

''اے حضت آپ کی توپیں ہماری تھیں تو ہمارا روپیہ آپ کا ہے۔''

''یہ صحیح ہے مگر آپ غیریت برت رہے ہیں۔''

''یہ رقم اور وہ توپیں سب آپ پر نچھاور ہیں۔''

''اس رقم کو واپس کرکے دل شکنی نہ فرمایئے۔''

''اس کے معنی یہ ہوئے کہ آئندہ کوئی فرمائش نہ ہو۔''

''یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔فرمائش غیروں میں ہوتی ہے۔یہاں جو کچھ ہے آپ کا ہے۔''

''تو پھر آپ کو ہمارے سر کی قسم اس روپیہ کو بھی اپنا ہی سمجھئے۔''

''اچھا آپ نے دیدیا ہم نے پالیا۔اب یہ ہماری طرف سے جرمن قوم کے

بچوں کو مٹھائی کے لیے دیدیجیے۔''

''قسم ہے ہمارے قومی جھنڈے کی جان عزیز کی کہ یہ نہ ہوگا۔''

''آپ تو واللہ مجبور کررہے ہیں۔''

''اچھا تو اس کے معاوضہ میں نہ سہی تحفتاً دو چار سو ہوائی جہاز ہی قبول کر لیجیے۔''

''اس کی بھلا کیا ضرورت ہے۔''

''ضرورت نہیں ہماری خوشی ہے۔''

''آپ کی خوشی ہے تو اچھا یہی سہی۔''

اب آپ ہی بتایئے کہ اس قسم کے رواسم اور ان تعلقات کے بعد تخفیف یا توسیع اسلحہ بیکار نہیں تو اور کیا ہے۔زیادہ سے زیادہ آپ اس ناممکن بات کا ممکن ہونا فرض کر سکتے ہیں کہ شاید جنگ چھڑ جاتی۔مگر جنگ میں بھی اس تکلف کی کارفرمائی جس حد تک مفید ہوسکتی ہے اس کا تصور بھی بے تکلف دنیا نہیں کرسکتی۔جنگ اوّل تو ہوتی ہی نہیں اور اگر ہو بھی گئی ہوتی تو دونوں حریف ایک دوسرے کے مقابلہ پر برسوں صف آرا کھڑے رہتے اور حملہ کے سلسلہ میں دونوں طرف سے یہی اصرار ہوتا کہ ''پہلے آپ'' اور ''نہیں حضت پہلے آپ۔''

-x-x-

روناتو آتا ہے اس گہوارۂ تکلف ہندوستان پر۔آج یہاں بھی تکلف کا نام ونشان نہیں ہے۔کہیں جدید دستور کی ضرورت ہے اور کہیں جدید دستور کے لیے ہڑتال کی ضرورت۔کہیں حقوق کا سوال ہے اور کہیں۔ع

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

حالانکہ اگر غور کیجیے تو تکلف کے نقطۂ نظر سے ہندوستانیوں کا حقوق طلب کرنا

ہی نہایت چھوٹی اور گری ہوئی بات ہے۔ ہمارے بزرگ اگر اپنی کوئی چیز کسی کو دیتے تھے تو اس طرح سے کہ ایک ہاتھ سے وہ چیز دی اور دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہوئی۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ مرتے دم تک پھر اس چیز کا نام تک زبان پر نہ آتا تھا اس کو واپس مانگنا یا اس کا معاوضہ لینا تو درکنار۔ خواہ پھر فاقوں پر نوبت پہونچ جائے یا چیتھڑے لگ جائیں مگر جان کے ساتھ آن نہیں جا سکتی تھی۔ اور ایک آج کل کا زمانہ ہے کہ سرکار کو جو ہندوستان دیا تھا اسی کو نہایت فخر کے ساتھ طلب کیا جا رہا ہے۔ نہ ہوئے یہ کانگریس والے لکھنوی ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ اگر سرکار خود بھی ہندوستان واپس دینا چاہتی تو یہی کہا جاتا کہ کیوں سرکار اب یوں بھی ذلیل کیا جائے گا ہم کو۔ واللہ اس قدر ذلیل تو نہ کیجئے۔ یہ سچ ہے کہ ہم اب کسی قابل نہیں ہیں مگر اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں کہ اپنی دی ہوئی چیز واپس لیں۔ کاش ہم اس قابل ہوتے ایسے ایسے پچاس ہندوستان آپ پر قربان کر دیتے مگر کیا کہیں ع

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

ہندوستان کے سلسلے میں اپنا پرایا کیا؟ آخر ہم خود کس کے ہیں؟ یقین جانئے کہ آپ کے غلام ہیں اور آپ ہیں کہ ہم ہی سے یہ غیریت برت رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس شریفانہ تکلف کے جواب میں سرکار کی طرف سے بھی کوئی بخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر جب ہندوستان ہی نے تکلف چھوڑ دیا ہے تو دوسروں کا کیا سوال۔ نتیجہ یہ ہے کہ حقوق کے سلسلہ میں اعداد و شمار اور فیصدی تک کے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ پہلے ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کو حساب دوستاں در دل کہکر ٹال دیا جاتا تھا۔ اور حد یہ ہے کہ اسی چھچھورپن سے بچنے کے لیے اگلے وقتوں کے لوگ دس سے زیادہ گنتی ہی نہیں جانتے تھے۔ اور جس کو آج کل گیارہ کہا جاتا ہے اس کو وہ بھولے بھالے شرفاء دس کے اوپر ایک کہا کرتے تھے۔ اور امن و سکون کی نہایت شریفانہ

زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ حقوق نیابت کا سوال تھا نہ مشترکہ اور جداگانہ انتخاب کی کوئی بحث۔ نہ مسجد اور باجہ کا سوال تھا نہ صوبجاتی اور مرکزی آزادی کا کوئی جھگڑا۔ نہ انتخابات کا جھگڑا تھا نہ الیکشن بازی۔ بلکہ اس قسم کے تمام حوصلے نہایت غیر مضرت رساں طریقہ پر بٹیر بازی سے پورے کر لیے جاتے تھے۔ آپ نے بٹیر بازی کا مضحکہ اڑایا مگر اس انسانوں کی پالی یعنی الیکشن پر غور نہ کیا کہ یہ کیا ہے۔ بٹیر کا کیا وہ تو ایک ادنیٰ سا جانور تھا۔ فرض کر لیجئے کہ بھاگ گیا تو بھگا کہلایا اور زخمی ہوا تو چھتا کہا گیا۔ مگر اس دَور ارتقاء میں یہ رجعت قہقہری ملاحظہ ہو کہ بٹیروں کی جگہ انسان نے لے لی ہے۔ اچھے دل برے ہوتے ہیں۔ بٹیر چھتے نہیں ہوتے بلکہ انسانوں میں سر پھٹول ہوتی ہے۔ اور اسی پر سب کو بڑا ناز ہے۔ لکھنؤ کا تکلف تو ایک ڈھکوسلا تھا مگر یہ تمام باتیں آخر کیا ہیں؟

-x-x-

خیر یہ تمام باتیں تو اس لیے عرض کر دیں کہ بات میں بات پیدا ہو گئی تھی اور مقطع میں نہیں بلکہ مطلع ہی میں سخن گسترانہ بات پیدا ہو گئی تھی جس سے مقصود ترک بحث نہیں بلکہ محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ تکلفات کو چھوڑنے والے کس حد تک غلط راستہ پر ہیں۔ لیکن ایک لکھنؤ سے حاضر ہونے والے کے لیے یہ کس قدر دقت کی بات ہے کہ وہ اس روایتی تکلف کو یک لخت نظر انداز کر دے اور گھڑی کی سوئی کے اشاروں پر عمل پیرا ہو کر مضمون سنانا شروع کر دے۔ پھر لطف یہ کہ سنائے تو کس کو سنائے؟ ماحول یہ ہے کہ ایک تنہا کمرہ ہے جس میں بیٹھے ہوئے مضون پڑھ رہے ہیں بہ آواز بلند۔ یہ سچ ہے کہ ع

ساری دنیا گوش بر آواز ہے

مگر بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قید تنہائی میں باغیانہ تقریر کرنے کی مشق

کررہے ہیں یا در و دیوار سے باتیں ہو رہی ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جب ہم سامعین سے سمع خراشی کی معذرت نہ چاہیں اور سامعین ہر جملہ پر نہ سہی جا بجا مکرر ارشاد نہ کہیں تو سنانے والے کا کیا خاک دل لگے لگا۔ پھر مصیبت یہ ہے کہ ہم بالکل آلہ نشر الصوت کے رحم وکرم پر ہیں۔ اور آلہ نشر الصوت سے زیادہ ہندوستان کی موسمی حالت پر ہمارے اس مضمون کی تقریر کا انحصار ہے۔ فرض کر لیجیے کہ کہیں بادل گرج رہا ہے تو سننے والے یہی کہیں گے کہ سخت بدتمیز ہے یہ شخص بھی۔ مضمون سناتے ہوئے اس قدر واضح قسم کی ڈکار لیتا ہے۔ بلکہ اکثر حضرات کو تو یہ محسوس ہوگا کہ مضمون سناتے سناتے اس خاکسار پر چھت پھٹ پڑی ہے یا یہ خاکسار معہ کرسی اور میز کے الٹ گیا ہے۔ بہرصورت خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ایک مضمون سنانے والے کی کیا کیا گت بنتی ہوگی۔ مگر یہ تمام باتیں اگر مقدرات سے وابستہ سمجھ لی جائیں تو بھی ریڈیو والوں کو اس کا خیال تو رکھنا ہی چاہیے کہ ایک پنجابی اور ایک بنگالی ایک سرحدی اور ایک لکھنوی، سب کے لیے پندرہ منٹ کی قید تو ایک قسم کی زیادتی سی ہے نا۔ چنانچہ دیکھ لیجیے کہ اسی تمہید میں مضمون سے قبل پندرہ منٹ ختم۔

اگر میں بادشاہ ہوتا

رعایا کے دماغ کی خرابی یہی ہے کہ وہ اپنے بادشاہ ہوجانے کا خیال ذہن میں لائے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ یہ بات ایک بادشاہ کے سوچنے کی نہیں ہوسکتی کہ اگر میں بادشاہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ یہ بات تو وہی سوچ سکتا ہے جو بادشاہ نہ ہو اور چونکہ ہم بادشاہ نہیں ہیں لہٰذا اکثر فرصت کے اوقات میں یا بستر پر لیٹ کر سونے سے قبل غنودگی کے عالم میں یہ خیال ذہن میں آیا کرتا ہے کہ ہم بادشاہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ اس کے علاوہ اکثر بادشاہوں کے مقبرے دیکھ کر بھی خیال پیدا ہوا ہے یا اس قسم کے خیالات ذہن میں آنے کا وقت وہ ہوتا ہے جب پیٹ بھر کر کھانا مل چکا ہو اور دوسرے وقت کے متعلق یہ علم ہو جائے کہ گھر میں جنس موجود ہے۔ یا بیوی اپنے میکے جا چکی ہوں اور ضروریات زندگی کی یاددہانی کرانے والا کوئی موجود نہ ہو۔ اس قسم کے تمام مواقع پر انسان یا تو گنگناتے گنگناتے شعر کہنے لگتا ہے یا کوئی نیا راگ دریافت کرتا ہے۔ اور اگر بالکل ہی خالی الذہن ہوا تو پھر یہی غور کرتا ہے کہ اگر میں بادشاہ ہوتا تو کیا ہوتا اور اس غور وفکر میں اس قدر منہمک ہوتا ہے آخر کار اس کو نیند آجاتی ہے۔ ورنہ وہ پاگل ہوکر اپنی بادشاہی کا اعلان کردے اور پاگل خانہ بھیج دیا جائے۔

معلوم نہیں کہ اس قسم کے خیالات پاگل ہوجانے کی علامت ہوتے ہیں یا اہل ہوش پر بھی اس قسم کے جنون کا دورہ پڑسکتا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو مگر ہم کو

اعتراف ہے کہ ہم ایک مرتبہ سے زیادہ اس بات پر غور کر چکے ہیں کہ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ اور ہر مرتبہ اس خیال کو بالکل نئی صورت اختیار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مثلاً کبھی تھرڈ کلاس میں سفر کر رہے ہیں اور تھرڈ کلاس کی کشمکش میں تمام رات اس طرح بسر کرنا پڑی کہ اپنے متعلق یہ فیصلہ کر سکیں کہ ہم آدمی ہیں یا کسی کے اسباب۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ ہماری بھی کیا زندگی ہے۔ اور ہم میں اور ہماری گٹھری میں کیا فرق ہے۔ وہ بھی رکھی ہوئی ہے اور ہم بھی رکھے ہوئے ہیں۔ ہم یقیناً آدمی نہیں بلکہ اسباب ہیں۔ اگر آدمی ہوتے تو بجائے تھرڈ کلاس کے، آدمیوں کی طرح سکنڈ کلاس میں سفر کرتے، ٹانگیں پھیلا کر سوتے، پنکھے کے فراٹوں سے ہوا لیتے اور لچکدار گدار ریل کی ہر جنبش کے ساتھ ہم کو پالنے کا لطف دیتا۔ یا اگر اور بڑے آدمی ہوتے تو فرسٹ کلاس میں سفر کرتے اور اپنے برتھ کو گھسیٹ کر چار پائی بنا لیتے پھر نہ تو اُنگھنے کی ضرورت ہوتی نہ گھٹنوں کے درمیان سر کے غائب ہو جانے کا اندیشہ ہوتا۔ اور نہ اس کا خطرہ کہ اگر ہم اپنی جگہ سے ہلے تو یہ جگہ بھی ہاتھ سے جائے گی۔ بلکہ فرسٹ کلاس میں تو اس قدر کافی جگہ تھی کہ خواہ ہم ایک ہی برتھ پر سوئیں خواہ اس قدر پھیل کر سوئیں کہ ایک برتھ پر ہاتھ سو رہا ہے تو دوسرے پر ٹانگیں تیسرے پر سر ہے تو چوتھے پر کچھ مختصر یہ کہ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ حد یہ ہے کہ رات کو تھرڈ کلاس کی طرح ٹکٹ چیکر بھی ہمارا گھٹنا ہلا کر ٹکٹ طلب نہیں کر سکتا بلکہ وہ رات کو ہمارے درجہ میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا کہ مبادا ہماری فرسٹ کلاس نیند میں کوئی خلل نہ واقع ہو جائے۔ اور اصل آدمی تو وہ ہوتے ہیں جن کے لیے ٹرین میں خاص سیلون لگائے جاتے ہیں۔ اور وہ سیلون کب ہوتے ہیں اچھا خاصہ دولت خانہ ہوتے ہیں۔ رہ گیا گورنر کا اسپیشل یا وئسرائے کی خاص گاڑی اس کا تو خیر پوچھنا ہی کیا۔ اگر ایسی گاڑیوں میں سفر کرنے کا موقع ملے تو ہم شاید اپنے گھر پر رہنا ہی چھوڑ

دیں۔ اور ہر وقت اسپیشل ٹرین میں بیٹھے اِدھر اُدھر پھرا کریں۔ بادشاہ سلامت کی گاڑی اس سے بھی زیادہ پُرتکلف ہوتی ہوگی۔ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو یہ پُرتکلف گاڑی ہم کو بھی ملتی اور ہم اس شان کے ساتھ سفر کرتے کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے۔ ہم خاص طور پر اپنی گاڑی نہایت اعلیٰ درجہ کی بنواتے۔ اس میں ہمارے سونے کا کمرہ علیحدہ ہوتا جس میں سونے کی مسہری پہ ریشمی پردے پڑے ہوتے اور مخملی بستر بجائے خود خواب آور ہوتا۔ یہ بستر ایسا ہوتا کہ اس کو کھولنے اور باندھنے کی زحمت اٹھانا نہ پڑتی۔ غسل خانہ الگ ہوتا اور دفتر کا کمرہ الگ۔ ڈرائنگ روم بھی ہوتا اور تاش کھیلنے کا کمرہ بھی مختصر۔ یہ کہ اس ٹرین میں ہر وہ چیز ہوتی جو ایک انسان کے ذہن میں آسکتی ہے۔ پیانو، ریڈیو اور بائیسکوپ تک اس ٹرین میں ہمارے لیے موجود ہوتا۔ اور ہم غربت میں بھی گویا گھر ہی پر ہوتے یعنی ریل کیا ہوتی گویا محل کے پیر لگ جاتے اور وہی ہمارے اشاروں پر دوڑتے ہوئے نظر آتے۔ اس قسم کے خیالات کا سلسلہ اس وقت منقطع ہوتا ہے جب کہ ٹرین کسی اسٹیشن پر ٹھہرے اور بہت سے دیہاتی لٹھ بند، یا کسی میلے سے بھاگتے ہوئے مویشی نما انسان، یا کچھ گھبرائے ہوئے براتی، یا بے شمار مارواڑی معہ اہل وعیال اس تھرڈ کلاس پر یکا یک حملہ کرتے ہیں اور ان کو رہ رہ کر سمجھانا پڑتا ہے کہ بھائی تم کس چیز پر بیٹھ رہے ہو، وہ کوئی بیٹھنے کی جگہ نہیں بلکہ ہم ہیں یعنی ہمارا سر ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ سر ہی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس تمام شاہی طلسم خیال کو توڑ کر صرف یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو اس تھرڈ کلاس میں سفر نہ کرتے۔

اپنے بادشاہ نہ ہوسکنے کا احساس اس وقت بھی نہایت شدت کے ساتھ ہوتا ہے جب ہم اپنے کسی عزیز کی ناگہانی علالت کا حال سن کر حد درجہ بدحواسی کے ساتھ بائیسکل پر بھاگے ہوئے جا رہے ہوں۔ اور راستہ میں کانسٹبل ہم کو روک کر

نہایت بے محل طریقہ پر ہمارا نام، ولدیت اور پتہ دریافت کرنا شروع کر دے۔ اور اس کے بعد بائیسکل کی ولدیت یعنی نمبر بھی ہم ہی سے پوچھے۔ کانسٹیبل کے اس طرزِ عمل کو قانونی زبان میں چالان اور غیر قانونی میں بداخلاقی کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم کو بائیسکل میں لیمپ لگانا چاہیے۔ اگر اور ہم بغیر لیمپ کے دیکھے جائیں تو کانسٹیبل کا فرض ہے کہ وہ ہمارا نمبر اور بائیسکل کی ولدیت نوٹ کر لے اور چالان کر دے۔ مگر اس قسم کے مواقع پر اکثر قدرتی طور پر یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو یہ برا وقت دیکھنا کیوں نصیب ہوتا۔ اوّل تو بادشاہ ہونے کی صورت میں ہم کو اسی کی ضرورت نہ ہوتی کہ ہم اپنے کسی بیمار عزیز کی عیادت کو جائیں۔ بلکہ تمام بیمار عزیز خود اپنی علالت کو بھول کر ہماری مزاج پرسی کو آیا کرتے۔ لیکن فرض کر لیجیے کہ ہم کو جانا بھی پڑتا تو ہم اس شان سے جاتے کہ ہمارے لیے تمام راستہ کی سڑکیں پہلے سے بند ہوتیں۔ اور ان پر پہرہ ہوتا۔ ہماری سواری نکلنے سے قبل ان تمام پہرہ والوں کا دم نکلتا رہتا اور جس وقت ہمارا شاہی موٹر سنسناتا ہوا نکل جاتا۔ اس وقت سب کی جان میں جان آتی۔ خیر یہ تمام باتیں تو عام طور پر بادشاہوں کے لیے ہوا ہی کرتی ہیں۔ لیکن اگر ہم بادشاہ ہوتے تو ہمارا انتظام ہی دوسرا ہوتا۔ مثلاً ہماری سواری کی شان یہ ہوتی کہ جس سڑک سے ہم گذرنے والے ہوتے۔ اس پر تمام دن کیوڑا اور گلاب چھڑکا جاتا۔ اس کے بعد تمام سڑک پر سچے ستارے اور سچے موتی بچھا دیئے جاتے۔ اور زمین پر تاروں بھری رات کا گمان ہوتا۔ تمام راستہ میں دو رویہ بیلہ چمبیلی اور موتیے کے گجروں کی زنجیریں کھینچ دی جاتیں اور راستہ میں جابجا خوشبودار پھولوں کے متعدد پھاٹک بنائے جاتے۔ تماشائیوں کو سواری دیکھنے کی عام اجازت ہوتی مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ موسم کے اعتبار سے سرکاری طور پر مقرر کردہ لباس میں صف بہ صف

دو رویہ کھڑے ہوں۔ اور ان میں کوئی بدصورت مرد یا عورت ہرگز نہ ہوتا کہ جہاں پناہ کی نظر ذرا بھی مجروح نہ ہونے پائے۔ البتہ کبھی کبھی جہان پناہ یعنی ہم اگر کوئی تفریحی پروگرام بناتے تو اس میں رعایا کو دلچسپی لینے کا یقیناً حق دیتے۔ مثلاً قصر شاہی سے یہ اعلان کر دیا جاتا کہ آج جہاں پناہ اور ملکہ معظمہ میں لباس تبدیل ہو گیا ہے۔ چنانچہ حضور خداوند نعمت ملکہ معظمہ کے لباس میں ہوں گے۔ اور ملکہ معظمہ جہاں پناہ کے لباس میں لہٰذا رعایا کو حکم دیا جاتا ہے کہ تمام مرد عورتوں کے لباس میں اور تمام عورتیں مردوں کے لباس میں ٹھیک پانچ بجے قصر شاہی کے سامنے جمع ہوں اور اپنے بادشاہ کی دلچسپی میں حصہ لیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ پروگرام کس قدر دلچسپ ہوتا۔ اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ صرف بادشاہ ہی کے لیے دلچسپ نہ ہوتا۔ بلکہ رعایا بھی اس دلچسپی میں برابر کی حصہ دار ہوتی۔ ہماری فطرت سے یہ بات یقیناً بعید تھی۔ کہ ہم بادشاہ ہوتے تو سنجیدہ بنے ہوئے بس تخت پر بیٹھے رہتے...... بلکہ ہم تو دن رات اسی فکر میں رہتے کہ اب کیا کیا جائے اور کس صورت سے اپنے لمحات کو دلچسپ بنایا جائے۔ مثلاً کبھی فرمان شاہی یہ نافذ کر دیا جاتا کہ دربارِ عام میں تمام درباری اپنے ہمراہ ایک ایک بندر لائیں مگر واضح رہے کہ ان بندروں کی وجہ سے کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے کہ جو آدابِ دربار کے خلاف ہو اور ہر درباری باوجود ان بندروں کے آدابِ شاہی اور اپنی سنجیدگی کا پورا خیال رکھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تو کسی درباری کی مجال ہو نہیں سکتی کہ وہ شاہی فرمان کی تعمیل نہ کرے۔ لیکن اس فرمان کی تعمیل میں جس قدر مشکل ہو سکتی ہے اس کو وہی حضرات خوب سمجھ سکتے ہیں جن کی نظر سے کوئی سنجیدہ انسان اور کوئی غیر سنجیدہ بندر گذرا ہے۔ اوّل تو بندر کو اپنے ساتھ رکھنا ہی کمال ہے اور بڑے بڑے بہادر اس قسم کی جسارت نہیں کر سکتے لیکن جب بندر کو ساتھ رکھنا اس طرح موت اور زندگی کا سوال

بن جائے تو سنجیدہ سے سنجیدہ انسان کے لیے دشوار بھی نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھ سکے۔ اوّل تو وہ خود ہی نہایت مضحک ہو کر رہ جائے گا۔ دوسرے اس کو سنجیدہ بننے کی کوششیں نہایت مضحک بنا دیں گی۔ بہر حال اس فرمان کو نافذ کرنے کے بعد ہم ایسا تماشا دیکھتے جو لاکھوں روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ ہمارا ایک سے ایک قابل وزیر ایک سے ایک خونخوار صورت کا فوجی افسر اور ایک سے ایک عالی مرتبہ رئیس دربار میں اپنے اپنے بندروں کے ساتھ جب داخل ہوتا۔ تو ہمارے لیے ہنسی کا روکنا دشوار ہو جاتا۔ پھر لطف یہ ہوتا کہ وہ بندر اپنے اپنے مالک کی جوگت بناتے وہ بھی قابل دید ہوتی۔ اور ایک درباری کا بندر جب دوسرے درباری پر یا اس کے بندر پر حملہ کرتا وہ منظر ہمارے عہد حکومت کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھنے والا ہوتا۔ اور اس دربار کو مورخ کبھی نظر انداز نہ کر سکتا۔ مختصر یہ کہ ہمارے دربار میں آئے دن اس قسم کے تماشے ہوتے رہتے اور یہ معلوم ہوتا کہ واقعی شاہی دربار ہے۔ یہ نہیں کہ بس دربار میں ہر وقت یہی بحث ہوا کرے کہ رعایا کو کس طرح فائدہ پہونچایا جائے اور رعایا کی تکلیف کو کس طرح دور کیا جائے۔ یہ کام دراصل بادشاہ کا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لیے جب بادشاہ نے الگ الگ محکمے کھول دیے ہیں تو خود بادشاہ کو ان معاملات میں اپنا دماغ پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کوئی غیر ملک اگر حملہ کر رہا ہے تو اس کو محکمہ جنگ جانے بادشاہ سے کیا مطلب؟ رعایا کو کوئی تکلیف ہے تو بادشاہ سے کیا؟ ان شکایات کو سننے اور رفع کرنے کے لیے بادشاہ نے حاکم مقرر کر دیئے ہیں وہ خود ہی سب کریں گے۔ بادشاہ تو صرف اس لیے ہوتا ہے کہ بادشاہی کرے اور بادشاہی ہمارے نزدیک صرف یہ ہے کہ انسان مزے کرے۔ لہٰذا ہم بھی مزے کرتے اور جی کھول کر مزے کرتے اور ایک خاص محکمہ محض اس

لیے ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ کے لیے لطف زندگی حاصل کرنے کی نئی نئی صورتیں ایجاد کرتا رہے۔ البتہ اگر ہم کو کبھی اسی میں دلچسپی ہوتی کہ ہم کبھی تقریباً حکومت کے معاملات کو بھی دیکھ لیں تو دوسری بات ہے لیکن ہم اس بات کے پابند نہ ہوتے اور واقعی بادشاہ پر پابندی کیسی ہمارے لیے تو دن اور رات کی پابندی بھی ناممکن ہوتی بلکہ اگر ہم دن کو سونا چاہتے تو رات کا ماحول پیدا کر دیا جاتا۔ اور رات کو جاگنا چاہتے تو وہی دن بنادی جاتی۔ ہم بادشاہ اس لیے ہوتے کہ جدھر ہماری نظر اٹھ جائے بڑے بڑے گردن فرازوں کی گردنیں جھکی ہوئی ملیں۔ ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ اگر کبھی کوئی کانسٹبل کسی داروغہ جی کے دھوکے میں غلطی سے سلام کر لیتا ہے تو اس غلطی کو سمجھتے ہوئے بھی خون میں ایک گردش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ایک روحانی انبساط حاصل ہوتا ہے۔ پھر بھلا جب کانسٹبل تو کانسٹبل بڑے بڑے تھانہ دار اور کوتوال بلکہ بڑے بڑے جرنیل اور کرنل اپنی سانس تک روک کر ہم کو سلامی دیتے اور بت بن کر کھڑے ہو جاتے تو ہماری خوشی کا کیا حال ہوتا۔ اور ہماری صحت کس قدر ترقی کرتی۔ خیر یہ تمام باتیں تو بہت بلند ہیں ہم تو دراصل اپنی موجودہ حالت کو دیکھ کر اگر اپنے بادشاہ ہونے کے متعلق غور کرتے ہیں تو ہماری خواہشیں ان تمام باتوں سے ذرا مختلف ہوتی ہیں۔ اور ہم گھنٹوں یہی سوچتے رہتے ہیں کہ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو روز ایک نیا سوٹ پہنتے اور اعلیٰ درجہ کے ریشمی رومال عطر میں بسا کر جیب میں رکھتے۔ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو کبھی کسی سے کچھ قرض نہ لیتے اور اگر لیتے تو اس سے قبل کہ وہ تقاضہ کرے ہم فوراً اس کا روپیہ واپس کر دیتے۔ اور جس طرح تقاضہ کرنے والوں سے اب ناک میں دم ہے اس وقت نہ ہوتا۔ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو ایک مرتبہ کشمیر کی سیر ضرور کرتے اور عام طور پر گرمیوں میں خس کی ٹٹیوں میں رہتے اور لو کے تھپیڑوں سے بچ جاتے۔ اگر ہم

بادشاہ ہوتے تو آرام کرسی پر لیٹ کر اپنے مضامین بولا کرتے اور ایک منشی ان کو لکھا کرتا بجائے اس کے کہ ہم خود لکھتے ہیں اور آنکھیں پھوڑتے ہیں۔ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو ہماری تمام کتابوں کے نہایت عمدہ عمدہ ایڈیشن چھپا کرتے۔ اور ہر ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتا۔ ممکن ہے ان میں سے بہت سی باتیں ایسی ہوں جس کا تعلق بادشاہوں سے نہ ہوتا ہو مگر ہم تو بس انہی باتوں کی حد تک بادشاہ ہونا چاہتے تھے اس سے زیادہ ہمارا کوئی مطلب نہ ہوتا۔ رہ گئی سلطنت وہ ہم سے اسی طرح غیر متعلق رہتی جس طرح اب ہے۔

وکیل

ہندوستان میں جیسی اچھی پیداوار وکیلوں کی ہو رہی ہے اگر اتنا ہی غلہ پیدا ہوتا تو کوئی بھی فاقے نہ کرتا۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ غلہ پیدا ہوتا ہے کم اور وکیلوں کی فصل ہوتی ہے اچھی۔ نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہی سب غلہ کھا جاتے ہیں اور باقی سب کے لیے فاقے چھوڑ دیتے ہیں۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ بھوکے ہندوستانی سوائے آپس میں لڑنے اور ایک دوسرے سے روٹی چھیننے کے اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ اسی چھینا جھپٹی اور لڑائی دنگے میں مقدمے تیار ہوتے ہیں۔ اور ان مقدموں میں پھر ضرورت پڑتی ہے ان ہی وکیلوں کی جو ہر سال کھیتوں کے بجائے کالجوں میں غلہ کی جگہ پیدا ہوتے ہیں۔

ضرورت اس کی تھی کہ مقدموں کی تعداد کے حساب سے وکیل ہوا کرتے مگر وکیلوں کی تو اور کثرت ہے کہ اگر ایک ایک مقدمہ میں ایک ایک ہزار وکیل لگا دیئے جائیں تو بھی وکیلوں کی ایک بہت بڑی جماعت ایسی باقی رہ جائے گی جو مقدمے نہ ملنے کی شکایت کرتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوکری نہ ملنے کی وجہ سے بہت سے گریجویٹ گھبرا کر وکیل تو بن جاتے ہیں مگر وکیل بننے کے بعد جب مقدمے بھی نہیں ملتے تو پھر گھبرا کر نوکری کرنے لگتے ہیں۔ اگر غور کیجیے تو اس وقت وکیلوں کی بہت سی قسمیں آپ کو ملیں گی۔ ایک قسم تو ان وکیلوں کی ہے جن کی وکالت چل رہی ہے ایک

قسم وہ ہے کہ وکیل صاحب خود چل رہے ہیں مگر وکالت نہیں چلتی۔ ایک تیسری قسم ان وکیلوں کی ہے جو نہ خود چلتے ہیں نہ وکالت چلتی ہے بلکہ دونوں سائن بورڈ بنے ہوئے دروازے پر لٹکے رہتے ہیں۔ اور چوتھی قسم ان وکیلوں کی ہے جو ہیں تو وکیل ضرور مگر وکالت سے گھبرا کر کسی اسکول میں ماسٹری کر رہے ہیں یا کسی دفتر میں کلرکی فرما رہے ہیں یا کسی رئیس کے یہاں نوکر ہیں یا اپنی سسرال میں رہتے ہیں یا فقیری لے چکے ہیں یا محض شاعر بن گئے ہیں یا کوئی اخبار نکال کر ایڈیٹر ہو گئے ہیں یا کسی فلم کمپنی میں ایکٹر ہیں یا ریلوے میں ٹکٹ کلکٹر ہیں۔ یا ابھی تک گھر میں بیٹھے ہوئے یہ غور کر رہے ہیں کہ آٹا پیسنے کی چکی لگانا مناسب ہوگا یا شادی ایجنسی کھولنے میں زیادہ فائدہ ہے۔ بہر حال وکالت کا ان کے دماغ میں کوئی خیال نہیں ہوتا اور نہ بھول کر بھی وہ کبھی اپنے وکیل ہونے کے متعلق غور کرتے ہیں۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ وکالت آخر کہاں تک چلے اور کس کس کی چلے۔ یقین جانیے کہ اگر ہندوستان بھر کے لوگ ایک دوسرے سے سر پھٹول میں مصروف ہو جائیں اور ہندوستان کی تمام آبادی کو سوائے اس کے اور کوئی کام نہ رہ جائے کہ وہ بس فوجداری کیا کرے تو ان وکیلوں کی شاید پوری پڑے۔ مگر قصہ تو یہ ہے کہ ہر سال ہندوستان کی آبادی جتنی نہیں بڑھتی اتنے وکیل بڑھ جاتے ہیں۔ اور اگر یہی رفتار ہے تو وہ دن قریب ہے جب ہر مؤکل خود وکیل بھی ہوا کرے گا۔ اور وکیل مؤکل بھی ہوگا۔ یعنی اس ملک میں سوائے وکیلوں کے اور کوئی نظر ہی نہ آئے گا۔ مالک وکیل، نوکر وکیل، میاں وکیل، بیوی وکیل، باپ وکیل، تاجر وکیل، گاہک وکیل، مجرم وکیل، منصف وکیل، ملزم وکیل، گواہ وکیل، جیوری وکیل۔ مختصر یہ کہ ادھر وکیل اُدھر وکیل، اتر وکیل، دکھن وکیل، پورب وکیل پچھم وکیل گویا کہ وکیلوں کا ایک سیلاب ہوگا جس میں ہندوستان بہ جائے گا۔ اور تاریخوں میں ہندوستان کا صرف اسی قدر ذکر باقی رہ

جائے گا کہ یہ ایشیا کا ایک ملک تھا کہ جس میں وکیل پیدا ہوتے تھے اور آخر ان ہی وکیلوں کی کثرت نے اس ملک کو ڈبو دیا۔ اب بھی بحر ہند میں اکثر وکیلوں کے گون اور وکالت نامے تیرتے ہوئے پائے جاتے ہیں اور غوطہ خوروں نے مقدمات کی مسلیں بھی برآمد کی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وکیلوں کی اس دن دونی رات چوگنی ترقی کے بعد وکیل بے چارے آخر کریں گے کیا۔ آج ہی یہ حال ہے کہ مقدموں کے لیے وکیل تو جس تعداد میں جس سائز، جس ڈزائن کے کہیے ڈھیر کر دیے جائیں۔ مگر وکیلوں کو آنکھ میں لگانے کے لیے دوا کے طور پر بھی مقدمے نہیں ملتے اور خدا جانے وہ بے چارے کیوں کر وکیل بن کر زندہ رہتے اور اپنی ظاہری شان کو قائم رکھتے ہیں۔ مگر یقین جانیے کہ جو زمانہ کل آ رہا ہے وہ آج سے بھی زیادہ ان وکیلوں کے لیے سخت ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان روز بروز مہذب ہو رہا ہے اور سمجھدار ہندوستانی لڑائی جھگڑا چھوڑتے جاتے ہیں مگر وکیل ہیں کہ ابلتے ہی آتے ہیں۔ جو وکیل پہلے سے بنے ہوئے ہیں ان کا تو حال یہ ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ پھر بھلا اس نئی درآمد کی کھپت کہاں ہو سکتی ہے۔ یہ مذاق نہیں ہے بلکہ وکیلوں کو واقعی اپنے متعلق ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہے کہ وہ کیا کریں گے۔ اگر ہمارا یہ خیال غلط بھی ہے کہ ہندوستان مہذب ہو رہا ہے اور لڑائی جھگڑے کو لوگ چھوڑ رہے ہیں جس کے بعد مقدمے تیار نہ ہو سکیں گے تو بھی ذرا غور تو کیجیے کہ ہر سال وکیلوں کی جو فوج ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں سے نکلتی ہے اس کے لیے نئے نئے مقدمے کہاں سے لائے جائیں گے۔ اور اگر اسی حساب سے ہندوستان میں جرائم کی رفتار بڑھتی گئی۔ اور مقدموں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا تو اس کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں۔ کہ یا تو ہندوستان ایک بہت بڑا جیل خانہ بن کر رہ جائے ورنہ سری نگر سے راس کماری تک

اور کراچی سے ڈبرو گڈھ تک لمبی چوڑی کچہری ہو جائے گا۔ لیکن اس کے بعد بھی تو وکیلوں کو اپنے لیے کوئی اور راستہ ڈھونڈھنا پڑے گا۔ پھر آخر وہ ہندوستان کو جیل خانہ یا کمرہ عدالت بنا دینے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ آخر اپنے لیے ابھی سے کوئی راستہ کیوں نہیں ڈھونڈھتے۔ جنگلات کا محکمہ ہے اس میں جگہ ڈھونڈھتے رہیں۔ دنیا کے سمندروں میں بہت سے غیر آباد جزیرے ہیں۔ ان کو ڈھونڈھیں اور آباد کریں۔ ہمالیہ کی مہم میں اب تک سب کو ناکامی ہوئی ہے۔ یہ لوگ بھی کوشش کریں شاید کامیابی انھیں کی قسمت میں لکھی ہو۔ ہندوستان کے جنگلوں میں خوفناک درندے مارے مارے پھرتے ہیں اگر ان کو سدھا لیا جائے تو وہ سرکسوں میں کام آسکتے ہیں اور سرکس والے اچھے دام دے کر ان کو خرید سکتے ہیں لہٰذا ان درندوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کریں۔

شیر کو سلام کرنا سکھائیں۔ بھالو کو حقہ پینے کی تعلیم دیں۔ بندروں کو ڈانس کرائیں۔ اور اسی طرح ان جنگلی جانوروں کو سرکس کے قابل بنائیں۔ یہ بہت فائدے کا کام ہے۔ اور اس کام میں سب ہی لگ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ذرا محنت کریں۔ دنیا کے سمندروں میں آئے دن جہاز ڈوبتے رہتے ہیں۔ ایسے ایسے خزانے ہوتے ہیں جو اگر کسی کو مل جائے تو وہ مالدار ہو جائے لہٰذا غوطہ خوری سیکھیں۔ اور اس دولت کو حاصل کریں جو مچھلیوں اور کچھوؤں کے لیے بیکار ہے مگر انسان کے کام آسکتی ہے اور انسان کو مالا مال کر سکتی ہے۔ اسی ہندوستان میں خدا جانے زمین کے اندر کیسے کیسے خزانے ہیں۔ کہیں سونے کی کان ہے تو کہیں مٹی کے تیل کا چشمہ۔ کہیں کوئلہ ہے تو کہیں لوہے کی کان ہے۔ اگر ویران جنگلوں میں ذرا دل لگا کر کھدائی شروع کر دی جائے تو اگلے زمانہ کے بادشاہوں سے لے کر چھوٹے رجواڑوں تک کے خزانے الگ مل سکتے ہیں۔ اور یہ کانیں الگ دریافت کی جا سکتی ہیں۔ دوسرے ملک

کے لوگ نئی ایجادیں کرتے رہتے ہیں کہ کہیں کسی درخت کے ریشوں سے کپڑا بنا لیا تو کہیں دو تین درختوں کی جڑوں کو ملا کر کوئی کھانے کی چیز پیدا کر لی۔ آخر اس قسم کی ایجادوں کی طرف یہ لوگ کیوں نہ متوجہ ہوں۔ کیا تعجب ہے کہ ان ہی کے دماغ میں کوئی ایسی ترکیب آجائے جس سے کپڑے کو کھایا اور روئی کو پہنایا جا سکے۔ یا ریت کو اناج کی طرح پیٹ بھرنے کے کام میں لایا جا سکے یا آٹے کی بھوسی سے سوٹ کا کپڑا تیار ہو سکے۔ بہر حال دماغ لڑانے کی ضرورت ہے اور جب دماغ لڑ جائے تو ہاتھ پیر چلانے کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس لیے کہ اب خالی بیٹھنے اور وکالت سے کوئی امید رکھنے سے کام نہیں چل سکتا۔ خدا نہ کرے کہ وکیلوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی طرح مقدمے بھی بڑھتے جائیں۔ ابھی تو خیر منشی جی ایک آدہ موکل کہیں نہ کہیں سے پکڑ ہی لاتے ہیں۔ اور وکیل صاحب اونے پونے اس کا مقدمہ اس لیے لڑا دیتے ہیں کہ پیٹ میں آنتیں ایک دوسرے سے لڑتی ہیں۔ اور گھر میں بیوی ناک میں دم رکھتی ہیں۔ آخر ان سب کو کسی طرح سمجھایا جائے یا نہیں۔ لیکن اب تو وہ وقت بھی آرہا ہے جب منشی جی خود بھی وکیل ہوں گے، اور گھر والی بھی وکیل ہوں گی۔ پھر وکیل صاحب آسانی سے یہ نہ سمجھا سکیں گے کہ مقدمہ کیوں نہیں ملتا اور وکالت کیوں نہیں چلتی۔

صاحب لاکھ باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ دنیا کی ہوا ہی کچھ وکالت کے خلاف چل رہی ہے۔ ایک طرف وکیل بڑھتے جاتے ہیں اور وکیل عام طور پر اچھی خاصی عمر پاتے ہیں۔ دوسری طرف ہندوستان کے موکل قسم کے باشندے مقدموں کا شوق چھوڑ رہے ہیں۔ اگلے زمانہ میں تو یہ ہوتا تھا کہ کسی نے کسی کو دیکھ کر اگر زمین پر تھوک بھی دیا تو لیجیے ایک لاجواب چلتا پھرتا مقدمہ تیار ہو گیا جو مہینوں چلا کرتا تھا اور دونوں طرف کے وکیلوں کو خوب خوب فیسیں ملتی تھیں۔ لیکن اب تو یہ حال ہے کہ کسی کو سر راہ مار بھی دیجیے اور پھر صرف یہ کہہ دیجیے کہ معاف کیجیے گا غلطی ہوئی، بس وہیں پر

ہاتھ مل جاتے ہیں۔ اور قصہ کچہری کیا معنی تھانہ تک نہیں پہونچتا یا اچھی خاصی فوجداری کو لوگ بیچ بچاؤ کر کے ختم کرا دیتے ہیں۔ یہ دراصل وکیلوں کی حق تلفی ہے اور وکیلوں کو چاہیے کہ اس کے لیے قانون بنوائیں کہ اس طرح کا نجی بیچ بچاؤ جرم قرار دے دیا جائے ورنہ تمام معاملات یوں ہی طے ہونے لگیں گے اور یہ وکیل بے چارے کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔ بلکہ اگر وکیل صاحبان ہماری رائے مانیں تو ہم ان کو مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے ان معاملات میں بھی حق پیدا کریں، جن کا تعلق اب تک قانون یا عدالت سے نہیں ہے۔ اس لیے کہ مقدمہ بازی تو بہت جلد کم ہو ہی جائے گی اور وکیلوں کا کام اب دوسری صورتوں ہی سے چل سکتا ہے، جن میں سے چند ہم بتائے دیتے ہیں۔ وکیلوں کو چاہیے کہ وہ اس بات پر زور دیں، کہ چونکہ شادی بیاہ بالکل قانونی چیز ہے لہٰذا ہر شادی کے موقع پر ایک قاضی کے علاوہ لڑکی والوں اور لڑکے والوں کی طرف سے ایک ایک سند یافتہ وکیل بھی ہوا کرے تاکہ وہ شادی کی قانونی صورتوں کو باقاعدہ بنا سکیں اور کوئی قانونی خامی باقی نہ رہے۔ اسی طرح بچہ کی پیدائش کے وقت دائی کو چاہیے کہ وہ وکیل کے سامنے اپنا بیان دے اور اسی بیان کو روشنی میں بچہ کی وراثت طے پائے۔ طلاق اور عاق کے قصوں میں بھی وکیلوں کی موجودگی ضروری بنائی جائے۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کی چیزیں ہیں جن میں آئندہ وکیل اپنی وکالت کو کام میں لاسکیں گے۔ اور ان چیزوں کے لیے اگر ابھی سے کوشش نہ کی گئی تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ اور پھر وکیلوں کی جو حالت ہوگی وہ نہایت افسوس ناک ہوگی۔ مگر ہم کو امید ہے کہ وکیل صاحبان یہ نوبت نہ آنے دیں گے۔ بلکہ اپنے اور اپنی آئندہ نسل کے لیے یہ انتظام کرلیں گے کہ مقدموں کے علاوہ بھی قدم قدم پر ان کی ضرورت محسوس ہو۔ زمین وکیل صاحب بکوائیں گے۔ ریل کا ٹکٹ وکیل صاحب کے سامنے خریدا جائے گا۔ اسکول میں بچہ کا داخلہ وکیل صاحب کے ذریعہ ہوا کرے

گا۔ پارسل وغیرہ ایک وکیل صاحب کے سامنے روانہ ہوں گے اور دوسرے وکیل صاحب کے سامنے کھولے جائیں گے۔

میاں بیوی وکیلوں کو سامنے بٹھا کر آپس میں لڑا کریں گے۔ باپ وکیل صاحب کی موجودگی میں بچے کو سزا دے گا۔ ڈاکٹر وکیل صاحب کی موجودگی میں نسخہ لکھیں گے اور مریض وکیل صاحب کے سامنے نسخہ استعمال کرے گا۔ مرنے والا وکیل صاحب سے مشورہ لے کر مرے گا۔ اور مرنے والے کے عزیز وکیل صاحب کی رائے سے کفن کا انتظام کریں گے۔ شاعر وکیل صاحب سے پوچھ پوچھ کر شعر کہا کریں گے اور ایڈیٹر اپنا ہر پرچہ وکیل صاحب کو دکھا کر شائع کریں گے۔ مقرر پہلے وکیل صاحب کو تقریر سنائے گا۔ اور جلسہ میں جانے والے پہلے وکیل صاحب سے رائے لے لیں گے۔ مختصر یہ کہ ان تمام باتوں میں اگر وکیلوں نے اپنی ضرورت پیدا کر لی تو خیر۔ نہیں تو ہم بتائے دیتے ہیں کہ آج نہیں تو کل وکیل صاحبان یہ غور کریں گے کہ ہم کیا کریں۔ اور ہمارا کام کیا ہے۔ یہ جتنی چیزیں ہم نے بتائی ہیں ان میں وکیل صاحبان اپنی ضرورت آسانی سے پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ بظاہر یہ معمولی معمولی باتیں ہیں مگر بڑھتے بڑھتے یہی بات کا بتنگڑ بن کر عدالتوں اور ہائی کورٹوں سے گذر کر پریوی کونسل تک پہونچ سکتی ہیں۔ لہٰذا وکیلوں کی ان میں یقیناً ضرورت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وکیل اپنی ضرورتیں خود نہ پیدا کرائیں۔

بے روزگار

ہم بیکار تو یقیناً نہیں ہیں اس لیے کہ اس مختصر سی زندگی میں جو کار نمایاں ہم نے انجام دیئے ہیں وہ بجائے خود اس کی تردید میں پیش کیے جا سکتے ہیں کہ ایک بیکار آدمی اس قدر کارآمد ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مثلاً یہ کہ ہم نے متعدد چھوٹے چھوٹے امتحانات پاس کیے یا یہ کہ صرف ایک بی۔اے کے امتحان میں مسلسل اور متواتر تین سال تک فیل ہوئے۔ اس کے بعد ہم نے ایک شادی کی پھر دو مستقل بچے پیدا کیے۔ یہ تمام باتیں آپ کو اس بات کا یقین دلا دینے کے لیے کافی ہیں کہ ہم بیکار نہیں ہیں۔ البتہ اس بات کا نہایت صفائی کے ساتھ اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہم بے روزگار ضرور ہیں۔ مگر اس میں دراصل ہماری کوئی خطا نہیں ہے بلکہ اگر سچ پوچھیے تو اس میں غلطی ہے ہر اُس روزگار کی جس کو حاصل کرنے کی ہم کوشش کرتے ہیں مگر وہ خود ہم سے گریزاں نظر آتا ہے۔

ہم آپ کو باور کرانا چاہتے ہیں اور شرافت کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ آپ ان تمام واقعات کو صحیح سمجھیے گا کہ ہم چار سال سے مسلسل روزگار کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم نے پولیس کی سب انسپکٹری کے لیے زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیئے اور ممبران کونسل سے لے کر وزراء تک کی سفارشیں اپنی تائید میں لا کر کھڑی کر دیں۔ مگر یہ مقدر ہی تو ہے کہ جب یہ تمام کوششیں کامیاب ہوئیں اور

پولیس ٹریننگ اسکول میں داخلہ کا امکان پیدا ہوا تو خدا جانے کیوں کر سینہ پورے چار انچ چھوٹا نکل گیا۔ اس سلسلے میں روایات ذرا مختلف ہیں۔ ہمارے بعض احباب کا خیال ہے کہ دراصل ہمارا سینہ چھوٹا نہ تھا بلکہ سینہ ناپنے کا فیتہ ہی چار انچ بڑا تھا اور خود ہمارا خیال ہے کہ فیتہ بھی ٹھیک تھا اور سینہ بھی کافی چوڑا تھا مگر اس قسم کے امتحانی موقع پر ہماری ہمیشہ کی عادت ہے کہ کچھ سکڑ جاتے ہیں۔ اور یقیناً یہی واقعہ اس پیمائش کے وقت بھی پیش آیا ہوگا۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو تمام سفارشیں دھری رہ گئیں۔ اور تمام کوششوں پر پانی پھر کر رہ گیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اس میں ہمارا کیا قصور تھا۔ یقین جانئے کہ اگر سینہ کی طرف سے یہ گمان بھی ہوتا کہ عین وقت پر دھوکا دے گا تو ہم سب سے پہلے اسی کی خبر لیتے اور ورزش وغیرہ کر کے اس خامی کو ہرگز باقی نہ رہنے دیتے۔ بہر صورت اب تو پولیس کے خیال ہی کو دل سے نکال دینا پڑا۔ اور سب انسپکٹر کے بعد نظر انتخاب سب رجسٹراری پر پڑی۔

سب رجسٹراری ایک معمولی سی تنخواہ کی چھوٹی سی ملازمت ہے مگر ہم نے تو ہر سب رجسٹرار کو اس قدر مطمئن اور خوش پایا ہے کہ گویا سب رجسٹرار ہونے کے بعد یہ حضرات وزارت عظمیٰ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ لہٰذا ہم بُری طرح سب رجسٹراری پر فریفتہ ہو گئے اور اس کے لیے کوئی ایسی کوشش نہ تھی جو اٹھا رکھی ہو۔ پہلے سال تو درخواست ذرا دیر میں گذری...... لہٰذا دوسرے سال پر معاملہ ٹل گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ گویا ہم کو ایک سال کا مزید موقع ملا کہ ہم اپنی امیدواری کے استحقاق کو مستحکم بنائیں۔ چنانچہ یقین جانئے کہ ہم نے اس جگہ کے لیے وہ کوششیں کی ہیں کہ آخر کار ہماری درخواست قابل غور درخواستوں میں شامل کر لی گئی۔ اور اب نہ صرف ہم کو بلکہ ہر ایک کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ ہمارا انتخاب ضرور عمل میں آئے گا۔ اور وہی ہوا بھی کہ ہم کو آخر کار انٹرویو کے لیے طلب کیا گیا۔ اور ہم اپنے گھر سے سب

رجسٹرار کی حیثیت سے روانہ ہوئے مگر اب ذرا نحوست آبی ملاحظہ ہو کہ عین انٹرویو کے وقت معلوم یہ ہوا کہ ہماری عمر زیادہ ہے۔ اور زیادہ بھی کتنی صرف ایک دن۔ ہم نے لاکھ لاکھ چاہا کہ ایک دن کو نظر انداز کر دیا جائے مگر معلوم ہوا کہ اس ایک دن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا خواہ ہم خود ہی نظر انداز کر دیے جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ایک دن کی بزرگی نے ہم کو یہاں بھی مارا۔ اور اپنا سا منہ لے کر واپس آ گئے۔ ناامیدی اور شکستگی کا جو عالم ہم پر طاری تھا اس کی تفصیل کچھ نہ پوچھیے مگر اس کے باوجود آپ انصاف سے کام لے کر یہ بتائیں کہ اس میں آخر ہماری کیا خطا تھی۔ اگر ہمارے امکان میں ہوتا تو ایک دن کیا معنی ایک ہفتہ بعد میں پیدا ہوتے مگر قسمت میں تو یہ گردش لکھی تھی۔ ایک ہفتہ بعد کیوں کر پیدا ہوتے۔ یا پیدا ہی نہ ہوتے تو بھی یہ ہو سکتا تھا کہ نظر انتخاب کچھ دن پہلے ہی ہو جاتا۔

سب انسپکٹری کے بعد سب رجسٹراری کی کوشش میں اس غیر متوقع ناکامی نے ہمارے تمام حوصلے پست کر دیئے۔ اس لیے کہ اول تو کسی قدر لغو اور مہمل طریقہ پر ناکام ہوئے تھے، دوسرے عمر متجاوز ہو چکی تھی جس کے معنی یہ ہوئے کہ اب سرکاری ملازمت کا دروازہ ہم پر بند ہو چکا تھا۔ اِدھر گھر میں یہ حال کہ اس خاکسار مربی کو مربہ سمجھ کر اہل و عیال کھائے جاتے ہیں۔ ماشاءاللہ بھرا ہوا گھر اور کمانے والے صرف ہم وہ بھی بے روزگار۔ اس میں شک نہیں کہ آخر ہم کیا کرتے اور ہمارے بس کی کیا بات تھی۔ مگر بیگم بھی ٹھیک کہتی تھیں کہ آخر وہ کیا کریں اور گھر کا خرچ کیوں کر چلائیں۔ ہمارا یہ حال کہ صبح سے روزگار کی تلاش میں نکلتے ہیں تو شام کو واپس آتے ہیں۔ مگر بجنسہ اس طرح جس طرح گئے تھے۔ اِدھر گھر والوں کا یہ حال کہ ہر ایک کی ضروریات ہم سے وابستہ ہیں۔ اور ہر ایک کی دعائیں ہمارے ساتھ مگر وقت تو ایسا پڑا ہے کہ ہر دعا بد دعا ہو کر لگتی ہے اور ہر کوشش مایوسی

اور ناکامی پر ختم ہوتی ہے۔

سرکاری ملازمت کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد پرائیوٹ ملازمت کی فکر پیدا ہوئی۔ اور اس سلسلہ میں خدا کا شکر ہے کہ ہم کو زیادہ دوڑ دھوپ کرنا نہ پڑی بلکہ فوراً ہی ایک تعلقہ دار صاحب کی ریاست میں منیجری کے عہدہ پر فائز ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک چھوٹا سا تعلقہ تھا مگر نام تو تھا ریاست کی منیجری کا۔ لہٰذا ہم بے حد خوش تھے کہ اس ملازمت پر قدم جما کر ترقی کی منزلیں طے کریں گے۔ اور تعلقہ دار صاحب کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ قابل منیجر بھی کیا چیز ہوتا ہے۔ ان کی ریاست بہت زیادہ مقروض تھی۔ اس حد تک مقروض کہ خود ہم کو یہ اندیشہ تھا کہ شاید تنخواہ ماری جائے۔ مگر اس ملازمت کو غنیمت اس لیے سمجھ رہے تھے کہ بے روزگاری کے طعنوں سے نجات مل جائے گی۔ اور اگر تنخواہ نہ بھی ملی تو واجب الادا کہلائے گی۔ اس کے علاوہ کچھ نہ کچھ تو ملتا ہی رہے گا۔ جو اس موجودہ کچھ بھی نہیں سے بہرحال بہتر ہوگا۔ یقین جانیے کہ جس وقت ہم نے اپنی ملازمت کا مژدہ گھر والوں کو سنایا ہے سب کی باچھیں کھل گئیں۔ کسی نے شکرانہ کی نماز ادا کی تو کسی نے ہماری بلائیں لینا اور ہم کو دعائیں دینا شروع کر دیں۔ گویا سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا اور واقعی خوشی کا مقام بھی تھا کہ تین سال کی مسلسل امیدواری اور ہر امیدواری میں ناکامی کے بعد یہ صورت نظر آئی تھی۔ چنانچہ دوسرے دن جب ہم اپنے عہدہ کا چارج لینے کے لیے چلے تو پانوں کی ڈبیہ بھی تیار تھی۔ نیا بٹوا بھی بھر دیا گیا تھا۔ اور بالکل ایسے انتظامات تھے کہ گویا ہم لام پر جا رہے ہیں۔ امام ضامن کی ضامنی۔ مبارک سلامت کے نعروں اور دہی مچھلی کے شگون کے ساتھ ہم گھر سے روانہ ہوئے راجہ صاحب کی کوٹھی کی طرف۔ اب ذرا ملاحظہ ہو ہماری سبز قدمی کہ راجہ صاحب کی کوٹھی میں پہونچے تو معلوم ہوا کہ کسی ماتم کدہ میں داخل ہوئے ہیں۔ ہر طرف غمناک سناٹا در و دیوار پر

یاس برس رہی ہے۔اور ہر ایک گردن لٹکائے ہوئے تصویرِ حسرت نظر آرہا ہے۔ ہم نے اپنے دل میں کہا الٰہی خیر۔ معلوم نہیں یہاں کیا سانحہ ہوا ہے اب کسی سے پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی کہ خدا جانے کیا خبرِ وحشت اثر سننے میں آئے۔ آخر کا پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے راجہ صاحب کی بیٹھک میں جو پہونچے تو وہ بھی داغ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی خاموش شمع کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ خیر اس طرف سے تو اطمینان ہوگیا کہ خود راجہ صاحب بفضلہٖ اچھے ہیں۔ مگر سانحہ یقیناً ایسا سخت تھا کہ خود راجہ صاحب پر بھی اس کا بے حد اثر معلوم ہوتا تھا۔ خود راجہ صاحب شدتِ غم سے گم سم نظر آرہے تھے۔ آخر کار ہم نے خود ہی اپنے ایک ہم نشین سے چپکے سے پوچھا۔

""آخر واقعہ کیا ہے؟""

ہم نشین نے چپکے سے جواب دیا۔ "علاقہ کورٹ ہوگیا۔"

ہم نے بے ساختگی کے ساتھ کہا۔ ''کورٹ۔''

ہم نشین نے کہا۔ ''ہاں ابھی تار آیا ہے۔''

یقین جانئے کہ دل کی حرکت نے بند ہونے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ فوراً یہ ضرب المثل ذہن میں آگئی کہ ''جہاں جائے بھوکا وہاں پڑے سوکھا۔'' راجہ صاحب کو یقیناً اپنے علاقہ کے کورٹ ہونے کا بس اسی قدر صدمہ ہوگا۔ جس قدر اس وقت ہم کو اپنی اس ملی ملائی ملازمت کے اس طرح جانے کا صدمہ تھا۔ دل بیٹھا جاتا تھا اور آنکھیں رونے کے لیے بیقرار تھیں۔ پھر بھی ایک آدھ سرد آہ اگر سرزد ہوگئی ہو تو کوئی تعجب نہیں اور اس کو راجہ صاحب کی ہمدردی میں شامل کر لیا گیا ہوگا۔ ہم تھوڑی دیر راجہ صاحب کے پاس بیٹھے رہے۔ اس کے بعد جب راجہ صاحب تخلیہ میں تشریف لے گئے تو ہم نے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا شروع کر دیا کہ آخر اب ہم کہاں جائیں۔ میز پر رکھا ہوا اخبار یوں ہی اٹھا لیا مگر یہ بھی عجیب اتفاق کہ اس میں

سب سے پہلے ''ضرورت ہے'' کے عنوان پر نظر پڑی۔ حالانکہ وہ اشتہار ہمارے متعلق نہ تھا۔ بلکہ مشتہر کو ضرورت تھی ایک ایسی لڑکی کی جو حسین و جمیل، سگھڑ اور شریف خاندان ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ اشتہار ہمارے کام کا نہ تھا مگر اس کے نیچے ہی ایک دوسرا اشتہار تھا۔ جس میں ضرورت تھی ایک ایسے تجربہ کار اسسٹنٹ ایڈیٹر کی جو ترجمہ میں مہارت رکھتا ہو۔ اور جس کو قلم برداشتہ سیاسی شذرات لکھنے کی مشق ہو۔ یہ اشتہار ہمارے شہر ہی کے ایک روزنامہ کی طرف سے دیا گیا تھا۔ لہٰذا ہم اخبار لیے ہوئے راجہ صاحب کی کوٹھی سے سیدھے اس اخبار کے دفتر کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس لیے کہ دراصل اس وقت گھر جانا ہمارے لیے دشوار بھی تھا۔ اور گھر والوں کے لیے خطرناک بھی کہ جس وقت ہم اپنی ناکامی کا روح فرسا واقعہ سنائیں گے اس وقت خدا جانے کس کس کے قلب کی حرکت بند ہو جائے اور شدتِ غم سے خدا جانے کس کا کیا حال ہو۔ یہ تو ہو سکتا تھا کہ ہم گھر پر جا کر یہ کہہ دیں کہ راجہ صاحب کی ریاست کے منیجر نہیں بلکہ ایک اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوگئے ہیں مگر ایک سرے سے کچھ نہیں کی خبر سننے کا گھر میں اب کوئی بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بہرصورت ہم جس وقت اخبار کے دفتر میں پہونچے ہیں۔ وہاں نہایت انہماک کے ساتھ اخبار کی ترتیب کا کام جاری تھا۔ ہم نے چیف ایڈیٹر صاحب کو اطلاع کرائی۔ اور فوراً ہم کو باریابی کی اجازت مل گئی۔ یہ حضرت عمر خیام کے قریبی بزرگوں میں سے معلوم ہوتے تھے۔ بالکل سفید داڑھی، موٹے موٹے تالوں کی عینک لگائے اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ گویا آپ فادر کرمس کے بڑے بھائی ہیں اور حضرت نوحؑ کی کشتی میں سوار ہونا بھول گئے تھے۔ لہٰذا اسی کمرے میں بیٹھے رہ گئے ہیں۔ ہم کو دیکھتے ہی آپ نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر فرمایا۔

''کیسے زحمت فرمائی؟''

ہم دراصل اس وقت بے حد مرعوب ہو رہے تھے۔لہٰذا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔البتہ اخبار اٹھا کر ان کو دکھا دیا۔اور صرف یہ کہہ سکے کہ۔''یہ آپ کا اخبار ہے آج ہی کی تاریخ کا۔''

ایڈیٹر صاحب نے کہا۔''جی ہاں۔اس سے آپ کا مقصد۔''

اب ہم خود سمجھ گئے کہ ہم نے کس قدر نامعقول بات کہی تھی۔لہٰذا ذرا معقولیت کے ساتھ کہا۔''اس میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت کا ایک اشتہار شائع ہوا ہے۔''

ایڈیٹر صاحب نے اپنی عینک سے اپنی نگاہیں ہماری طرف جماتے ہوئے کہا۔''آپ اس جگہ کے امیدوار ہیں۔''

ہم نے کہا۔''جی ہاں۔''

ایڈیٹر صاحب نے ہم کو گھورتے ہوئے کہا۔''آپ ترجمہ کر سکتے ہیں؟''

ہم نے کہا۔''جی ہاں۔''

ایڈیٹر صاحب نے ایسوسی ایٹڈ پریس کا ایک تار دیتے ہوئے کہا۔''اس کا ترجمہ فوراً کر دیجیے۔''

ہم نے اس تار کو لے کر دیکھا۔اور پھر غور سے دیکھا مگر صرف اسی قدر سمجھ سکے کہ انگریزی رسم الخط میں خدا جانے کون سی زبان لکھی ہوئی ہے۔تاہم قلم لے کر ترجمہ کی کوشش شروع کر دی۔اور عین اس وقت جب کہ ایڈیٹر صاحب نے اپنی گرج دار آواز میں کہا کہ۔''کر چکے آپ ترجمہ۔''

ہم نے نصف سے زیادہ ترجمہ ایڈیٹر صاحب کے حوالہ کر دیا۔ایڈیٹر صاحب نے ترجمہ کی شاید ایک ہی سطر پڑھی ہوگی۔کہ بڑی زور سے ڈونک کر پوچھا۔''یہ آپ نے ٹھہرو۔ٹھہرو۔بار بار کیا لکھا ہے؟''

ہم نے تار دکھاتے ہوئے کہا۔''یہ میں خود نہیں سمجھا کہ اس میں جابجا اسٹاپ۔اسٹاپ۔کیا لکھا ہوا ہے۔''

ایڈیٹر صاحب نے مسکرا کر ترجمہ رکھتے ہوئے کہا۔''آپ نے کبھی کسی اخبار میں کام نہیں کیا ہے۔''

ہم نے کہا۔''جی نہیں۔''

ایڈیٹر صاحب نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔''تو پھر آپ کے لیے صرف ایک صورت یہ ہے کہ آپ امیدوار کی حیثیت سے بلا تنخواہ کام سیکھیں۔اگر آپ کار آمد ہو سکے اور جگہ خالی رہی تو آپ کو مل جائے گی۔''

ایڈیٹر صاحب کے اس جواب پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔بشرطیکہ غور کرنے کی مہلت بھی دی جاتی۔بہرصورت اس وقت ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ رضامند ہو جائیں۔چنانچہ ہم کو امیدوار مترجم کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔مگر اب سوال یہ تھا کہ آخر ہم گھر پر جا کر کیا کہیں۔اخبار کے دفتر میں ملازمت تک تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا مگر یہ سمجھانا کوئی آسان بات نہ تھی کہ فی الحال تنخواہ کچھ نہ ملے گی۔اس لیے کہ گھر والوں کو تو ضرورت تنخواہ کی تھی ملازمت کی نہیں۔وہ اس کو تو گوارا کر سکتے تھے کہ فی الحال تنخواہ ملے۔خواہ ملازمت بعد میں ملتی رہے مگر یہ صورت ان کو منظور نہیں ہو سکتی تھی۔کہ ملازمت مل گئی ہے۔مگر فی الحال تنخواہ نہ ملے گی۔بہرصورت گھر جانے کا ایک بہانہ مل گیا تھا۔لہٰذا ہم گھر پہونچے اور قبل اس کے راجہ صاحب کے یہاں کی ناکامی کا افسانہ سنائیں اخبار کی ملازمت کا حال سب سے پہلے سنایا۔اس کے بعد راجہ صاحب کے یہاں کی ناکامی کا قصہ گوش گذار کیا۔اور سب کے آخر میں یہ بھی دبی زبان سے کہہ دیا کہ ابھی تنخواہ طے نہیں ہوئی ہے۔کام دیکھنے کے بعد طے ہوگی۔بس یہ سمجھ لیجیے کہ یہ سنتے ہی سب کو گویا سانپ سونگھ گیا۔اور سب کے چہروں پر مردنی

چھا گئی۔مگر مردنی چھائے یا کچھ ہو سوال تو یہ ہے کہ آخر ہم کیا کریں۔زیادہ سے زیادہ یہی کہ روز اخبار کے دفتر میں ترجمہ کرنے جاتے ہیں۔اور وہاں وقت نکال کر تمام اخبارات میں ''ضرورت ہے'' کے تمام اشتہارات بلا ناغہ پڑھ جاتے ہیں۔اور ہر جگہ کے لیے ایک ایک درخواست روانہ کر دیتے ہیں۔اس کے بعد بھی نوکری نہ ملے تو یہ ہمارا مقدر۔

سفر

(میر صاحب کے یہاں ایک ہنگامہ برپا ہے۔کوئی لوٹے کے لیے چیخ رہا ہے تو کوئی سلیپر کے لیے، کسی کو بستر بند کی فکر ہے تو کوئی ناشتہ دان مانگ رہا ہے اور خود میر صاحب اپنے مصاحب نما احباب میں بیٹھے ہوئے اپنے اس سفر کے متعلق تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔)

میر صاحب : ''اماں تم ہی بتاؤ مرزا صاحب کہ اس ریل کے سفر میں کچھ نصیب دشمناں جان جوکھم تو نہیں ہے۔''

مرزا صاحب : ''آپ کی بھی واللہ ہے کہ کیا باتیں ہیں یعنی میں کہہ تو رہا ہوں کہ اسی ریل کے سفر میں سر کے بال سفید کر لیے ہیں پھر آپ کا یہ سفر تو ذرا پھیکا ہے۔دو اسٹیشن بیچ میں تیسرے پر اصل خیر سے آپ اتر پڑیں گے۔''

میر صاحب : ''انشاء اللہ۔مگر بھائی بات یہ ہے کہ پہلا اتفاق ہے اسی لیے جی گھبراتا ہے۔اماں تم بھی چلنا ساتھ،تم کو ذرا اس سفر کا تجربہ ہے اور میں بالکل نیا آدمی۔تمہارے سر عزیز کی قسم کلیجہ ہاتھوں اچھلتا ہے۔''

مرزا صاحب : ''اگر آپ کہتے ہیں تو مجھ کو کیا عذر ہو سکتا ہے۔مگر آپ نے تو واللہ ہے کہ کمال کر دیا۔اس زمانہ میں آپ کے ایسے بہت کم نکلیں گے جو

ریل کے سفر سے ناواقف ہوں۔

میر صاحب : بھئی یقین مانو کہ میں خاندانی وضعداری کے خلاف یہ بات کر رہا ہوں۔ اللہ جنت نصیب کرے ابا جان مرحوم تو اس محلّہ کے باہر کبھی نہ نکلے تھے اور خدا بخشے دادا جان مرحوم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کبھی اپنے گھر سے باہر نہیں نکلے۔ ایک میں ہوں کہ دیس چھوڑ کر پردیس کی ٹھانی ہے۔''

مرزا صاحب : ''لیجئے لیجئے شیخ صاحب بھی تشریف لے لائے۔''

شیخ صاحب : ''آداب بجا لاتا ہوں حضور والا۔''

میر صاحب : ''تسلیمات عرض ہے بھائی صاحب خوب تشریف لے آئے۔''

شیخ صاحب : ''جی ہاں ابھی سنا تھا کہ سواری کہیں سیر و سیاحت کو جا رہی ہے۔''

میر صاحب : ''لو اور سنو یہ سیر و سیاحت ہے کہ آدمی دیس چھوڑ کر پردیس کا ہو جائے۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں جائداد کا مقدمہ ہے نہیں جاتا ہوں تو خاندانی جائداد جاتی ہے ورنہ بھائی تم جانتے ہو کہ ہمارے خاندان کو سفر سے کیا علاقہ ہے۔''

شیخ صاحب : ''بجا فرماتے ہیں جناب بیشک تشریف لے جانا ضروری ہے۔''

مرزا صاحب : ''بھائی صاحب ہمارے میر صاحب ریل کے سفر سے سخت پریشان ہیں آپ ہی کچھ سمجھائیے۔''

میر صاحب : ''میں پریشان نہیں ہوں البتہ پہلا اتفاق ہے اور سواری بھی وہ ایسی جس کے نہ لگام نہ جس پر چابک کا زور اور سنا ہے کہ پھر بھی وہ ہوا سے باتیں کرتی ہے۔''

شیخ صاحب : ''اے جناب اس میں ذرا بھی تشویش کی بات نہیں۔ میں خود برابر

سفر کرتا رہتا ہوں نہایت آرام کی سواری ہے۔''

مرزا صاحب : ''میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا مگر آپ کو اطمینان نہیں ہوتا اور مجھ کو بھی ساتھ لیے جاتے ہیں۔''

میر صاحب : ''تو کیا شیخ صاحب قبلہ کو میں چھوڑ دوں گا۔''

شیخ صاحب : ''نہیں حضت میں تو معافی چاہوں گا آج کل گھر میں ذرا علیل ہیں اور خود مجھکو بھی صبح چھینکیں آ رہی تھیں۔''

میر صاحب : ''یہ تو واللہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم پردیس کو سدھاریں ہمارے احباب دیس میں رہیں۔ آپ کو تو میں چھوڑ ہی نہیں سکتا۔''

مرزا صاحب : ''بھائی صاحب آپ نے تو کبھی میر صاحب قبلہ کی کسی بات میں کوئی عذر نہیں کیا ہے۔''

شیخ صاحب : ''میں اور عذر کروں۔ استغفر اللہ! میں تو صرف اجازت چاہتا تھا وہ بھی اگر منظور نہیں ہے تو جو حکم ہو بندہ حاضر ہے۔''

میر صاحب : ''بس تو بھائی صاحب آپ فوراً گھر تشریف لے جا کر اُلٹے پیروں واپس آ جائیے۔ اس لیے کہ اب وقت بہت کم ہے۔''

شیخ صاحب : ''گاڑی تو چار بجے جاتی ہے اور ابھی ایک ہی تو بجا ہے۔''

میر صاحب : ''یہ درست ہے مگر کیا اعتبار اس بے لگام گھوڑے کی گاڑی کا اور جو پہلے ہی چل دے۔''

مرزا صاحب : ''جی نہیں ایسا نہیں ہو سکتا مگر ہاں احتیاط اچھی چیز ہے۔ اگر گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے اسٹیشن پہونچ جائیں تو اچھا ہے۔''

شیخ صاحب : ''میں اجازت چاہتا ہوں ابھی حاضر ہوا۔''

میر صاحب : ''بسم اللہ۔ مگر چشم براہ ہوں۔''

شیخ صاحب : "(جاتے ہوئے) میں ابھی حاضر ہوا بس گیا اور آیا۔"

(دولت (ملازم) آتا ہے سامان کے متعلق میر صاحب سے دریافت کرتا ہے)

دولت : "سرکار بستر میں تکیے، تکلیاں، توشک، چادر، شال، پلنگ پوش رکھ دیا ہے اور کچھ تو نہ رکھا جائے گا۔"

میر صاحب : "اور لحاف ----"

مرزا صاحب : "ایں یعنی اس گرمی میں لحاف بھی لے جایئے گا۔"

میر صاحب : "بھائی پردیس کا معاملہ ہے معلوم نہیں وہاں کا موسم کیسا ہو۔"

مرزا صاحب : "چار قدم پر وہ جگہ ہے جہاں آپ تشریف لیے جا رہے ہیں۔ وہاں کا موسم وہی ہے جو یہاں کا۔"

میر صاحب : "پھر بھی اگر لحاف رکھ لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے اور وہاں مچھردانی بھی بستر ہی میں رکھ دینا۔"

دولت : "سرکار مچھردانی کے بانس بھی۔"

میر صاحب : "بانس ہیں تو ضروری مگر کیوں بھئی مرزا صاحب بانسوں میں ذرا طوالت ہے۔"

مرزا صاحب : "جی بانس وانس نہیں جو دیکھے گا ہنسے گا۔"

میر صاحب : "اچھا بانس نہ رکھو مگر ایک آدھ قالین اور ایک آدھ گاؤ تکیہ کہیں علیحدہ ضرور باندھ دینا۔"

مرزا صاحب : "یہ سب کیا ہوگا۔"

میر صاحب : "یعنی وہاں کیا بیٹھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔"

مرزا صاحب : "دن بھر کا قیام ہے اور ایک رات گزار کر واپسی کا ارادہ اس کے لیے یہ سب جھگڑا۔"

میر صاحب : "تو آخر بے سروسامانی کے سفر سے کیا حاصل۔"

مرزا صاحب : "بہتر ہے اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو مناسب ہے۔"

دولت : "سرکار اور کوئی چیز۔"

میر صاحب : "کپڑوں کے دونوں بکس، لوٹے، طشت، بیسن، صابن دانی، منجن دان، چاء کے لیے پتیلی، انگیٹھی، کوئلوں کا تھیلہ، چائے کے سب برتن وغیرہ رکھ لیے ہیں۔"

مرزا صاحب : "خدا کی پناہ آخر اتنا سامان۔"

میر صاحب : "بھائی پردیس کا معاملہ ہے کیا گھر سے یوں ہی چل دیا جائے۔"

(ملازمہ رونق کشتی لیے ہوئے داخل ہوتی ہے)

رونق : "اللہ سلامتی رکھے ----"

میر صاحب : "اری نیک بخت یہ کشتی میں کیا لائی ہے۔"

رونق : "قربان جاؤں سرکار۔ یہ بڑی بیگم کے یہاں سے گلوریاں، پھول اور امام ضامن آیا ہے۔"

میر صاحب : "اچھا۔ اچھا۔ رکھواسے اور بڑی بیگم کو سلام کہلا دو۔"

رونق : "سرکار ابھی تو اور کشتیاں بھی ہیں۔"

میر صاحب : "یعنی اور ہیں ابھی۔"

رونق : "جی ہاں سرکار اللہ رکھے سردار دلہن، بہو بیگم، شمشاد محل، نور محل، قمر دلہن سب ہی نے تو امام ضامن بھیجے ہیں۔"

میر صاحب : "خوب۔ خوب۔ لاؤ بھئی وہ کشتیاں بھی لاؤ۔"

رونق : "اور اللہ سلامتی رکھے بہو بیگم اور قمر دلہن نے ناشتہ بھی بھیجا ہے۔"

میر صاحب : "اس تکلف کی آخر کیا ضرورت تھی خیر ناشتہ تو دولت کو دیدے اور

کشتیاں یہاں لے آ۔"

رونق : "اور سرکار بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ ذری محل میں بھی تشریف لے آئیں۔"

میر صاحب : "اچھا تو چل میں آتا ہوں۔ کیوں بھئی مرزا صاحب تو میں ہو آؤں ذرا محل میں۔"

مرزا صاحب : "بسم اللہ۔ ضرور تشریف لے جائیں اور میرا آداب بھی عرض کر دیں بیگم سے، اور صاحبزادی صاحبہ کو دعا۔"

(میر صاحب گھر کے اندر تشریف لے جاتے ہیں)

بیگم : "اے میں کہتی ہو کہ سدھارنے کا وقت آ گیا ہے اور باہر سے آنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔"

میر صاحب : "نہیں تو بیگم میں تو بس آ ہی رہا تھا باہر مرزا صاحب اور شیخ صاحب کو ساتھ لے جانے کے لیے تیار کر رہا تھا۔"

بیگم : "تو وہ تیار ہو گئے۔ چلو اچھا ہوا دل بھی بہلے گا۔ اور اکیلے بھی نہ رہو گے۔"

میر صاحب : "ہاں صاحب بڑا اطمینان ہو گیا۔ پردیس کا معاملہ ہے ایک سے دو بھلے۔"

بیگم : "مگر میرا جی لگا رہے گا۔ جاتے ہی خط ڈال دینا۔"

میر صاحب : "بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔"

بیگم : "اچھا جیسے آج اصل خیر سے گئے تو کب پہونچو گے؟"

میر صاحب : "آج ہی بس دو بجے تک۔"

بیگم : "چلو ہٹو۔ چلے ہیں مجھ سے مذاق کرنے۔ چالیس کوس کا سفر ہے

اور آج ہی پہونچ جائیں گے۔"

میر صاحب : "تمھارے سر کی قسم بیگم بس دو گھنٹہ بلکہ اس سے بھی کم میں پہونچ جائیں گے۔"

بیگم : "آخر اتنا تیز جانے کی کیا ضرورت ہے کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر آدمی جائے۔"

میر صاحب : "بھئی تو اس کو میں کیا کروں ریل ایسی ہی تیز چلتی ہے۔"

بیگم : "اے ہے۔ مجھے تو ہول ہو جائے۔"

(باہر سے شیخ صاحب آواز دیتے ہیں۔)

"جناب میر صاحب قبلہ اب ذرا جلدی کیجئے وقت قریب ہے۔"

میر صاحب : "بہت بہتر ہے میں تو بس آپ ہی کا منتظر تھا ابھی آیا۔"

بیگم : "اے تو لاؤ میں امام ضامن باندھ دوں اور ذرا سا دہی چکھ لو۔ اللہ اصل خیر سے واپس لائے۔"

صاحبزادی : "ابا جانی۔ دہی مچھلی۔"

رونق : "سرکار دہی مچھلی۔"

بیگم : "رونق ذری کشتیاں اٹھا میں امام ضامن باندھ دوں۔"

میر صاحب : "ہاں ذرا جلدی کرو وقت بہت کم ہے۔"

بیگم : "اے ایسی بھی کیا جلدی کہ ہاتھ پیر پھول جائیں۔ تم ہی تو باہر بیٹھے رہے۔"

رونق : "لیجئے سرکار یہ بڑی بیگم کے یہاں کی کشتی ہے۔"

بیگم : "پہلے ہار اٹھاؤ۔"

رونق : "لیجئے۔"
بیگم : "بسم اللہ۔ لاؤ امام ضامن بھی باندھ دوں۔"
رونق : "لیجئے سرکار۔"
بیگم : "امام ضامن کی ضامنی۔"
میر صاحب : "اور بھی سب جلدی جلدی باندھ دو۔ دیر ہو رہی ہے۔"
بیگم : "پھر تم نے ہاتھ پیر پھلائے۔ رونق اور کشتیاں جلدی جلدی اٹھا۔"
رونق : "لیجئے لیجئے۔ لیجئے۔"
بیگم : "بسم اللہ! اے ہے یہ بہو بیگم کا کار چوب والا امام ضامن کیسا پیارا پیارا ہے۔"
رونق : "سرکار یہ شمشاد محل کے یہاں کا ہار دیکھئے گوٹے کا ہے اور امام ضامن بھی اچھا ہے۔"
بیگم : "سردار دلہن کو تو دیکھو یہ کیلا سلک کا امام ضامن بھیجا ہے اور ہے کیا اس میں، پیسہ بندھا ہے؟"
رونق : "نہیں سرکار اشرفی ہے یا شاید اٹھنی ہو۔"
بیگم : "ہاں یہ ہے امام ضامن سردار دلہن دیکھیں تو دیکھتی رہ جائیں۔ کیا کہنا ہے قمر دلہن کا۔"
میر صاحب : "بس صاحب ہو گئے سب امام ضامن؟"
بیگم : "اے میرا امام ضامن تو بندھوا لو۔"
میر صاحب : "ہاں صاحب وہ سب سے زیادہ ضروری ہے اور ہاں بیگم ایک ایک امام ضامن مرزا صاحب اور شیخ صاحب کو بھی بھیج دو۔"
بیگم : "اب چلے یہ چونچلے لے کے میں اب کہاں سے لاؤں امام

ضامن۔"
میر صاحب : "ارے صاحب کسی کپڑے میں ایک ایک روپیہ باندھ دو بس۔"
بیگم : "اچھا تو باہر چلو میں بھیجتی ہوں۔"
میر صاحب : "اچھا خدا حافظ۔"
بیگم : "جاؤ اللہ کی امان امام ضامن کی ضامنی دہی مچھلی۔"
رونق : "میاں دہی مچھلی۔"
صاحبزادی : "میاں دہی مچھلی۔"

(میر صاحب گھر کے باہر آتے ہیں)

شیخ صاحب : "خیر خدا خدا کر کے آپ نکلے تو گھر کے باہر۔"
مرزا صاحب : "اور ذرا شان تو دیکھئے معلوم ہوتا ہے دولھا میاں آ رہے ہیں۔"
شیخ صاحب : "خیر دولھا میاں نہ سہی مگر حاجی صاحب تو ضرور معلوم ہوتے ہیں ان ہاروں اور امام ضامنوں میں۔"
میر صاحب : "بھئی کیا بتاؤں عورتیں جو چاہیں بنا دیں۔"
شیخ صاحب : "اچھا تو اب بگھی منگوایئے نا۔ ایک گھنٹہ باقی رہ گیا ہے۔"
میر صاحب : "دولت سب سامان تیار ہے؟"
دولت : "جی ہاں سرکار سب سامان تیار ہے۔ کل تیس عدد ہیں۔"
میر صاحب : "تاش کی گڈی، چوسر، شطرنج یہ سب رکھ لیا ہے؟"
دولت : "جی ہاں سرکار یہ سب چیزیں ہیں مگر سرکار......"
میر صاحب : "مگر کیا کچھ بھول گئے۔ تمہارے دماغ میں تو بھونسہ بھرا ہے۔"
دولت : "میں نے کہا سرکار کی بیڑیں حضور کو یاد کریں گی۔"

میر صاحب : ''بیٹریں، خوب یاد دلایا بھئی ان کے کا بک ساتھ لے لو ورنہ وہ واقعی بھڑک جائیں گی۔''

-x-x-

دولت : ''تو اب تینتیس عدد ہوئے۔''

میر صاحب : ''کوئی پروا نہیں تم اب دو بگھیاں فوراً لے آؤ۔''

(رونق گھر سے آتی ہے۔)

رونق : ''سرکار بیگم صاحبہ نے مرزا صاحب اور شیخ صاحب کے لیے یہ امام ضامن بھیجے ہیں اور یہ ہار اور کہا ہے کہ جب سے مٹھو بیٹے کو آپ کے سدھارنے کی خبر ہوئی ہے وہ برابر ٹیں ٹیں کر رہے ہیں۔''

میر صاحب : ''ارے بھئی یہ تو بڑی مصیبت ہے واقعی مٹھو بیٹے تو سخت پریشان کریں گے سب کو۔''

رونق : ''اے سرکار وہ تو ذرا دیر بھی اگر حضور کو نہ دیکھے تو آفت مچا دیتا ہے۔''

میر صاحب : ''کیا رائے ہے مرزا صاحب جہاں اتنا سامان ہوا ہے وہاں ایک پنجرہ اور سہی۔''

مرزا صاحب : ''جو رائے عالی ہو مگر اتنے سامان کا تو محصول پڑ جائے گا۔''

میر صاحب : ''بھئی تو تم ہی بتاؤ کون سی چیز ضرورت سے زیادہ ہے۔ بغیر پاندان کے کام نہیں چل سکتا بغیر ناشتہ دان کے کیسے چل سکتے ہیں۔ اور اسی طرح سب چیزیں ضروری ہیں۔''

شیخ صاحب : ''واللہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ولایت کا سفر ہے۔''

مرزا صاحب : ''ہاں اور کیا جتنے آدمی ولایت جاتے ہیں وہ سب طوطے کا پنجرہ اور

بیٹر کے کا بک لے جاتے ہیں۔''

میر صاحب : ''تو بھئی میں ان بے زبانوں کی جان تو لوں گا نہیں چاہے جو کچھ بھی ہو۔''

شیخ صاحب : ''نہیں صاحب ہرگز نہیں بہرحال اب سامان نکلوانا چاہیے بگھیاں آتی ہی ہوں گی۔''

میر صاحب : ''آپ کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے دولت آتا ہی ہوگا۔''

مرزا صاحب : ''اپنا کام کرنے میں بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ آپ ایک نے ہی کہی واللہ ہے کہ میں سامان نکالتا ہوں۔''

میر صاحب : ''اماں تمہیں میری قسم جو سامان اٹھاؤ۔ یہ بھی کوئی بات ہے

(دولت گاڑیاں لے کر آتا ہے)

دولت : ''سرکار بگھیاں حاضر ہیں ایک ایک روپیہ پر آئی ہیں۔''

میر صاحب : ''اچھا تو سامان رکھواؤ گاڑی پر اور دیکھو باہر کوئی عورت سامنے نہ آنے پائے اور نہ کوئی ایسا ویسا آدمی۔''

دولت : ''کیا مجال ہے سرکار میں راستہ بند کرائے دیتا ہوں۔''

میر صاحب : ''اچھا تو بھئی مرزا میں ایک مرتبہ ذرا پھر گھر میں ہو آؤں۔''

شیخ صاحب : ''بس تو پھر گاڑی مل چکی۔''

میر صاحب : ''اماں ابھی آیا میں بس سامان رکھا گیا کہ میں آ گیا۔''

مرزا صاحب : ''ہاں ہاں آپ ضرور ہو آئیں مگر ذرا جلدی کیجیے۔''

میر صاحب : ''بس میں ابھی آیا تم سامان رکھوا دو۔''

مرزا صاحب : ''دیکھو دولت کو چیز رہ نہ جائے۔''

دولت : ''کیا مجال ہے سرکار مگر ایک بگھی میں تو سب سامان ہی آئے گا۔''

مرزا صاحب : ''بس تو ایک میں ہم سب آجائیں گے۔''

شیخ صاحب : ''مگر یار طوطے کا پنجرہ اور بیٹروں کی کابک میر صاحب کے پاس ہی رکھنا۔''

مرزا صاحب : ''ہاں یہ بھی اچھی دل لگی رہے گی۔

(نواب صاحب گھر سے برآمد ہوتے ہیں۔)

نواب صاحب : ''لیجیے جناب میں آگیا۔''

مرزا صاحب : ''بس تو بسم اللہ کیجیے۔

(دولت کو یکایک چھینک آجاتی ہے۔''آچھیں''۔)

میر صاحب : ''لاحول ولاقوۃ۔آؤ بھئی مرزا ذرا بیٹھ جاؤ شگون خراب ہوگیا۔ایک ایک پان کھالو پھر چلیں گے۔اس بدتمیز کو دیکھو کہ اسی وقت بدشگونی سوجھی تھی۔''

شیخ صاحب : ''اچھا خیر ہوگا بھی ایک ایک پان کھا لیجیے۔''

مرزا صاحب : ''لیجیے مہترانی بھی آگئی۔''

مہترانی : ''اللہ سلامتی رکھے۔ڈیوڑھی آباد۔''

دولت : ''ہٹ ہٹ سامنے سے ہٹ۔سرکار سدھار رہے ہیں۔''

میر صاحب : ''خیر یہ بھی اچھا ہی ہوا بہر حال اب پان کھا کر چلتے ہیں۔''

دولت : سرکار پان حاضر ہیں۔''

میر صاحب : ''لو بھئی میرزا صاحب اب اٹھو۔''

شیخ صاحب : ''بسم اللہ۔''

مرزا صاحب : ''الا اللہ۔''

میر صاحب : ''چل دولت باہر سب کو ہٹا دے۔''

دولت : ''حضور باہر کوئی نہیں ہے تشریف لے چلیں۔''

(یکایک بلی کی آواز آتی ہے۔)

میر صاحب : ''ہا کمبخت راستہ کاٹ گئی۔''

مرزا صاحب : ''یہ تو بہت برا ہوا کہ بلی راستہ کاٹ گئی۔''

میر صاحب : ''لوٹ آؤ بھائی شیخ صاحب یہ شگون نہایت منحوس ہوتا ہے۔''

(اندر سے رونق آتی ہے۔)

رونق : ''سرکار بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں کہ بلی راستہ کاٹ گئی ہے اب میں ہرگز نہ جانے دوں گی۔

میر صاحب : ''ہے تو واقعی یہ برا مگر مقدمہ کا کیا ہوگا۔''

رونق : ''سرکار جائیداد آپ پر سے صدقے کی مگر جب نگئی راستہ کاٹ جائے تو جانا نہ چاہیے۔

میر صاحب : ''واقعی اب تو میرے قدم بھی نہیں اٹھتے۔''

شیخ صاحب : ''ھت یہ سب وہم ہیں بالکل عورتوں کی باتیں ہیں۔''

میر صاحب : ''ایں بھئی شیخ صاحب یہ کیا کہہ رہے ہو۔اماں یہ کہا کہہ رہے ہو یعنی بلی راستہ کاٹ جائے اور تم اس کو معمولی بات کہو۔''

مرزا صاحب : ''نہیں صاحب یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے ایسی حالت میں سفر ہرگز نہیں ہوسکتا۔''

میر صاحب : "بھائی شیخ صاحب میں تم سے سچ کہتا ہوں تمہارے سر عزیز کی قسم کہ ابا جانی مرحوم کے ایک دوست گھوڑے پر سوار تھے اور جنگل کا راستہ تھا۔ کہ بلی راستہ کاٹ گئی بس پھر کچھ نہ پوچھو کہ گھوڑے کا ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ اس نے ٹھوکر لی اور سوار سر کے بل گرا۔"

مرزا صاحب : "اے ہے۔ بڑی چوٹ آئی ہوگی جناب۔"

میر صاحب : "اماں چوٹ۔ یقین جانو کہ تمام پیشانی لہولہان ہوگئی۔"

شیخ صاحب : "اتفاقاً ہوگیا ایسا یہ کیا ضروری ہے کہ ہر مرتبہ ایسا ہی ہو۔"

رونق : "اے واہ میاں اللہ نہ کرے ایسا ہو۔ میرا تو سن کر ہی کلیجہ ڈھڑک رہا ہے۔"

میر صاحب : "بھئی شیخ صاحب بعض وقت تو تم نہایت ناسمجھی کی باتیں کرتے ہو۔ گویا یہ شگون اور بدشگونی کوئی چیز ہی نہیں۔"

شیخ صاحب : "صاحب میں تو ان باتوں کو مہمل سمجھتا ہوں۔"

مرزا صاحب : "بھائی صاحب یہ تو نہ کہیے۔ یہ کہیے کہ آپ کچھ نئی روشنی کے آدمی ہو کر رہ گئے ہیں۔"

میر صاحب : "اماں تمھیں میری قسم ذرا دیکھو تو شیخ صاحب کی ڈھٹائی کہ بلی راستہ کاٹ جائے اور یہ شیر ڈٹا رہے۔"

مرزا صاحب : خیر اب سفر تو میری ناچیز رائے میں مناسب نہیں ہے البتہ خیال ہے تو صرف یہ کہ مقدمہ کا کیا ہوگا۔

رونق : "اے میاں چولھے میں گیا مقدمہ۔ اللہ جان کی سلامتی رکھے تو ایسے ایسے سیکڑوں مقدمہ ہوں گے۔"

میر صاحب : "بھئی واللہ یہ بھی ایک ہی رہی۔ اماں سنتے ہو مرزا ان بی رونق کی

دعا کو ایسے ایسے سیکڑوں مقدمے میرے لیے مانگ رہی ہیں۔"

رونق : "اے تو قربان جاؤں مجھے کیا معلوم ....."

میر صاحب : "تو بھئی مرزا اب تم ہی بتاؤ کہ اس مقدمہ کا کیا کیا جائے۔"

مرزا صاحب : "حضت میری عقل خود حیران ہے۔"

(دولت ملازم آتا ہے۔)

دولت : "سرکار تو کیا سامان اتار لیا جائے؟"

میر صاحب : "سامان تو خیر ضرور اترے گا۔ خواہ مقدمہ رہے یا جائے۔"

دولت : "تو سرکار بگھی والوں کو تو کرایہ دینا ہی پڑے گا۔"

میر صاحب : "ہاں ہاں تو کس نے کہا ہے کہ نہ دو۔"

مرزا صاحب : "میری ناقص رائے میں تو حاکم کو تار دے دیا جائے۔"

میر صاحب : "آخر کیا تار دیا جائے۔"

شیخ صاحب : "یہی کہ بلی راستہ کاٹ گئی اور ملازم کو چھینک آگئی۔"

مرزا صاحب : "نہیں صاحب بس یہ تار دیدیا جائے کہ گاڑی چھوٹ گئی۔"

شیخ صاحب : "قبلۂ عالم یہ بھی خبر ہے کہ جہاں آپ کو جانا ہے وہاں دن بھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو ہر گھنٹہ پر گاڑی چھوٹتی ہے۔"

میر صاحب : "اماں تو کچھ اور سوچو۔"

شیخ صاحب : "آخر تو اس میں کیا مضائقہ ہے کہ آپ اب دوسری گاڑی سے چلیں۔"

میر صاحب : "بھائی اب بیگم صاحب ہرگز نہ جانے دیں گی۔"

شیخ صاحب : "تو یہ بھی سمجھ لیجیے کہ جائداد کا معاملہ ہے کہیں خدانخواستہ جائداد

کھٹائی میں نہ پڑ جائے۔"

(رونق ملازمہ آتی ہے۔)

رونق : "سرکار بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ اب کچھ ہی ہو جائے میں ہرگز نہ جانے دوں گی۔"

میر صاحب : "ارے صاحب تو میں کہاں جا رہا ہوں۔"

مرزا صاحب : "تو اب فرمائیے کہ کس مضمون کا تار دے دیا جائے۔"

میر صاحب : "میرے خیال میں تو بس یہی تار دیدو کہ مجبوراً سفر ملتوی کر دیا ہے۔"

شیخ صاحب : "جناب والا اس کا اثر مقدمہ پر کیا پڑے گا۔"

مرزا صاحب : "مگر بھائی مجبوری کی وجہ سے سفر ملتوی کیا ہے نا۔"

شیخ صاحب : "کیا مجبوری ہے؟ آخر یہی نا کہ چند وہم گھیرے ہوئے ہیں۔"

میر صاحب : "بھئی شیخ صاحب تم تو واللہ ہے کہ ان باتوں کو پھر وہم کہہ رہے ہو بس بلی راستہ کاٹ جائے اور وہم۔"

مرزا صاحب : "میں آپ سے عرض کروں کہ ہمارے بزرگ تو ان ہی خیالات کی وجہ سے سفر ہی کو مناسب نہ سمجھتے تھے۔

(دولت گھبرایا ہوا آتا ہے۔)

دولت : "سرکار۔ سرکار۔ غضب ہو گیا۔ ایک بگھی کا گھوڑا بگڑ کر بھاگا ہے مع تمام سامان کے اور بیٹروں کے کابک بھی اسی بگھی پر ہیں۔"

میر صاحب : الٰہی خیر۔ خدا میری بیٹروں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ ذرا دیکھو بھئی مرزا۔ اماں ذرا جاؤ شیخ صاحب۔"

رونق : "وہ تو موا شگون ہی خراب ہو گیا تھا۔ اس موئے نکٹے دولت کو بھی اسی

وقت چھینک آنا تھی۔"

دولت : "ذرا زبان سنبھالیے۔ نکٹا میں کیوں ہوتا جو کہے وہ خود اور اس کی سات پشت۔"

رونق : "دیکھیئے سرکار یہ موا میری پشتوں کو بھی منہ بھر بھر کے کہہ رہا ہے۔"

میر صاحب : "ارے صاحب یہ لڑائی کا وقت نہیں ہے۔ خدا کو یاد کرو میری بیٹریں اس وقت سخت مصیبت میں ہیں۔"

مرزا صاحب : "لیجیے حضت اپنی بیٹریں۔ میں نے جاتے ہی گھوڑے کو پکڑ لیا۔"

میر صاحب : "بھائی واللہ کمال کیا۔ اماں ذرا دیکھو تو بیٹروں کا دل کیسا دھڑک رہا ہے۔ مگر واللہ ہے کہ خدا نے ہم لوگوں کو کیسا بچایا۔"

شیخ صاحب : "صرف آپ کی صراحی گر کر ٹوٹی باقی سب خیریت ہے۔"

میر صاحب : "خیر بھائی صراحی گئی تو جائے سب کی جانوں کا صدقہ اترا۔"

مرزا صاحب : "ہاں صاحب۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔"

شیخ صاحب : "لاحول ولا قوۃ۔ کیا ہنگامہ ہوا ہے بیٹھے بٹھائے۔"

میر صاحب : "ایسا ویسا ہنگامہ۔ ذرا میرا کلیجہ تو دیکھو کہ اب تک بے قابو ہے۔ ذرا دولت شربت انار تیار کرو۔ اور بھئی مرزا ذرا میں محل میں ہو آؤں تا کہ بیگم کو اطمینان ہو۔"

مرزا صاحب : "تو ہم لوگ اجازت چاہتے ہیں۔"

میر صاحب : "اچھا بھئی خدا حافظ۔"

شیخ صاحب : "آداب بجالاتا ہوں۔"

مرزا صاحب : تسلیمات عرض کرتا ہوں۔"

پنشن

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ع

تقریب کچھ تو بہر خرافات چاہیے

چنانچہ آج بھی تقریب تو یہ ہے کہ خان صاحب بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی انسپکٹر دفاتر رجسٹریشن اپنی مدت ملازمت ختم کر کے پنشن پر تشریف لے جا رہے ہیں اور ان کو صاحب انسپکٹر جنرل بہادر کے دفتری عملہ نے الوداعی دعوت دی ہے۔ اب اس تقریب کے سلسلہ کی خرافات یہ ہے کہ اس خاکسار سے الوداعی نظم پڑھنے کی فرمائش کی گئی ہے۔ مگر چونکہ یہ خاکسار اس محکمہ رجسٹری کا رجسٹرڈ شاعر نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو اختیار ہے کہ نظم خواہ اشعار کی موزونیت کے ساتھ پڑھے یا نثر کی سپاٹ جذبات نگاری کے ساتھ۔

بہر حال امر واقعہ صرف یہ ہے کہ اس قسم کے مواقع پر نظم تو وہ پڑھ سکتا ہے جس کو زندگی بھر روزی اور موت دونوں سے بے فکر رہ کر صرف داد حاصل کرنے کی فکر رہتی ہے۔ مگر چونکہ اس خاکسار کے نزدیک اس قسم کی نظموں میں زندگی کے نکات و رموز۔ مستقبل کے نشیب و فراز۔ مدبرانہ مشورے۔ حکیمانہ پند و نصائح اور استادی کے دیگر گر نہیں سما سکتے۔ لہٰذا کیوں نہ اپنی مادری زبان میں انسانوں کی گفتگو کی جائے اور اپنے خیالات کو ردیف قافیہ کی مجبوریوں میں کیوں مبتلا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ

اگر اس موقع پر یہ خاکسار نظم کہتا تو زیادہ سے زیادہ اس نظم میں یہی ہوتا کہ آسمان پر کالی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ چڑیوں کے چہچہے خاموش ہیں بہار پر خزاں کا فالج نما حملہ ہوا ہے۔ گلستاں میں ویرانہ کا ویران منظر ہے۔ دنیا میں اندھیرا ہے اس لیے کہ خان صاحب چودھری سراج الحق آج ملازمانہ بندشوں سے آزاد ہو کر پنشن پر جا رہے ہیں۔ ایک دیرینہ رفیق چھوٹ رہا ہے۔ اس کے بعد اس نظم میں چودھری صاحب کے کچھ ایسے صفات بیان کیے جاتے جن سے شاعر اور شاعری کے شجرہ کے تمام مرحوم اور موجود بزرگ بلکہ شاعر کے فرشتے بھی ناواقف محض ہوتے۔ پھر اس نظم میں کچھ دعائیہ اشعار ہوتے اور اس کے بعد مقطع۔ گویا بحیثیت مجموعی یہ نظم کذب و افترا کا اور تصنع بلکہ منافقت کا ایک ایسا مجموعہ ہوتی کہ سننے والے بھی شاعر کو کذاب سمجھتے اور عاقبت میں اس افترا پردازی کی جواب دہی بھی کرنا پڑتی۔ لہٰذا سب سے بہتر اور محفوظ صورت یہی سمجھ میں آئی کہ ناموزونیت کے ساتھ محض سچ بولا جائے۔ تاکہ اپنے جذبات کا سلیس اُردو میں اظہار بھی ہو جائے اور کوئی گناہ بھی سرزد نہ ہو۔

اس مختصر تمہید کے بعد یہ خاکسار چودھری صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے پنشن کے فلسفہ پر اجمالی روشنی ڈالنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ ایک ملازم نما انسان یا انسان نما ملازم کی زندگی کا ایک اہم ترین انقلاب یہ پنشن ہی ہے۔ بلکہ مجھ کو کہنے دیجیے کہ جس طرح عام انسانوں کی زندگی تین حصوں میں تقسیم ہے یعنی بچپن جوانی اور بڑھاپا اسی طرح ایک ملازم انسان کی زندگی بھی تین حصوں میں تقسیم ہوتی ہے تعلیم یہ ملازم کا بچپن ہے۔ ملازمت یہ ملازم کی جوانی ہے اور پنشن یہ ملازم کا بڑھاپا ہے۔ ان باتوں کو چودھری صاحب موصوف خود بھی جانتے ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ ماشاءاللہ عاقل بالغ ہیں۔ عاقل تو خیر وہ ہمیشہ سے ہیں مگر ایک سرکاری ملازم پنشن لینے کے بعد بالغ بھی ہو جاتا ہے یا یہ کہیے کہ اس کو پنشن لینے کے بعد ہی اپنے بلوغ کا احساس

ہوتا ہے۔ بہرحال چودھری صاحب اب مسلم طور پر عاقل و بالغ ہیں۔ اور ان نکات کو وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ دراصل ایک ملازم کی زندگی کے یہ تینوں دور ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہوتے ہیں۔ دو دور تو چودھری صاحب دیکھ آئے، اب پنشن کے انقلاب کو دیکھنا باقی ہے اور اس انقلاب کے لیے وہ ہر طرح تیار ہیں۔

پنشن دراصل ایک انسان کے تمام ماحول کو $\frac{1}{2}$ بنادینے کا دوسرا نام ہے۔ ایک ملازم کا ماحول کیا ہے صرف اس کی تنخواہ اور واقعہ بھی ہے کہ ایک سرکاری ملازم کی دنیا جس محور پر رقص کرتی ہے وہ صرف تنخواہ ہے لیکن پنشن کے بعد جب تنخواہ ہی $\frac{1}{2}$ رہ جائے تو پنشنر خود اپنے کو بھی $\frac{1}{2}$ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اس کو اپنی زندگی کے $\frac{2}{2}$ حصہ کو $\frac{1}{2}$ کی مناسبت سے بسر کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال یہ چونکہ ریاضی کا مسئلہ ہے۔ لہٰذا اس کو اکاؤنٹنٹ صاحب پر چھوڑ کر مجھکو یہ عرض کرنے دیجیے کہ اب چودھری صاحب اپنی مسلّم دنیا کو چھوڑ کر اس ادھوری دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ جہاں ان کو اپنی ضروریات کو نصف بنانا ہے تاکہ پنشن کی آمدنی اور بڑھاپے کے خرچ کا توازن درست رہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایک پنشن یافتہ اپنے اخراجات کو اس حد تک نصف کرے کہ ایک ہی پائنچے کا پاجامہ پہننے لگے ایک ہی آستین کا کرتا پہنے ایک ہی جوتا خریدے ایک ہی آنکھ کی عینک لگائے۔ محض انٹرول تک سینما دیکھے۔ آدھی دور پیدل چلے اور آدھی دور تانگہ پر۔ دو کے بجائے صرف ایک روٹی کھائے اور نصف بہتر کی ہر فرمایشوں میں سے صرف ایک کو پورا کرے۔ بلکہ مصیبت تو یہ ہے کہ ان میں کوئی بات بھی نہ ہو اور خرچ آدھا ہو جائے یہ دراصل ایک ایسا معمہ ہے جس کو صرف وہی حل کرسکتا ہے جو پنشن پاکر اپنے فرصت کے اوقات میں دماغ سوزی سے کاٹے اور اس عقدہ کے حل کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ چودھری صاحب کے پاس اب وقت بھی ہے۔ اور فرصت بھی اور سوائے اس کے اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے

کہ سب سے پہلے اسی مسئلہ کو طے کیا جائے۔ یقین جانئے کہ چودھری صاحب دونوں پیروں میں جوتے پہنیں گے اور اس کو بھی پسند نہ کریں گے کہ پاجامہ کے بجائے نیکر استعمال کرنا شروع کریں۔ البتہ بچت کی صورتیں اور خرچ کا توازن اب اس طرح قائم ہوگا کہ چھ روپے کے جوتے کے بجائے اب تین روپے کے جوتے سے کام چل جائے گا۔ موزوں کے لیے یہ کوئی ضروری بات نہ ہوگی کہ وہ خاص مسٹر روزولٹ کے ہاتھ کے بنائے ہوئے ہوں۔ لباس بھی اسی طرح سادہ ہو جائے گا۔ اس لیے کہ بڑھاپے میں تکلفات کی آخر ضرورت ہی کیا ہے۔ نہ جوانی ہے نہ اب جوانی کی خودستائی اور خودنمائی اور غالباً اسی وجہ سے سرکاری نقطۂ نظر یہ قائم ہوگیا ہے کہ انسان کو اس زمانہ میں پوری تنخواہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ مگر یہ خاکسار جو بفضلہ بوڑھا تو نہیں ہے البتہ بڑھاپے کے غم میں دبلا ضرور ہے اس کلیہ اور اس نظریہ کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ جوانی کے اخراجات بڑھاپے سے دو چند اور بڑھاپے کے مصارف جوانی سے نصف ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بڑھاپے میں کریم، اسنو، عطر، پاؤڈر اور اسی قسم کی دوسری چمک دمک کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ انسان ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے مگر اس کے ساتھ بڑھاپے کے مزید اخراجات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ بڑھاپے میں جوانی کی تشکیل کے لیے انسان کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً خضاب کے اخراجات، دانتوں کی اکھڑوائی اور بنوائی، پیری اور صد عیب کے مصارف اور مختلف ادویات کے مصارف اور مختلف ادویات کی قیمتیں پھر ایک بات یہ بھی دیکھی گئی ہے کہ اسی زمانہ میں انسان کو خیرات کی بھی فکر ہوتی ہے اور وہ زندگی بھر کی کسر نکالنا چاہتا ہے۔ مختصر یہ کہ اگر کچھ مصارف کم ہو جاتے ہیں تو اس سے دو چند بڑھ جاتے ہیں اور یہ اخراجات ایسے ہوتے ہیں جو عمر کے ساتھ ہی ساتھ بڑھتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان اقتصادی نشیب و فراز کو چودھری

صاحب خود سمجھ سکتے ہیں۔اور وہ یقیناً اپنا توازن قائم رکھنے کی کوشش فرمائیں گے۔

پنشن کا دور اور بہت سی حیثیتوں سے بھی انقلابی ہوتا ہے مگر باقی انقلابات ایک حد تک خوش گوار کہے جا سکتے ہیں جن کا احساس چودھری صاحب کو اب ہوگا۔یقین جانیے کہ اب تک چودھری صاحب کی زندگی یہ رہی ہوگی کہ وہ ۲۴ گھنٹہ سے ۲۵ گھنٹے انسپکٹر دفاتر رجسٹریشن رہتے ہوں گے اور اپنی ذاتی شخصیت کو سمجھنے کا آپ کو کبھی موقع ہی نہ ملتا ہوگا۔سوتے میں خواب اسی انسپکٹری کے دیکھتے ہوں گے اور جاگتے میں اسی انسپکٹری کے پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کی دعائیں دل سے نکلتی ہوں گی۔آپ کے نزدیک جنت کا تخیل صرف یہ ہوگا کہ صاحب انسپکٹر جنرل بہادر آپ سے خوش ہیں اور آپ کی خدمت کو سراہتے ہیں اور عاقبت کا تخیل زیادہ سے زیادہ یہ کہ نیک نامی کے ساتھ پنشن مل جائے۔مگر اب پنشن حاصل کرنے کے بعد آپ کو انسپکٹری کے بجائے اپنی انسانی حیثیت پر غور کرنے کا موقع بھی ملے گا اور اس کا علم بھی ہوگا کہ عاقبت یہ نہیں بلکہ اس سے بھی آگے ایک دوسری منزل کا نام ہے۔

چنانچہ اب اس نصف تنخواہ کے زمانے میں تسبیح و جانماز، چٹائی، اور بدھنی کے مصارف کا بھی اضافہ ہوگا اور نماز کے ساتھ اور ادعیہ اور وظائف بھی شروع ہو جائیں گے۔اکثریت پانے والے بزرگ اپنی بیکاری سے گھبرا جاتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں۔کہ آخر کیا کریں۔مگر جو صاحبان ہوش ہیں اور جن کا دیدہ عبرت نگاہ چشم سے بے نیاز ہے یعنی جو گوش نصیحت نیوش کے بہرے نہیں وہ جانتے ہیں کہ ع

ٹک حرص وہوکو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا

کا مفہوم کیا ہے اور ع

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہوتا ہے۔لہٰذا وہ قضائے عمری میں اپنا وقت گذارتے ہیں

اور عبادت کی فراوانی فرصت کو محدود ثابت کر دیتی ہے۔

بہر حال ان تمام منازل سے چودھری صاحب کو بھی گذرنا ہے اور چودھری صاحب ہی پر کیا منحصر ہے ان کے وہ تمام میزبان جو آج عرضی فدوی ہیں کل پنشنر بننے والے ہیں ع

ازل سے سب ملازم گویا پنشن خوار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

چودھری صاحب کے جانے اور پنشن پانے کا غم وہ کرے جو آپ کا دشمن ہو، جس کو آپ کی یہ روحانی، جسمانی، دماغی اور ذہنی آزادی بری معلوم ہوتی ہو اور جو یہ نہ دیکھ سکتا ہو کہ ایک طائر آزاد اپنے سمیں قفس سے آزاد ہو کر فضا میں فراٹے کیوں بھر رہا ہے۔مگر کم سے کم یہ خاکسار تو چودھری صاحب کی ذاتی زندگی کا آغاز اسی لمحہ سے سمجھ رہا ہے اور ان کو مبارکباد دیتا ہے کہ وہ اپنی تمام ذمہ داریوں سے نیک نامی کے ساتھ سبکدوش ہوئے ہیں۔ان کے ماتحتوں کا جذبہ یہ ہے کہ آج سب باچشم نم ان سے رخصت ہو رہے ہیں اور ان کے افسران کا رویہ یہ ہے کہ خود صاحب انسپکٹر جنرل بہادر ان کو الوداع کہہ رہے ہیں۔گویا آج ماں باپ کی یہ دعا قبول ہوئی ہے کہ بڑھے ہو پروان چڑھو بڑھا ہونا تو سب سمجھ رہے ہیں اور سمجھنے سے زیادہ دیکھ رہے ہیں مگر یہ کسی کو نہیں معلوم کہ پروان چڑھنا دراصل پنشن پر جانے کو کہتے ہیں۔

اگر میں لیڈر ہوتا!

وہ تو کہیے کہ ہم تھوڑے سے شاعر اور تھوڑے سے ایڈیٹر ہو کر رہ گئے۔ ورنہ اگر کہیں لیڈر بن جاتے تو مزہ ہی آ جاتا۔ لیڈر بن جانے کے بعد عجیب زندگی ہوتی اور اس زندگی کو کچھ اس طرح بسر کرنا پڑتا کہ عجوبۂ روزگار بن کر رہ جاتے۔ دنیا کی نظریں ہمارے اوپر ہوتیں اور ہماری نظریں ان اخبارات پر جن میں ہماری تصویر اور ہمارے کارٹون چھپا کرتے۔ حالانکہ کارٹون کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اس لیے کہ لیڈر بن جانے کے بعد ہماری یہ تصویر بجائے خود کارٹون ہوتی۔ عجیب وغریب شکل وصورت کے ساتھ عجیب وغریب لباس میں جو تصویر ہو اسے ہم تصویر سے زیادہ کارٹون کہتے ہیں۔ اور ہمارے نزدیک کارٹون کی تو اب بھی یہی تعریف ہے کہ تصویر تو وہ ہے جو عجیب وغریب نہ معلوم ہو اور کارٹون اس تصویر کو کہتے ہیں جو عجیب وغریب معلوم ہو۔ اس کے علاوہ ہمارے خیال میں جو تصویر عجیب وغریب نظر نہ آئے وہ کسی لیڈر کی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ہماری ہر تصویر کارٹون ہوئی اور ہم خود دل ہی دل میں اپنی تصویر کے متعلق کہا کرتے کہ عجیب چیز واقع ہوئے ہیں ہم بھی۔ بات یہ ہے کہ ایک لیڈر اور ایک عام انسان میں جو فرق ہوتا ہے وہی فرق ایک لیڈر اور ایک عام انسان کے لباس میں ہونا چاہیے۔ وہی فرق ایک عام انسان کی شکل وصورت اور ایک لیڈر کی شکل وصورت میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا

بھی ہے کہ ایک لیڈر کا لباس عام انسانوں سے کچھ مختلف ہو کر تھوڑا بہت روحانی لباس بن جاتا ہے۔ ایک لیڈر کی شکل عام انسانوں سے کچھ علیحدہ ہو کر الف لیلیٰ کی تصاویر سے مشابہ ہو جاتی ہے اور ایک لیڈر کی نقل وحرکت عام انسانوں سے ممتاز ہو کر کچھ جنون کی سی نقل وحرکت بن جاتی ہے۔ ورنہ یہ بھی تو غور کیجیے کہ ایک لیڈر آخر پہچانا کیسے جائے اور اس کو لیڈر کون کہے۔ بہر حال ہم اگر لیڈر ہوتے تو ہمارا بھی یہی حال ہوتا کہ لباس پر نور برستا اور چہرے پر کھدر۔ چہرے پر متانت پیدا کرتے اور لباس سے دعوت تبسم دیتے۔ اب تو حال یہ ہے کہ جتنا اچھا لباس پہن کر جس قدر اکڑتے ہیں اتنا ہی بڑا آدمی اپنے کو سمجھتے ہیں لیکن لیڈر ہوتے تو جتنا معمولی لباس پہنتے اور جس قدر کسر نفسی کے ساتھ مسکراتے اس قدر بلند مرتبہ ہم کو ملتا۔ اب تو یہ فکر رہتی ہے کہ کوئی ہمارے چہرے سے ہماری فاقہ مستی کا راز نہ معلوم کر لے لیکن لیڈر ہونے کی صورت میں میں قحط زندگی کے تمام آثار چہرے ہی سے نمایاں کرنا پڑتے مختصر یہ کہ جو زندگی اب بسر کر رہے ہیں اس کو لیڈری کی زندگی سے کوئی نسبت ہی نہ ہوتی۔ اب تو مرغن غذا، عمدہ لباس اور گرم جیب ہماری زندگی کا سہارا بنی ہوتی ہے لیکن لیڈر کی صورت ان تمام سطحی چیزوں سے بحال نہیں رہتی بلکہ اس کے خون میں گرمی تو اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب اس کا نام لے لے کر زندہ باد کے نعرے بلند کیے جاتے ہیں۔ اس کا جلوس نکالا جاتا ہے، اس پر پھولوں کی بارش ہوتی ہے۔ اس کی گاڑی میں بجائے گھوڑے یا بیل کے انسان جوتے جاتے ہیں اور اس کے دیکھنے کے لیے سڑکوں پر دورویہ ایسا مجمع ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر سوار ہو کر اپنی حسرت دیدار کی تکمیل کرتے ہیں۔ جس وقت یہ اعزاز ہم کو حاصل ہوتا ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ ہمارا وزن بڑھ جاتا، ہمارے بہت سے امراض بغیر کسی دوا کے دور ہو جاتے اور ہمارا خون بغیر کسی ٹانک کے بڑھ جاتا۔ ہم ہاتھ جوڑ جوڑ کر ہاتھ

پھیلا پھیلا کر گردن ہلا ہلا کر اور مسکرا مسکرا کر مجمع کے سلاموں کا جواب دیتے اور دل یہی چاہتا کہ جلوس کا راستہ دس پندرہ میل اور طویل ہو جائے اور جس گاڑی پر ہم سوار ہیں اس کی رفتار کچھ اور کم ہو جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ دیر تک ہم اپنی ان پرستاریوں کا منظر دیکھ سکیں۔ جلوس کے اختتام پر ہم جلسہ گاہ میں لائے جاتے اور ہمارے پہنچتے ہی وہاں ایک کھلبلی مچ جاتی۔ لوگ ہمارے نام کے ساتھ سیکڑوں نعرے بلند کرتے ہم پر پھولوں کی مسلسل بارش ہوتی اور آخر کار ہم باوجود اس تمام افتخار کے اپنے نزدیک ''عرضی فدوی'' بنے ہوئے پلیٹ فارم پر آتے اور ہم کو ہاروں سے لاد دیا جاتا ہم کو جتنی عزت دی جاتی اس قدر ہم خاکسار اور ہیچمیداں قسم کے ہو جاتے اور آخر کار تالیوں کے شور اور نعروں کے ہنگامے میں ہم تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوتے۔ مصور مختلف زاویوں سے ہماری تصویر لیتے۔ کسی میں منہ کھلا ہوا تو کسی میں آنکھ بند کسی میں منہ چڑھاتے ہوئے تو کسی میں ہاتھ منکاتے ہوئے مگر ہم ان تصاویر کی طرف گویا متوجہ بھی نہ ہوتے حالانکہ ہماری تمام تر توجہ اسی طرف ہوتی کہ کوئی تصویر بے ڈھنگی نہ آ جائے۔ مگر چونکہ اس احتیاط کا اظہار ہماری لیڈری کے شایان شان نہ ہوتا لہٰذا ہم دل ہی دل میں سنبھلتے اور خاموشی کے ساتھ ان تمام احتیاطوں کو پیش نظر رکھتے اور بظاہر صرف تقریر کر رہے ہوتے کہ۔ اے میرے بھائیو! ع

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

کیا مجھ کو تمہاری طرح ریشم ملائم نہیں معلوم ہوتا۔ لیونڈر میں خوشبو نہیں آتی اور دوسری ولایتی چیزیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ مگر میں اپنے ہندستانی فاقہ مست بھائیوں سے غداری کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔ (اس پر نعرہ ہائے تحسین بلند ہوتے) میں جانتا ہوں کہ یہ غریب ہندستانیوں کی حق تلفی ہے (پھر نعرے بلند

ہوتے) اور میں جانتا ہوں کہ اس طرح میں اپنے ہندستانی بھائیوں کے منہ سے روکھی سوکھی روٹی کا بھی نوالہ چھین رہا ہوں۔ (اس پر دیر تک فلک شگاف نعرے بلند ہوتے)

پھر ہم حاضرین جلسہ کو حفظان صحت کے اصول بتاتے اور ساتھ ہی ساتھ امور خانہ داری کی بھی تلقین کرتے اس لیے کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنا انسان اپنے گھر ہی سے سیکھتا ہے۔ بہر حال حفظان صحت اور امور خانہ داری کے بعد ہم فوراً اپنی تقریر کا رخ کفایت شعاری کی طرف پھیر لیتے اور پھر شعر و شاعری کی طرف۔ اسی سلسلے میں مرزا غالبؔ، میر تقی میرؔ، میاں نظیرؔ اکبر آبادی اور جناب اکبرؔ الہ آبادی کے زیادہ سے زیادہ شعر حاضرین کو سنا جاتے کہ ہماری تقریر ذرا طویل ہو جاتی اور حاضرین یہ کہہ سکتے کہ بڑا بولنے والا ہے۔ مگر اس کے باوجود جب ہماری تقریر ۱۵ منٹ ہی میں ختم ہونے لگتی تو ہم اپنے حافظہ پر زور دے کر تمام لطائف جو ہم نے زندگی بھر سنے ہوتے اپنے ان معتقدین کو سناتے اور ہم کو یہ دیکھ کر مسرت ہوتی کہ تمام مجمع ہنسی کے مارے لوٹا جا رہا ہے۔ اب مجمع کی آب و ہوا معتدل کرنے کے لیے ہم علامہ راشد الخیری کی ایک آدھ درد انگیز ناول کا پلاٹ بیان کر جاتے تا کہ ہنسنے والے یہ اندازہ کر سکیں کہ ہم کو صرف ہنسانا ہی نہیں رلانا بھی آتا ہے مگر یہ بھی آخر کب تک ہوتا۔ ہمارے ایسے نامی گرامی لیڈر کو کم سے کم ایک گھنٹہ تقریر کرنا ہوتی لہٰذا ہم اس وقت کو پورا کرنے کے لیے اپنی زندگی کے کچھ واقعات مثلاً اسکول اور کالج کے افسانے یا اپنے مختلف ریل کے سفر میں سے کوئی سفرنامہ سنا جاتے۔ بہر حال ہماری تقریر ان تمام نکات و رموز کے بعد جب ایک گھنٹہ میں ختم ہوتی تو ہم دیکھتے کہ حاضرین کا بہت تھوڑا مجمع باقی رہ گیا ہے۔ دراصل یہی پسماندگان ہمارے معتقد ہوتے اور انھیں کے سبب سے ہماری لیڈری

کے آئندہ چلنے کی امید باقی رہ جاتی۔ ہم ان حضرات کے نعرہ ہائے تحسین میں اپنی تقریر ختم کرتے اور اس کے بعد اپنے میز بانوں کے مشورے سے فوراً کسی دوسرے شہر یا گاؤں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ اس لیے کہ ہماری تقریر سے بہت سے ہمارے دشمن پیدا ہو جاتے اور وہ ہم کو مسخرہ، بے تکایا، وہ گو وغیرہ کہہ کر گویا ہماری شان میں کوئی گستاخی نہ کر بیٹھے بہر حال ہم خود اس کا موقع نہ دیتے اور فوراً کسی اور طرف کا رخ کر کے روانہ ہو جاتے۔ ہر جگہ ہماری یہ آؤ بھگت ہوتی اور ہر جگہ ہماری تقریری مہارت اور جادو بیانی کا سکہ یوں ہی بیٹھتا اس سے زیادہ آخر آپ ایک لیڈر سے اور کیا چاہتے ہیں اور ایک لیڈر اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتا ہے۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس لیڈری کا اتنا سخت معاوضہ دیا جائے کہ آدمی جیل تک چلا جائے۔ لیڈری کے لیے ہم بس یہی ایثار کر سکتے تھے کہ سوت نہ پہنتے، فیشن پرستی کو چھوڑ دیتے، اچھی خاصی صورت کو بگاڑ لیتے۔ سوائے لیڈری کے دنیا کے کوئی اور کام نہ کرتے تقریری مشق بڑھا لیتے۔ ایڈریس لینا اور ایڈریس کا جواب دینا سیکھ لیتے۔ کسی موافق یا کسی کے مخالف پروپگینڈہ کرنے کے گر معلوم کر لیتے۔ عوام کو معتقد بنانے کے ہتھ کنڈے یاد کر لیتے۔ مجمع کو ہنسا دینے اور مجمع کو رلا دینے کی قدرت اپنی تقریر میں پیدا لیتے شہر شہر اور گاؤں گاؤں تقریریں کرتے پھرتے اور ان تمام خدمات کے معاوضے میں صرف یہ چاہتے کہ ہم کو لمبے چوڑے قومی خطاب دیئے جاتے۔ اخبارات میں ہمارے چرچے ہوتے۔ گھر گھر ہمارا تذکرہ ہوتا۔ ہماری تصاویر کو لوگ قدر منزلت کے ساتھ دیکھتے۔ جب ہم گھر سے باہر نکلتے تو لوگ سر آنکھوں پر جگہ دیتے۔ ہمارا نام لے کر نعرے بلند کیے جاتے اور وہی تمام اعزاز ہم کو حاصل ہوتا جو ایک لیڈر کو حاصل ہونا چاہیے۔ رہ گیا یہ سوال

کہ ہم کھاتے کیا اور ذریعہ معاش کیا ہوتا۔ یہ اس لیے خارج از بحث ہے کہ ہم کو لوگ لیڈر سمجھ کر روپے کی تھیلیاں پیش نہ کرتے تو ہم فوراً لیڈری چھوڑ دیتے۔ اس لیے کہ روپیہ کی تھیلیاں نہ پیش کرنا دراصل ہماری توہین ہوتی اور ہم اس توہین کو ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور بغیر اس کے تو شاید ہم کو گھر سے بھی لیڈری کرنے کی اجازت نہ ملتی۔ لیڈری کرتے تو کیوں کر۔ یہ سچ ہے کہ ایک لیڈر کے لیے کسی وقت بھی کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کی کمی نہیں رہتی اس لیے کہ اول تو وہ ساگ پات قسم کی غذا کھاتا اور کھدر قسم کا لباس پہنتا ہے۔ دوسرے اس کے معتقدین ہر وقت اس کو اپنے لیے باعث اعزاز سمجھتے ہیں کہ ان کا رہنما ان کے دستر خوان کو عزت عطا کرے۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ رہنما غریب کے بال بچے بھی ہوتے ہیں اور وہ بغیر پیش کردہ تھیلیوں کے زندہ رہ ہی نہیں سکتے ۔ رہنما اپنی زندگی تو بڑے مزے میں گذار سکتا ہے بشرطیکہ وہ مرنے کے بعد کچھ جائیداد اپنے پسماندگان کے لیے چھوڑ جانے کا گھریلو طور پر پابند نہ بنا دیا گیا ہو۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے تو تھیلیاں ازبس ضروری ہوتیں۔ ایسی ضروری کہ شاید ہم اپنی لیڈری کی پہلی شرط انھیں تھلیوں کو قرار دے دیتے تاکہ ہمارے بعد ہمارے بچوں کو لیڈر وغیرہ بننے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

بہر حال یہ تمام مرحلے تو کسی نہ کسی طرح طے ہو ہی جاتے مگر ہم نے ان لیڈروں کی زندگی میں ایسے ایسے واقعات بھی دیکھے ہیں کہ ان کی ناک میں دم ہو جایا کرتا ہے اور وہ عجیب عجیب ترکیبوں سے ان مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مثلاً اپنے ہی معتقدین میں کسی وجہ سے اختلاف ہو جائے کہ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہو جائیں جلسوں میں ایک دوسرے پر شرم شرم کے نعرے بلند کرتے کرتے یہ لوگ ڈھیلے بازی سے جو ابتداء کرتے ہیں تو اکثر

پولیس کی فائرنگ پر ایسے جلسوں کی انتہا ہوا کرتی ہے۔ ایسی صورت میں لیڈر غریب کے لیے یہ بڑی مصیبت ہوتی ہے کہ وہ کس کا ساتھ دے کس کا نہ دے۔ یہ مصیبت بحیثیت ایک لیڈر کے ہم پر بھی نازل ہوتی مگر ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ اس قسم کے مواقع پر ہم ہمیشہ دروازے کی زنجیر اندر سے چڑھا لیا کرتے ہیں یا دروازے کے اوپر ایک تختی ٹانگ لیا کرتے ہیں کہ:-

"مکان برائے کرایہ خالی ہے"

یا سر پر پٹی باندھ کر لحاف کے اندر گھس رہتے ہیں۔ بہرحال ہم کچھ بھی کرتے مگر صاحب ہم سے تو یہ نہ ہوتا کہ ان ہنگاموں میں گھر کے باہر نکلتے اور بچوں سے کہہ جاتے کہ تم اپنے یتیم ہونے کا انتظار کرو یا گھر سے نکل کر لٹھوں کے زیر سایہ اسپتال پہونچ کر پھٹے ہوئے سر پر ٹانکے لگواؤ۔ اس قسم کے معرکوں میں ہماری لیڈری ہمیشہ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ داخل کر کے رخصت علالت لے لیا کرتی اور ہم ان باتوں سے ہمیشہ دور رہتے۔ اسی طرح ان معرکوں میں بھی ہم سب کی نگرانی کے لیے پیچھے ہی رہتے جس میں پولیس وغیرہ سے کوئی مقابلہ ہو جاتا تاکہ ہمارے پیرو بھاگنے نہ پائیں۔ اس قسم کے موقعوں پر ایک سمجھدار لیڈر ہمیشہ پیچھے ہی رہے گا۔ البتہ بھاگنے والوں میں لیڈر کو سب سے آگے رہنا چاہیے اور یہی ہم بھی کرتے تاکہ بھاگنے کے سلسلے میں ان کی رہنمائی کر سکیں اور دراصل یہی وقت بھی ہوتا ہے رہنمائی کرنے کا۔ اوّل تو جہاں تک ہم سے ہوسکتا اس قسم کے مواقع پیدا ہی نہ ہونے دیتے کہ جان جوکھم میں پڑ جائے اور جینے کے لالے۔ لیکن اگر ناگہانی طریقہ پر اس قسم کا کوئی موقع آ جاتا تو ہم سب سے پہلے اپنی خیر مناتے۔ اس لیے کہ اگر ہم ہی نہ ہوتے تو ہمارے پیرو رہ کر کیا کریں گے۔ ہماری زندگی خود ہم کو اپنے لیے عزیز نہ ہوتی بلکہ اگر سچ پوچھیے تو ملک وقوم کے لیے عزیز ہوتی

اور ہم زندہ رہنا محض اس لیے گوارہ کر لیتے کہ ہماری ضرورت ہماری قوم کو ہوتی ورنہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا ایسا لیڈر بھلا موت سے کیا ڈرتا مگر چونکہ ہم لیڈر ہوتے لہٰذا اس قسم کی موت سے نہ ڈرنا ہی بڑا سمجھتے اور اپنے کو اپنی قوم کی امانت سمجھ کر جہاں تک ہوسکتا محفوظ رکھتے۔

مناثرہ انجمن بہار ادب لکھنؤ ۳۸ء

لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی شاعری کا وہ دور جس کا آغاز بیسویں صدی سے ہوتا ہے فنی جذباتی اور افادی حیثیت سے ادب اردو میں کیا وجہ رکھتا ہے؟

اس سے قبل کہ میں مقررہ ادبی عنوان پر کچھ عرض کروں امید ہے کہ آپ مجھ کو اجازت دیں گے کہ میں ذرا اپنی جغرافیائی حیثیت بیان کردوں تا کہ آپ کو یہ معلوم ہوسکے کہ ایک تھانوی کیا ہوتا ہے کہاں ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے یعنی ایک تھانوی کو لکھنؤ یا لکھنؤ اسکول کی شاعری کے اس دور میں جس کا آغاز بیسویں صدی سے ہوتا ہے فنی، جذباتی اور افادی حیثیت سے کیا درجہ حاصل ہوسکتا ہے اس کو آپ بغیر جغرافیائی تشریح کے محض علم عروض کی مدد سے شاید نہ سمجھ سکیں البتہ جغرافیہ کے علاوہ اگر کوئی اور علم اس بات کو سمجھا سکتا ہے تو وہ علم ریلوے ہے یعنی ریلوے سے ٹائم ٹیبل دیکھ کر آپ کو یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ تھانہ بھون کہاں واقع ہے لکھنؤ سے وہاں تک کا کرایہ کیا ہے اور فنی جذباتی یا افادی حیثیت سے وہاں تک کس درجہ میں جانا چاہیے۔ بہر حال تھانہ بھون کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جس کی جستجو میں آپ کو واسکوڈیگاما بننا پڑے اور اب تو جب کہ آپ نے ایک تھانوی کو دریافت کرلیا ہے تھانہ بھون کا آسانی کے ساتھ پتہ چل جانا کوئی بات ہی نہیں آپ کیوں کسی جغرافیہ کی کتاب کی ورق گردانی کریں اور کیوں ان ڈبلو آر کا ٹائم ٹیبل خریدنے کے بجائے ای۔آئی۔آر کا ٹائم ٹیبل خرید کر اپنے

دام ضائع کریں۔ ہم خود ہی عرض کیے دیتے ہیں کہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں برقی روشنی اور دو اسٹیشنوں والا ایسا قصبہ ہے، جس کو اگر آپ یو۔ پی اور پنجاب کی سرحد کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ یہ قصبہ دہلی سے جتنا قریب ہے لکھنؤ سے اتنا ہی دور ہے اور اسی اعتبار سے ایک تھانوی کا دہلوی ہوجانا جس قدر آسان ہے اسی قدر لکھنوی بننا مشکل ہے یہی وجہ ہے کہ باوجود زندگی بھر لکھنوی رہنے کے یہ خاکسار آج تک نرا تھانوی بنا ہوا ہے حالانکہ نام کے ساتھ محض جینے کے لیے تھانوی لگا ہوا ہے ورنہ دراصل مرنے کے لیے یہ غلام خالص لکھنوی ہے۔ بچپن یہیں گزرا، جوانی اسی عروس البلاد اور بلاد العروس کی گلیوں میں کھوئی اور بدستور یہ سلسلہ جاری ہے اب امید ہے کہ اگر خدانخواستہ بڑھاپے کی نوبت آئی تو وہ بھی یہیں کی مساجد میں وظیفہ پڑھ پڑھ کر گذر جائے گا اور خاک عیش باغ کی کشش اپنے حدود سے نکلنے نہ دے گی مگر باوجود ان تمام ملکی حقوق کے یہ خاکسار اب تک غیر ملکی ہے ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ لکھنؤ یا لکھنؤ اسکول کی شاعری کے متعلق اس غیر ملکی کو لب کشائی کی جرأت بھی کرنا چاہیے یا نہیں مگر اجتماع میں بہت سے غیر ملکی اس ملکی بحث میں حصہ لے چکے ہیں لہٰذا ایک تھانوی کیوں پیچھے رہ جائے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے اس وقت تک کے متعلق کچھ عرض کرنا کم سے کم ہمارے بس کی بات نہیں اس لیے کہ اپنی پیدائش سے قبل کے واقعات پر روشنی ڈالنا ہمارے نزدیک کوئی انسانی فعل نہیں کہا جاسکتا پھر ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ پیدا ہوتے ہی ہم نے مشاعروں کی حاضری کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ پہلے تو شفاخانوں کی حاضری کو اپنا معمول بنایا اس کے بعد جب یہ طے کرلیا کہ زندہ ہی رہنا ہے تو اسکول اور کالج کی حاضری کو مشاعروں کی حاضری پر مقدم سمجھا۔ البتہ ۱۹۲۸ء سے مشاعرہ بازی اور مشاعرہ نوازی شروع کی ہے اگر آپ ۱۹۲۸ء سے بیسویں صدی کا آغاز

فرض کرلیں تو المکلف الخدمت مع خراشی کے لیے حاضر ہے ورنہ ما بخیر شما بسلامت خانہ آباد دولت زیادہ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس دس سال کے اندر جو انقلابات فنی۔ جذباتی اور افادی حیثیتوں سے لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر گزرے ہیں سچ تو یہ ہے کہ ان کو کم سے کم پوری ایک صدی میں گزرنا چاہیے تھا۔ آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے کہ واقعی دس سال میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور لکھنؤ یا لکھنؤ اسکول کی شاعری دس سال پہلے کس درجہ میں تھی اور آج کس درجہ میں ہے۔

فنی حیثیت سے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ لکھنؤ اسکول کے شعراء نے بیسویں صدی کے آغاز سے اس وقت تک نہ تو کوئی جدید بحر دریافت کی نہ عروض میں کوئی اضافہ کیا۔ وہی مفعول فاعلات جو باوا آدم کے وقت سے چلا آرہا ہے اب تک قائم ہے اور اسی لکیر کے سب فقیر بنے ہوئے ہیں۔ مقررہ بحروں میں غزلیں کہتے ہیں اور وہ بھی زبان کے خاص اصولوں کے ساتھ۔ نہ کوئی جدید محاورہ نظم کرتے ہیں نہ ان کے اشعار میں کوئی نئی ترکیب ہوتی ہے اور نہ کوئی ایسی بندش جس کو زیر بحث دور کی ایجاد یا اس زمانے کی کسی ایجاد کا پرتو کہا جا سکے۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ ترقیاں لکھنؤ اسکول کے علاوہ آخر کس اسکول نے کی ہیں اس کا جواب ہم آپ کو لکھنؤ اسکول ہی سے دیں گے مگر ذرا حیدرآباد تک ہٹ کر استاد السلطان حضرت جلیل کو آپ لکھنؤ اسکول سے باہر نہیں کہہ سکتے مگر چونکہ وہ حیدرآباد میں ہیں لہٰذا اپنے کو اس دائرہ سے باہر سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

دل کے شیشے میں تصور نے جو کی صورت کشی
کاپیاں آنکھوں نے بھی لے لیں شبیہ یار کی

دراصل یہ ہونا چاہیے تھی بیسویں صدی کی شاعری! کیا کہ اس مشین گن کے دور میں بھی وہی تیر و تفنگ نظم کیے جائیں جواب کسی اسلحہ خانہ میں تو نہیں البتہ عجائب

خانوں میں نظر آتے ہیں۔ موٹروں کا زمانہ ہے اور اونٹ کا ذکر ہو رہا ہے۔ تار برقی اور ٹیلیفون سے دنیا فائدے اٹھا رہی ہے۔ مگر شاعری کی قسمت میں وہی مرنے کے بعد خط کا جواب لانے والا نامہ بر رہ گیا ہے جو گور غریباں میں آکر چلائے کہ ع

کس کس کو انتظار تھا خط کے جواب کا

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی سائنٹیفک شاعری کی مثالیں جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے لکھنؤ اسکول سے باہر بھی مشکل ہی سے ملیں گی مگر سوال تو یہ ہے کہ آخر غزل کیوں کہیے جب کہ آپ کو معلوم ہو کہ ؎

بقدر ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

نظم کہیے نا۔ جس میں آپ ہر اعتبار سے آزاد ہیں۔ نئی نئی بحریں ہوں گی انوکھے محاورے ہوں گے تازہ بتازہ ترکیبیں ہوں گی اور نو بہ نو بندشیں۔ اب دیکھیے نا کہ لکھنؤ اسکول کے علاوہ باقی تمام ہندوستان غزل گوئی چھوڑ کر نظم کی طرف متوجہ ہو چکا ہے اور ان نظموں میں بھی خوب خوب چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس وقت کوئی نظم تو یاد نہیں مگر ان نظموں کا سانچہ یاد ہے لہٰذا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

تو برق مجسم ہے
تو بیش ہے تو کم ہے
اندازۂ پیہم ہے
خمیازۂ برہم ہے
اے وہ کہ تو ہی تو ہے
انداز شکیبائی
یہ انجمن آرائی

اے جنت بینائی
اے پربت صدرائی
اے وہ کہ تو ہی تو ہے

مفہوم کی جستجو نہ کیجیے معنی آفرینی سے بھی کام نہ لیجیے ترکیبوں کی صحت پر بھی غور نہ فرمایئے بلکہ یہ دیکھئے کہ کیا روانی ہے اور کیا موسیقیت۔ جوانی پھوٹی پڑتی ہے شباب رقص میں ہے جذبات عریاں ہوئے جاتے ہیں فضائیں زمزمے برسانے لگتی ہیں اور ماحول ایک عظیم الشان پیانو نظر آتا ہے کیا اس کو بھی آپ فنی حیثیت سے ترقی نہ کہیں گے؟ خیر یہ تو یہ اب تو ایک اور شاعری شروع ہوگئی ہے جس کو آزاد شاعری کہتے ہیں جس میں ردیف و قافیہ سے آزاد ہو کر شعر کہا جاتا ہے اور ہر شعر مادر پدر آزاد قسم کا ہوتا ہے۔ اس کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو۔

میں تری جذبات کی دنیا میں آکر سوگیا
لوریاں دیتی رہی تیری جوانی بار بار
پھر جفاؤں نے تری مجھ کو جگایا رات بھر
تو مری انگڑائیوں کا رقص خود دیکھا کیا
میں نے بیداری میں اپنے خواب دیکھے بارہا
ہاں مگر تو ہی مرے ہر خواب کی تعبیر ہے

ان اشعار کو آپ "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ" کہہ کر ہنس دیں گے حالانکہ ان ہی کا نام افکار عالیہ، جواہر پارے، حسن تخیل اور زمزمہ روح وغیرہ ہے۔

(۱) خیر اس کو بھی جانے دیجیے ہم تو زمانے کی رفتار یہ دیکھ رہے ہیں کہ عنقریب شاعری صرف اس طرح ہوا کرے گی کہ مشاعروں کے دعوت ناموں میں مصرع طرح کی جگہ یہ لکھ دیا جائے گا کہ "طرح دو انچ تین سینٹی میٹر طویل قافیہ پیمانہ ردیف

نہیں" اور اسی طرح پر شعرائے کرام ناپ ناپ کر مصرع کہیں گے اور عروض کے پرانے اوزان کو چھوڑ کر جدید پیمانوں سے ان کے اشعار ناپے جائیں گے بلکہ کیا تعجب ہے کہ امریکہ کے سائنسداں شعر کہنے کی کوئی مشین بنا کر بھیج دیں کہ مصرع طرح اس مشین میں رکھا اور مطلع سے لے کر مقطع تک پوری غزل تیار۔ بہرحال اس سائینس کے دور میں وہ شاعری جو سائینٹفک اصولوں کے خلاف ہو ذرا مشکل سے کامیاب ہوسکتی ہے اور اس کو جھک مار کر کسی نہ کسی انقلاب کی زد میں آنا پڑے گا۔

مگر لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی شاعری کو ان انقلابات کی بھی خبر نہیں بلکہ لکھنؤ اسکول کے شعراء بیسویں صدی کے کلام کو سن کر کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ اب محض غزل ہی کہہ رہی ہیں گویا فنی حیثیت سے کوئی ترقی خود ان کو قبول نہیں کرسکتی البتہ فنی حیثیت کے ایک دوسرے رخ سے ترقی ضرور کی ہے اور وہ ترقی یہ ہے کہ اب تک تو عروض محض مسند اور تکیہ۔ قالین اور دری چاندنی وغیرہ تک محدود تھا مگر اب اس میں کرسیاں بھی شامل کر لی گئی ہیں شمع کی گردش کے بجائے شعراء کرام ڈائس پر جا کر کلام سننے کو اب تقطیع سے گرا ہوا نہیں سمجھتے حاضرین مشاعرہ کے تالی بجانے میں اب کوئی ذم کا پہلو نہیں نکلتا۔ حقہ کی جگہ سگار اور سگریٹ میں بھی تنافر نہیں پایا جاتا۔ دور کے بجائے اگر شعراء کو حروف تہجی کے اصول پر مرتب کی ہوئی فہرست سے پڑھوایا جائے تو اس میں بھی خفی یا جلی کسی قسم کا ایطا نہیں ہوتا محفوظ یہ کہ لکھنؤ اسکول کی ان ترقیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ جب ان فنی ترقیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ جب ان فنی ترقیوں کو اس فنی جمود کے دوش بدوش آپ رکھیں گے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر اس وقت تک لکھنؤ اسکول کی شاعری کو فنی اعتبار سے ڈیوڑھا درجہ حاصل ہے۔ اب رہ گئیں دو حیثیتیں جذباتی اور افادی جہاں تک جذباتی حیثیت کا

تعلق ہے ہمارے خیال میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا جب تک کہ لکھنؤ اسکول کے شعراء مشاعروں کی مقررہ طرح پر غزل کہنے کی عادی ہیں۔ مقررہ طرح مقررہ قوانی پر غزل کہنا کس طرح جذباتی شاعری ہو سکتی ہے قافیہ پیمائی کو جذباتی شاعری نہیں کہا جا سکتا جذباتی شاعری تو دراصل یہ ہے کہ طرح تو ہے ع

ذرہ ذرہ ترے کوچہ کا مرادل ہوجائے

اور جذبات سے مغلوب ہو کر شاعر یہ مطلع کہہ جائے کہ ؎

راستی سیدھی سڑک ہے جس میں کچھ کھٹکا نہیں
کوئی رہرو آج تک اس راہ میں ٹھبکا نہیں

جذبات کو ردیف کی بیڑیاں اور قوانی کی ہتھکڑیاں پہنا کر آپ قید نہیں کر سکتے۔

(۲) اور نہ جذبات دراصل اس کے پابند ہو سکتے ہیں کہ وہ آپ کے فاعلاتن فاعلات کے حرف بحرف پابند رہیں بلکہ اگر سچ پوچھئے تو جذبات تو اس کی بھی پروانہ کریں گے کہ آپ کہاں پر موزوں رہے اور کہاں ناموزوں ہو گئے۔ جذباتی شاعری تو دراصل یہ ہے کہ ؎

تم تو کہتے تھے وہ آئیں گے نہیں
دیکھو وہ کیا چلے آتے ہیں دونوں ہاتھوں میں پر طاؤس لیے

آپ کے نزدیک یہ شعر یقیناً غلط ہوگا اور ہر اعتبار سے غلط ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ واقعی آپ کے اصول کے مطابق یہ شعر ذرا غلط ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جذباتی شعر ہے اگر آپ یہ کہیں کہ پہلا مصرعہ بہت چھوٹا اور دوسرا مصرعہ بہت بڑا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہی تو دراصل جذباتی شعر ہونے کی علامت ہے۔ شاعر جس وقت پہلا مصرعہ کہہ رہا تھا اس کے جذبات اسی قدر مختصر تھے جس قدر مصرعہ

مختصر ہے اور جس وقت دوسرا مصرعہ نظم کیا گیا ہے اس وقت اس کے جذبات کا طول وہی تھا جو دوسرے مصرعہ میں آپ کو نظر آ رہا ہے۔ دراصل شاعر نے عروض سے زیادہ اپنے جذبات کی پابندی کی ہے اور ہمارے نزدیک یہی جذباتی شاعری ہے۔ یا ایک اور شعر یاد آیا ؎

سر سے پا تک ہے کمران کی جو بٹل کھائی ہوئی
وہ نسلاً بعد نسلاً ولد ہوتے رہے

آپ اس شعر پر ہنس رہی ہیں اور آپ کی ہنسی ایک حد تک حق بجانب بھی ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ جذبات دراصل کسی کی موزونیت یا کسی ترتیب کے پابند ہو ہی نہیں سکتے۔ اس شعر میں تو خیر بے ربطی اور ناموزونیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے مگر ہم تو اس کو بھی مکمل جذباتی شعر کہنے کو تیار ہیں جس کا پہلا مصرعہ نظم میں ہو اور دوسرے مصرعہ کی جگہ محض مفہوم نثر میں لکھ دیا جائے۔ مطلب کہنے کا یہ کہ جذبات کو آپ قید نہیں کر سکتے اور جب آپ نے قید کر دیا تو جذبات بھی آپ کو وہ دھوکا دیں گے کہ آپ سمجھیں گے ان کو جذبات حالانکہ وہ ہوں گے محض مصرع طرح کے سائز کے شعر اور آپ کی موزونیت کے چند کرتب۔ مطلب کہنے کا یہ ہے جذباتی حیثیت سے تو لکھنؤ یا لکھنؤ اسکول کی شاعری کو کوئی درجہ ہی نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ بقول گاندھی جی کے کوئی فورتھ کلاس ہی نہیں ہے جس میں سفر کروں لہٰذا مجبوراً تھرڈ کلاس میں بیٹھ جاتا ہوں۔

افادی حیثیت سے البتہ لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی شاعری نے حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں۔ مثلاً سب سے پہلی ترقی تو کرسیوں کی نشست ہے جس کا افادی پہلو یہ ہے کہ حاضرین کے جوتے محفوظ رہ سکتے ہیں حالانکہ چوروں کے نقطۂ نظر سے افادی پہلو ختم ہو گیا مگر حاضرین مشاعرہ کے نقطۂ نظر سے افادی پہلو دراصل اب پیدا

ہوا ہے یعنی اب جوتوں کی چوری کا محض اس وقت امکان ہے جب آپ پاپوش کے ساتھ صاحب پاپوش کو بھی غائب کریں ورنہ آنکھ سے سرمہ چرانا اور پیریس سے جوتا کھول لے جانا تقریباً یکساں ہے۔ دوسرا افادی پہلو یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے سامعین مشاعرہ سوٹ پہننے لگے ہیں اور ان کے قیمتی سوٹ فرشی مشاعرہ میں اگر بالکل خراب نہ ہوں تو کم از کم پتلون کو تو شرعی پاجامہ ضرور بنا دیتے ہیں اور ان کی نشست کا زاویہ بھی کچھ بے ڈھنگا ہی سا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے سامعین سوٹ کی وجہ سے نماز کے ساتھ ساتھ مشاعروں کی شرکت بھی چھوڑتے جاتے تھے۔ کہ کرسیوں کی نشست کا طریقہ معلوم ہو گیا اور اب ان سامعین کے سوٹ بالکل اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح سینما میں محفوظ رہ سکتے ہیں۔ یہ افادی پہلو بظاہر تو کچھ نہیں مگر اہل سوٹ کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھئے تو بہت کچھ ہے۔

تیسرا افادی پہلو یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر اس وقت تک کے چند مایہ ناز شعراء مثلاً خیام العصر ریاض خبرآبادی، لسان القوم مولانا صفی اور حضرت ظریف لکھنوی کے کلام کا مجموعہ شائع نہیں کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ادب اردو کے ان گم شدہ اوراق کی ضرورت نہایت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے مگر اقتصادی تباہی کے اس دور میں اگر یہ مجموعے شائع کر دئے جائیں تو قدر دانان سخن اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر ان کو خریدیں گے اور افادی مقصد فوت ہو جائے گا۔

چوتھا سب سے بڑا افادی پہلو یہ ہے کہ فرشی مشاعروں میں ہر آنے والے شاعر کو شعراء سے لے کر سامعین تک جن مختلف زاویوں سے اٹھ اٹھ کر اور بیٹھ بیٹھ کر تعظیم دیا کرتے تھے اس سے پتلون تو پتلون اگر سچ پوچھئے تو پاجامہ تک کی سیونیں بعض اوقات چر چرا جاتی ہیں اور تعظیم دینے والے کو کان پکڑ کر اٹھا بیٹھی کا مزہ آ جاتا تھا اب اس کا بھی سدباب ہو گیا ہے اور کسی کو تعظیم دینے کے لیے صرف دو ہی زاویے

باقی رہ گئے ہیں یعنی یا تو بخط مستقیم کھڑے ہو جاتے ورنہ زاویہ قائم بنے ہوئے بیٹھے رہے بلکہ پیروں کو زحمت دینے کے بجائے اظہار عقیدت کے لیے اب ہاتھوں سے کام لیا جاتا ہے کہ جس کو آسمان پر چڑھانا چاہا تو تالیاں بجا دیں اور بس نہ کھڑا ہونا، نہ بیٹھنا نہ ہاتھ جوڑنا نہ فرشی سلام کرنا اس میں شک نہیں کہ اس طرح ورزش کا ایک بہانہ ختم ہو گیا مگر ایک بہت بڑا افادی پہلو ضرور نکل آیا۔

فنی، جذباتی اور افادی تین حیثیتیں تو ختم ہو گئیں رہ گئیں باقی حیثیتیں وہ خارج از بحث ہیں۔ لہٰذا زیادہ حد ادب۔

غالبیات

مرزا غالبؔ کے ایسے مسلم الثبوت استاد نے جو غزل ہفتوں کی کاوش کے بعد کہی ہوگی اس کی شرح یہ خاکسار محض چند صفحوں میں عرض کر رہا ہے۔ جس کے لکھنے میں آدھ گھنٹے سے زیادہ صرف نہ ہوا ہوگا۔

اس سے قبل کہ شرح پیش کی جائے ضرورت اس کی ہے کہ ہم اخلاق وشرافت کے نام پر معذرت خواہی کریں تاکہ حشر کے دن دوسرے گریبان پکڑنے والوں میں مرزا غالب ایسے بزرگ نہ ہوں۔ لہٰذا سب سے پہلے معذرت ضروری ہے ملاحظہ فرمایئے اور گواہ رہیے کہ ہم معذرت خواہ ہو چکے تھے۔

منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

کچھ شاعری ذریعہ عزت نہ تھی انھیں
کچھ شرح لکھنا باعث عزت نہیں مجھے

آزار رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
غالبؔ سے کیا کسی سے عداوت نہیں مجھے

میں شرح لکھ رہا ہوں شرف کچھ یہ کم نہیں
مانا، اسد کا مرتبہ شوکت نہیں مجھے

غالب پہ اور مجھ کو ہو تنقید کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

میرا مزاج آپ ہے جام جہاں نما
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں اور شرح لکھتا، مگر اس سے مدعا
جز ارتکاب ذوق ظرافت نہیں مجھے

یوں ہی سا اک مذاق تھا جو شرح بن گیا
دیکھا کہ چارہ غیر اشاعت نہیں مجھے

اس میں جو آپڑی ہو سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے ترک عقیدت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

حرکت تو یہ بُری ہے پہ نیت بری نہیں!
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا شوکتؔ خدا گواہ
سچ بولتا ہوں گوکہ یہ عادت نہیں مجھے

اس معذرت کے بعد معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایک بار سر سے اتر گیا اور اب شرح پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا لہٰذا ملاحظہ فرمایئے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

دھمکی سے مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک رنگروٹ فوج میں بھرتی ہوتے کے لیے پہنچا۔ صاحب نے اس کو فوج کی ملازمت کے نشیب و فراز سمجھا کر اس کی جرأت کا امتحان لینا چاہا اور ریوالور اس کے کوٹ کی آستین میں رکھ کر لبلبی دبا دی۔ ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ گولی کوٹ کی آستین کو پار گئی مگر یہ جوان اٹینشن رہا۔ صاحب نے اس کی یہ جرأت دیکھ کر فوراً پروانہ تقرر دے دیا اور ساتھ ہی کچھ روپیہ دیا کہ اس کا کوٹ بنوا لو تمہارا کوٹ خراب ہو گیا ہے۔ رنگروٹ نے کہا اور حضور۔ پتلون کے دام۔ صاحب نے کہا۔ پتلون کیسا؟ رنگروٹ نے نہایت سادگی سے کہا۔ حضور وہ بھی تو خراب ہو گیا ہے۔ اسی مضمون کو مرزا صاحب نے اپنے اس مطلع میں پیش کیا ہے کہ عشق کی جنگ جوئی کے لیے پتلون کے دام مانگنے والوں کی ضرورت نہیں بلکہ ان مردوں کی ضرورت ہے جو عشق و محبت کی نبرد آزمائی میں جنرل فرانکو ثابت ہوں۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے کے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

اس شعر میں صرف ایک لفظ ''کھٹکا'' ایسا ہے جس نے شعر کو ذرا پڑھے لکھوں کے سمجھنے کے قابل بنا دیا ہے حالانکہ اگر اسی لفظ کو بدل کر یہ شعر یوں کہہ دیا جاتا تو کسی شرح کی ضرورت نہ تھی ؎

تھا زندگی میں موت کا پرزہ لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

یعنی موت کے بعد انسان کا رنگ زرد ہوتا ہے مگر میں نے زندگی ہی میں موت کا ایسا پرزہ فٹ کرا لیا جس کی وجہ سے زندگی میں رنگ زرد نظر آتا تھا۔ اور مرنے کے بعد تبدیلی رنگ کے جھگڑے سے نجات مل گئی۔ اب اس قسم کے پرزے شاید نہیں

ملتے معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہندستان میں اس قسم کے باکمال انجینئر بھی تھے جو ایسے حیرت انگیز پرزے اور کھٹکے بنا لیا کرتے تھے۔ دوسرا شعر ہوا ہے ؎

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

یہ شعر وہ ہے جس کا ایک عام فہم ایڈیشن کسی لوئر پرائمری شاعر نے پیش کیا ہے کہ ؎

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

یعنی بچے کے پیر پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔ ابھی کمسن ہی تھا اور خیالات میں کوئی شعور بھی پیدا نہ ہوا تھا کہ مجھ کو وفا کے طریقے سمجھنے اور وفا کیش بننے کا شوق پیدا ہو گیا اور عقل کی خامی کے زمانے میں بلوغ کی یہ علامات پیدا ہو چکی تھیں۔ اور سنیے فرماتے ہیں ؎

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

اس شعر کو سمجھنے کے لیے ممکن ہے آپ اٹلس دیکھنا شروع کر دیں کہ دنیا کے نقشے میں دریائے خوں کہاں ہے مگر اس جستجو میں آپ کو کامیابی نہ ہو گی بلکہ اس شعر کو سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ دل اور جگر کو اسپین کے دو پر فضا مقامات تصور کر لیجیے۔ اس کے بعد اسپین کی خونچکاں اور تباہ کن خانہ جنگی کو پیش نظر رکھ کر اس شعر کا مفہوم سمجھیے کہ اسپین کے ان دو مقامات کے درمیان جہاں آج خون کی موجیں نظر آتی ہیں پہلے وہ دل فریب منظر تھا کہ جلوۂ گل بھی اس کے سامنے بچہ نظر آتا تھا۔ شعر سنیے کیا خوب کہا ہے ؎

جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

اس شعر میں جو مضمون مرزا صاحب نے پیش کیا ہے وہ اب تک پیدا ہونے والے تمام شعراء اپنے اپنے الفاظ میں کہہ چکے ہیں اور آئندہ آنے والے شعراء اس بات کا حلف وفاداری اٹھار ہے ہیں کہ اسی تخیل کو اپنے الفاظ میں ضرور ادا کریں گے خواہ پھر اس کو سرقہ سمجھا جائے یا اخلاقاً لوگ اس کو توارد کہہ دیں۔

بہرحال اس شعر کو وہ حضرات بخوبی سمجھ سکتے ہیں جو بھوت پریت اور آسیب وغیرہ کے قائل ہیں۔ شاعر نے یہی کہا ہے کہ عشق وہ بلا ہے جو کبھی پیچھا نہیں چھوڑتی چنانچہ سینہ سے دل تو نکل جاتا ہے مگر دل کا درد بھوت بن کر کراہتا ہے اور وہی اس آسیبی خلل میں مبتلا رکھتا ہے، جس کو عرف عام میں عشق کہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کسی متروک شاعر کا ایک شعر یاد آ گیا ملاحظہ ہو ؎

یہ محبت بھی کہیں اے بندہ پرور جائے ہے
جائے بھی ہے یہ تو عاشق کو مٹا کر جائے ہے

مگر ہمارا تو خیال یہ ہے کہ پہلے تو محبت کا بھوت عاشق پر سوار رہتا ہے اور جب عاشق بقول شاعر کے مٹ جاتا ہے تو وہ خود بھوت بن کر شاعروں اور افسانہ نگاروں پر سوار ہو جاتا ہے۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ اس قسم کے بھوت مورخین کے سر پر بھی سوار ہوئے ہیں۔ مقطع کے علاوہ آخری شعر بھی کیا خوب ہے ؎

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

احباب نے دیکھا کہ بے چارہ جنگلوں کی خاک اڑاتا پھرتا ہے دامن گریباں میں ہے اور گریباں دامن کے اشتراک عمل سے لنگوٹی کی قائم مقامی کے

لیے تیاریاں کر رہا ہے۔ خط بڑھا ہوا ہے۔ ناخن البتہ جدید فیشن کے مطابق لمبے لمبے ہیں۔ پریشاں بالوں پر ایک دوسرا بیاباں نشو ونما حاصل کر رہا ہے سر کیا ہے جوؤں کی دنیا کا گلوب ہے۔ ڈارون کی بندر والی تھیوری میں انقلاب ہوا ہے اور اب معلوم ہوا ہے کہ انسان خواہ پہلے بندر رہا ہو یا لنگور مگر اس کا مستقبل یہ ہے کہ اگر عشق ہو گیا۔ اور عشق نے جنون کی کیفیت پیدا کی تو وہ ریچھ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بہرحال دوست کا یہ حال دیکھ کر دوست احباب یہی کر سکتے تھے کہ اس کو پکڑ کر جیل بھجوا دیں۔ دوستی کی یہ شان بظاہر دشمنی نظر آتی ہے مگر بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جن کا علاج ہی یہ ہے کہ دوا کے بجائے زہر دیا جائے۔ اسی قسم کے علاج بالمثل میں سے ایک علاج یہ بھی ہے کہ احباب جنگل سے اپنے سر پھرے دوست کو پکڑ لائیں اور جیل میں بند کر دیں تاکہ اس کا تحفظ ہو سکے اور وہ جنگلوں کی خاک نہ اڑائے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ آپ زنداں میں بیٹھے ہیں۔ اور خیال ہے کہ بیاباں کی خاک اڑا رہے ہیں۔ مگر اس خیالی بیاباں نوردی کے مضرت رساں تمام اثرات بھی خیالی ہی ہو سکتے ہیں۔ مگر عالم تصور میں دیکھتے کیا ہیں کہ ایک جھاڑی سے ہم اور دوسری جھاڑی سے ایک شیر نکلا۔ ہم ٹھہرے عاشق اور وہ بھی وحشی ہمارے لیے شیر ہو یا بھیڑ سب برابر ہیں۔ لہٰذا اس کو بھی اپنا محبوب سمجھ کر اس کی دم پر گندھی ہوئی چوٹی کا گمان کر کے جو ذرا چھوا تو اس قاتل نے جفا کاریاں شروع کر دیں۔ اور صرف نگاہوں کے تیر یا ابرو کے شمشیر سے زخمی ہی نہیں کیا بلکہ اپنے دست ناز سے پسلیاں چیر کر دل نکال لیا اور کھا گیا عاشق زار کو محض منہ کا مزہ بدلنے کے لیے۔ خیالی بیاباں نوردی کا یہ خیالی واقعہ اگر خیالی نہ ہوتا بلکہ سچ مچ ایسا ہی ہوا ہوتا تو کس قدر افسوس کا مقام تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وحشی دوست کو زنداں میں رکھ کر خیالی صحرا نوردی سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ مگر یہی کیا کم ہے کہ اس سلسلہ کے تمام افسوس ناک واقعات بھی خیالی ہی

ہوتے ہیں۔ اب مقطع سنئے اور ایک آہ بھر کر ذرا جھوم تو جائیے یا سر دھنیے یا کم سے کم زانو تو پیٹ ہی لیجیے۔

یہ لاش بے کفن اسدؔ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آج کل آزادی کا مفہوم نئی روشنی کے مردوں اور عورتوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ آفتابی غسل ہوا کریں۔ مغربی ممالک میں تو بحالی صحت اور انحطاطِ غیرت وحمیت کے لیے اس قسم کے بہت سے کلب قائم ہیں۔ جن میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ لباس ایک قطعاً غیر ضروری اور غیر فطری چیز ہے۔ اور بغیر اس کے انسان زیادہ خوش۔ زیادہ بشاش۔ زیادہ ہلکا پھلکا زیادہ آزاد اور زیادہ فطر فریب رہنے کے علاوہ اخلاقی طور پر زیادہ مضبوط رہ سکتا ہے۔ اس کے دلائل بے شمار پیش کیے جاتے ہیں اور اگر انسان ان کے جوابی دلائل پر غور کرنے کی فکر تھوڑی دیر بھی نہ کرے تو یقیناً وہ بھی جامہ سے باہر ہوسکتا ہے خواہ کیسا ہی مقدس اور ستر پوش قسم کا انسان کیوں نہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ لباس اگر کوئی ضروری چیز ہوتا تو انسان ماں کے پیٹ سے سوٹ پہنے ہوئے پیدا ہوتا مگر چونکہ انسان کے لیے فطرت نے عریانی ہی کو لباس بنایا ہے۔ لہٰذا انسان اگر برہنہ رہے تو اس کی زندگی ہر اعتبار سے پاکیزہ بن سکتی ہے اور ہر جھگڑے سے پاک ہو کر انسان اپنی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ نہ اس کی فکر کہ اس رنگ کے کوٹ پر اس رنگ کا پتلون پہننا جائز ہے اور اس قسم کا پتلون پہننا حرام مطلق۔ دن کے وقت اس قسم کی ٹوپی پہننا عین سعادت مندی ہے اور رات کے وقت یہی سعادت مندی انتہائی نالائقی ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی ٹائی اس قسم کی قمیض پر باندھنا بغاوت ہے اور اس قسم کی باندھنا عین وفاداری۔ اس طرح کے سوٹ پر اس قسم کا جوتا ہونا چاہیے اور اس طرح کے جوتے کے اندر اس قسم کے موزے ہوں۔ کھانے کا کپڑا یہ ہے۔ اور ناچنے

کا یہ۔ ڈنر کے جوتے یہ ہیں اور عام طور پر پہننے کے یہ۔ ٹینس کھیلنے کا شرٹ یہ ہے اور یہ گھوڑے پر بیٹھنے کا پاجامہ۔ مختصر یہ کہ ایک اچھا خاصا عذاب ہے اور تحریک عریانی کے مبلغین اس کو عذاب ہی ثابت بھی کرتے ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ جب تک حضرت آدم نے دانۂ گندم استعمال نہ کیا تھا لباس کی ضرورت پیش نہ آئی تھی بلکہ وہ نہایت معصومانہ انداز سے اللہ کے نیک بندوں کی طرح برہنہ پھرتے تھے۔ مگر انھوں نے شیطان کے بہکانے سے شجر ممنوعہ کو خدا کے حکم کے خلاف چھوا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف جنت سے نکالے گئے بلکہ بطور عذاب ان پر لباس بھی لاد دیا گیا۔ اور وہی لباس ایک مستقل جیل کی طرح ہر اولاد آدم کو گھیرے ہوئے ہے۔ گویا لباس وہ جیل ہے جس کو ہم اوڑھے ہوئے اور لپٹائے ہوئے طرح طرح سے سجا کر اور خوشنما بنا کر اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ اگر حضرت آدم نے گیہوں نہ کھایا ہوتا تو آج ہم کو بزاز، درزی، دھوبی کے جھگڑوں سے نجات مل جاتی اور اس سوٹ بوٹ کے بکھیڑے میں ہم نہ پھنستے۔ مگر اب متمدن ممالک کے مہذب اور روشن خیال باشندے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ کوئی وجہ نہیں کہ باپ کے گناہ کا ذمہ دار بیٹا ہو اور اس کو بھی والد مرحوم کے گناہ کی پاداش میں سزا بھگتنا پڑے۔ لہٰذا اس زنجیر اسیری کو توڑ کر اب جامہ اور پاجامہ سب سے باہر ہوئے جاتے ہیں اور وہ زمانہ دور نہیں جب تمام مہذب انسان مادر زاد برہنہ نظر آئیں گے۔ اور وحشت اور بربریت کی علامت وہ لباس ہوگا جو آج تہذیب اور تمدن کا علمبردار بنا ہوا ہے۔ بہرصورت یہ بحث طویل ہے مگر مرزا غالب کے اس مقطع کو دیکھ کر یہ معلوم ہو کر بڑی مسرت ہوئی کہ اگلے زمانہ میں بھی عریانی آزادی کی علامت تھی اور جس جدت پر آج مغرب کو ناز ہے کہ ہم ہی نے عریانی کی ابتداء کی ہے وہ دراصل ہندوستان کا ایک پرانا رواج ہے۔ چنانچہ مرزا غالب کا یہ مقطع شہادت میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی لاش کو بے کفن رکھا گیا ہے۔ کسی

مجبوری یا مصیبت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ یعنی زندگی یوں ہی آزادی میں گذاردی۔ غالباً آزادی سے مراد یہی آفتابی غسل وغیرہ ہے یا یہ کہ مرزا صاحب بھی اس سزا کے قائل نہ تھے۔ جو خود ان کے کسی جرم کے سلسلہ میں نہیں بلکہ ان کے مورث اعلیٰ کی پہلی غلطی کے سلسلہ میں ان پر عائد کی گئی تھی۔ بہرصورت لاش کا مرنے کے بعد بے کفن ہونا تو خیر وضعداری کی انتہا ہے مگر لاش کے اس طرح عریاں ہونے سے پہلے مصرعہ کی آزادی پر جو روشنی پڑتی ہے وہ غالباً کسی عریاں تشریح کی محتاج نہیں۔ پھر یہ کہ ”حق مغفرت کرے“ کہنے کی ضرورت بھی اسی لیے پیش آئی ہے کہ مرزا نے اس اسیری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا جو اولاد آدم پر نسلاً بعد نسل عائد چلی آتی ہے۔ اگر یہ احکام خداوندی کی خلاف ورزی تھی تو خدا مغفرت کرے۔ بہرحال وہ تو آزاد مرد تھا اور عجب آزاد مرد تھا۔

شوہر کی جنت

بات یہ ہے کہ ہم نے بیگم کو ہمیشہ اسی بات کا یقین دلایا ہے کہ ہم کو کسی اور جنت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہماری جنت تو صرف آپ کی ذات ہے۔ مگر واقعات اس کے سراسر خلاف ہیں۔ جب کہ ہم کو تو مستقل طور پر یہ فکر ہے کہ اگر جنت میں ہمارا ساتھ ان ہی نیک بخت کا رہا تو آخر کیا ہوگا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

طالب علمی کے زمانے میں بورڈنگ ہاؤس کی زندگی بسر کرنے کا ہم کو پورا تجربہ ہے مگر قسم لے لیجیے جو بورڈنگ ہاؤس کے ایک قانون کو بھی صحیح سالم چھوڑا ہو۔ اسکول میں ماسٹروں سے مرعوب ہونا ہمارے نزدیک ہمیشہ ذلت کی بات تھی۔ البتہ ذرا ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھنٹہ میں تھوڑی دیر کے لیے دم سادھ کر بیٹھنا پڑتا تھا مگر اب تو یہ حال ہے کہ گویا ہیڈ ماسٹر صاحب ہی سے شادی کر لی ہے۔ کیا مجال کے بیگم صاحبہ کے ہوتے ہوئے ہم اپنے پیدائشی حق یعنی آزادی سے کوئی بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ صبح دیر میں سو کر اٹھیں تو منحوس۔ منہ دھوئے بغیر چائے پی لیں تو اچھوت۔ دفتر دیر سے جانے کا ارادہ کریں تو کام چور نوالہ حاضر۔ جاڑے کا زمانہ اگر بغیر غسل کے ٹالنا چاہیں تو افیونی۔ تاش کھیلیں تو جواری۔ شطرنج سے دل بہلائیں تو نحوست کے

ذمہ دار۔ باہر گھومنے جائیں تو آوارہ گرد۔ رات دیر میں لوٹ کر آئیں تو اعلیٰ درجے کے بدمعاش۔ پتنگ اڑانے کا ارادہ کریں تو لوفر۔ اور اگر کچھ بھی نہ کریں یعنی خاموش بیٹھ کر اونگھیں یا منہ اٹھائے محض بیٹھے رہیں تو بیوقوف...... اب آپ ہی بتایئے کہ یہ زندگی ایک شوہر کی زندگی ہے یا کالے پانی کی سزا پانے والے کسی مجرم کی زندگی۔ مگر جیسی کچھ بھی زندگی ہے بہرحال اب تو اسی طرح اس کو بسر کرنا ہے۔ اس لیے کہ بیگم صاحبہ کا ساتھ کوئی ایک دو دن کا تو ہے نہیں بلکہ زندگی بھر کا ساتھ ہے اور زندگی ایک اتنی بڑی مدت کا نام ہے کہ اس کا تصور کرتے کرتے بھی اختلاج ہونے لگتا ہے۔

خیر یہ زندگی تو جس طرح بسر ہو رہی ہے ہو ہی رہی ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ جنت میں کیا ہوگا۔ یعنی اگر ایک یتیم شوہر پر یہ تمام زیادتیاں کرنے کے باوجود بیگم بھی اس جنت میں گئیں جہاں ہمارا جانا اس جہنمی زندگی بسر کرنے کے بعد گویا یقینی ہے تو وہاں کیا ہوگا۔ اور وہاں سے کیوں کر ہم کو نجات مل سکے گی۔ مگر جہاں تک ہمارا خیال ہے ہماری جنت یقیناً ان خطرات سے پاک ہوگی۔ اور وہاں بیگم صاحبہ ہم کو اپنا شوہر بنا کر یوں نہ رکھ سکیں گی بلکہ وہاں ہم ٹانگیں پھیلا کر دن چڑھے تک سویا کریں گے۔ آفتاب کی شعاعیں ہمارے لحاف پر کھیلا کریں گی۔ مگر بیگم کی یہ مجال نہ ہوگی کہ لحاف گھسیٹ کر ہمارے کسی خواب کو نامکمل چھوڑ دیں اور ہم کو اندھیرے منہ نو دس بجے دن کو اٹھا کر بٹھا دیں۔ ہمارا جب تک جی چاہے گا سویا کریں گے چاہے ہفتوں سوتے رہیں یا مہینوں سو کر نہ اٹھیں۔ پھر یہ بھی کوئی ضروری بات نہ ہوگی کہ سو کر اٹھے تو منہ بھی دھوئیں ورنہ چائے نہ ملے گی۔ یہ تمام پابندیاں تو اس بیگم والی دنیا اور شوہرانہ زندگی تک ہیں۔ جنت میں تو ہمارا منہ اپنا ذاتی منہ ہوگا خواہ اس کو دھوئیں یا نہ دھوئیں اور چائے بے چاری کی تو خیر کیا مجال ہے کہ وہ اپنے لیے ہمارا منہ دھلوائے بلکہ جہاں تک چائے کا تعلق ہے وہ تو سوتے میں بھی ہم پی سکیں گے۔ اس لیے کہ چائے کی

خواہش کو پورا کرنا ہمارا کام نہ ہوگا بلکہ یہ خود چائے کا فرض ہوگا کہ وہ وقت مقررہ پر ہماری اس طلب کو پورا کرے یعنی وہ خود ہی ہمارے معدے میں اپنی ذمہ داری کے ساتھ پہونچا کرے گی۔ مثلاً فرض کر لیجیے کہ ہم سو رہے ہیں تو محض چائے کے لیے بیدار ہونا اور اپنی نیند میں خلل ڈالنا نہ پڑے گا بلکہ چائے کا فرض ہوگا کہ وہ خود ہی بنے، بن کر کیتلی سے دم کھاتی ہوئی پیالی میں آئے۔ پھر وہ پیالی اس چائے کو لے کر ہمارے بستر تک دبے پاؤں آئے گی اور نہایت احتیاط کے ساتھ لحاف کے اندر پہونچ کر ہمارے لبوں سے لگ جائے گی تاکہ چائے اس پیالی سے نکل کر ہمارے لبوں سے ہوتی ہوئی آہستہ آہستہ حلق کے نیچے اتر جائے اور ہم کو خبر بھی نہ ہو۔ اسی طرح چائے کے ساتھ کا ناشتہ اپنے فرائض منصبی کو خود ہی محسوس کرے گا۔ مطلب کہنے کا یہ کہ یہ تو خیر ایک آدھ مثال تھی جو ہم نے پیش کر دی ورنہ عام طور پر تو یہ ہوگا کہ ہم خود کسی کام کے لیے کبھی مجبور نہ ہوں گے بلکہ ہر کام خود ہمارے لیے جنت میں مجبور ہوگا۔ اور کسی قسم کے کسی قاعدہ یا قانون کی پابندی ہم پر فرض نہ ہوگی بلکہ ہر قاعدہ اور قانون ہمارا پابند ہوگا۔

اب جاڑے کے زمانہ میں نہانے ہی کو لے لیجیے کہ بیگم ناک میں دم رکھتی ہیں۔ اور دسمبر یا جنوری کے زمانہ میں بھی ان کو ذرا بھی ترس نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کو مر مر کے نہانا پڑتا ہے۔ لیکن جنت میں یہ ظلم ہم پر نہ ہو سکے گا۔ وہاں تو جب ہم چاہیں گے بغیر غسل کیے غسل کی تازگی اپنے اوپر طاری کر لیا کریں گے۔ خواہ وہ دسمبر اور جنوری کا زمانہ ہو یا مئی اور جون کا موسم اور جب یہ صورت ہمارے اختیار میں ہوگی تو اس کے بعد آپ ہی بتایئے کہ بلاوجہ غسل کرنا وقت برباد کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ بیگم ہمارے ان اختیارات کو دیکھیں گی اور تعجب کریں گی۔ اور صرف یہی کیا ان کو تو سب سے زیادہ چڑھ ہے ہمارے تاش کھیلنے سے۔ یہاں تک کہ گھر میں کبھی کوئی

تاش کا پیکٹ رہنے ہی نہیں پاتا اور اگر کبھی ہم نے تاش کی ایک آدھ بازی برس چھ مہینے کے بعد کھیل لی تو اتنے ہی دنوں تک اس کی جواب دہی بھی کرنا پڑتی ہے اور اٹھتے بیٹھتے ہر وقت طعنے سنتے ہیں۔ مگر جنت میں دیکھیں وہ کیسے کر منع کرتی ہیں۔ وہاں ہمارے اختیار میں ہوگا کہ جب چاہیں نظر بندی سے کام لے کر ان کی نظر باندھ دیں اور خود نہایت اطمینان سے تاش کھیلیں ہم تاش کھیلیں گے۔ اور وہ دیکھیں گی کہ ہم کوئی نہایت اہم مسئلہ لے کر چند عالی دماغوں کے درمیان سلجھانے کو بیٹھے ہیں۔ اسی طرح ہم شطرنج میں دن دن بھر مصروف رہیں گے اور ان کی سمجھ میں یہی آئے گا کہ ہم کوئی ہنگامہ خیز کتاب لکھ رہے ہیں۔ مگر آپ بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ایک قسم کی چوری ہوئی اور چوری کی ضرورت پیش آئی بیگم سے مرعوب ہونے کے بعد لہٰذا جانے دیجیے اس نظر بندی اور سمجھ بندی کی ترکیبوں کو۔ مگر آپ کے پاس اس کا کیا علاج ہے کہ ہماری جنت کی آب و ہوا میں بیگم کے دماغ کی اصلاح اس حد تک ہوجائے گی کہ وہی تاش جس کا نام سن کر وہ آگ بگولہ ہوجاتی ہیں۔ جب ہم کھیلنا چاہیں گے تو بیگم نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ کہیں گی۔

”آپ نے تو تاش کھیلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں تو خود غور کر رہی تھی کہ آخر آپ کو تاش کی طرف کیوں کر متوجہ کیا جائے۔“

اور جب ہم تاش کھیل چکیں گے تو وہ پھر گلاب کی طرح شگفتہ ہوکر کہیں گی کہ ”ایک بازی اور کھیل لیجیے میری خاطر سے سہی دیکھیے آپ کو میری ہی قسم ہے۔“ رہ گئی شطرنج یعنی وہ منحوس کھیل جس کو کھیلنے کے معنی بیگم کے نزدیک یہ ہیں کہ گھر سے برکت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے، رحمت کے فرشتے اس منحوس گھر کا راستہ بھول جائیں اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ گھر جس میں شطرنج کھیلی گئی ہو، اس طرح تباہ و برباد ہوجائے کہ بہار کے زلزلہ کی تمام تباہیاں عبرت سے اس گھر کا منہ دیکھیں۔ مگر

اسی شطرنج کے لیے بیگم نہایت ہی اہتمام کریں گی۔ ہاتھی دانت کے مہرے بنوائیں گی۔ سنگ مرمر کی میز پر اس کی گنگا جمنی بساط ہوگی۔ اور مہروں میں یہ خوبی ہوگی کہ ہر مہرہ اپنا نام خود سمجھے گا۔ اور زبان سے نام لیتے ہی اپنی چال چلا کرے گا۔ بیگم ہم سے شطرنج کھیلنے کے تقاضے کیا کریں گی اور ہم بیگم سے آنکھ بچا کر ان کو میکے بھیج کر یا چھپ چھپ کر دوستوں کے یہاں شطرنج نہ کھیلیں گے بلکہ بیگم کے زیر اہتمام خود ان ہی کے ساتھ دن رات شطرنج ہوا کرے گی۔

گھومنے کے سلسلہ میں حال یہ ہے کہ بیگم چاہتی ہیں کہ ہم دفتر جانے سے پہلے اور دفتر سے واپسی پر بس ان ہی کی خدمت میں حاضر رہا کریں۔ وہ ڈلی کاٹتی جائیں اور اپنے پرائے آئے گئے محلّہ پڑوس والوں کے واقعات اور حالات کے سلسلہ میں بیکار دماغ چاٹیں اور ہم اپنے دماغ کو اس طرح بے عذر ان کے سامنے رہنے دیں گویا دماغ کیا ہے ”ماحضر“ ہے اور یہ سمجھ کر چپ رہیں کہ ع

روزئ خود میخورد برخوان تو

مختصر یہ کہ نہ کہیں سیر کو جائیں نہ گھر کے باہر قدم نکالیں۔ لیکن ہماری جنت میں ہم ہوں گے اور سیر سپاٹا۔ جہاں چاہیں گے، جائیں گے اور جب تک جی چاہے گا، گھومیں گے بلکہ اگر خود ہم نہ جائیں گے تو بیگم ہم کو گھومنے کے لیے بھیجا کریں گی کہ ”جائیے ذرا تفریح ہوجائے گی تازہ ہوا جسم کو لگے گی دماغ تازہ ہوجائے گا۔ اگر آپ تھک گئے ہوں تو سواری منگا دوں اس پر چلے جائیے۔ مگر جائیے ضرور۔“ گویا اب تو ہم باندھ باندھ کر رکھے جاتے ہیں۔ اور اپنی جنت میں گھیر گھیر کر گھومنے پھرنے بھیجے جائیں گے۔ ذرا ہماری جنت کا تصور تو کیجیے کہ کس قدر دلچسپ اور کیسی آزادی کی فضاؤں سے معمور جگہ ہوگی۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ اگر کسی دن کسی حادثہ یا سانحہ کے سلسلہ میں یا کسی عمدہ فلم یا کسی جلسہ کے چکر میں چراغ جلنے کے بعد گھر آنا پڑا

توبس یہ سمجھ لیجیے کی قیامت کا سامنا ہے۔ پھر لاکھ لاکھ سمجھائیے۔ خوشامد کیجیے منت ساجت سے کام لیجیے مگر یہ تو گویا طے ہی ہے کہ بدمعاشی کے خطاب سے نہیں بچ سکتے۔ اور محض یہ اتفاقی تاخیر ایسا سنگین جرم بن جاتی ہے جو قابل دست اندازی ہی نہیں بلکہ مچلکہ اور ضمانت سے بھی کچھ آگے ہی سمجھی جاتی ہے۔ اور تھوڑی دیر کی تفریح جب تک ایک مستقل عذاب میں مبتلا نہیں کر لیتی۔ اس وقت تک گویا ہم کو اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ مگر ہماری جنت میں یہ نامعقول پابندیاں اپنے منحوس قدم بھی نہیں رکھ سکتیں۔ وہاں تو اگر ہر روز عید ہوگی تو ہر شب کو شب برات بننے کا حق بھی حاصل ہوگا۔ راتوں کی جوان تاریکیوں میں ہم اپنے جنتی احباب کو ٹہلایا کریں گے۔ وقت کا دھڑکہ ہمارے لطف کو کرکرا نہ کرے گا۔ بلکہ ہم آزاد ہوں گے کہ جب چاہیں گھر جائیں۔ چھ بجے شام کے بجائے سات بج جانا کیا معنی ہم تو بارہ اور ایک بجے رات کو بھی اگر گھر آئیں گے تو بیگم کو اپنے استقبال کے لیے خوش آمدید لکھی ہوئی شالباف پائیں گے اور وہ مسکرا مسکرا یہی کہیں گی کہ" خدا کا شکر ہے کہ آج میرے سرتاج کا اتنا وقت دلچسپیوں میں گذرا اللہ اس سے زیادہ آپ کو بے فکریاں اپنے خزانہ غیب سے عطا کرے۔" بیگم کے اس خلوص اور خیر مقدم سے ہمارا وہ تمام خون رگوں میں گردش کرجائے گا جو آج کل رات گئے آنے کے جرم میں ڈر کے مارے خشک ہو جاتا ہے۔

پھر ہم اپنی جنت میں اپنی گلاب سے زیادہ شگفتہ بیگم کو جو آج کل پھانسی کا حکم سنانے والے سیشن جج سے زیادہ خشک نظر آتی ہیں اپنی دلچسپیوں کی تفصیل سنائیں گے کہ یوں احباب میں لطف رہا۔ اور یوں ہا ہا ہو ہو میں وقت کٹا اور بیگم جو اس دنیا میں احباب کا نام سن کر مشین گن کی صورت میں مشتعل ہو جاتی ہیں اور جن کی بد دعاؤں سے ہمارے سیکڑوں دوست فائدہ اٹھا کر ع

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

کا سلسلہ بنے ہوئے ہیں وہی بیگم ہمارے ایک ایک دوست کا نام لے لے کر اس کے اور اس کے بال بچوں کو دعائیں دیں گی کہ "یا اللہ اس شخص نے جیسا میرے شوہر کو آج خوش رکھا ہے تو بھی اس کو ایسا ہی خوش رکھنا اور اس کی اس نیکی کا بدلہ تو اس کے بال بچوں کو دینا۔"

پھر ہم ان سے اپنی ان تمام دلچسپیوں کا ذکر کریں گے جن کو اس دنیا میں وہ غیر شریفانہ باتیں، شہدہ پن۔ آوارہ گرد وغیرہ کہا کرتی ہیں مگر ہماری جنت میں ان ہی تمام باتوں کو وہ ہماری شرافت۔ ہماری نیکی اور ہماری نیک چلنی کی علامتیں سمجھیں گی۔ خدا کی پناہ اگر آج کل ہم گھر جا کر یہ کہنے کے بجائے کہ "ہم وعظ سن رہے تھے۔" کہیں یہ کہہ دیں کہ "آج سنیما میں ایک مشہور گانے والی کا گانا سن کر آرہے ہیں۔" تو یقین جانئے کہ ایسی خبر لی جائے کہ پھر خود بھی سرگم الاپنا پڑے۔ مگر یہی بیگم جنت میں ایسی جنتی ہو جائیں گی کہ ہم خود ہی ان سے کہیں گے کہ" آج ایک حور نے ایسا لاجواب گانا سنایا کہ واہ واہ! سچ تو یہ ہے کہ جیسی وہ حسین تھی ویسی ہی حسین آواز بھی پائی ہے۔"

بیگم مسکرا کر کہیں گی۔ "اللہ اس حور کا بھلا کرے جو میرے شوہر کو اس قدر پسند آئی۔"

کیوں صاحب ہم پوچھتے ہیں کہ ہم کو تو خیر چھوڑیئے ہمارے حال پر۔ مگر ہمارے علاوہ بھی ہے کوئی اپنی بیوی کا شوہر جو اس دنیا میں کسی حسین سے حسین عورت کو اپنی بدصورت سے بدصورت بیوی کے سامنے حسین کہہ کر بیوی کے قہر وغضب سے بچ جائے۔ اور ہے کوئی ایسی بیوی اس دنیا کے پردہ پر کسی شوہر کی زوجیت میں جو اپنے شوہر کی پسندیدہ عورت کو اس طرح بیساختہ دعائیں دے۔ مگر یہ صرف ہم ہوں گے اور جنت میں ہماری جنتی بیگم جن سے اس قدر خوشگوار تعلقات ہوں گے۔ وہ خوشگوار

تعلقات جن کے بغیر یہ دنیا جہنم کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ جب ہم اپنی بیگم سے کہیں گے کہ ''بیگم وہ حور ایسی تھی کہ تمہاری ایسی سینکڑوں بیویاں اس پر قربان کردی جائیں۔'' تو بیگم بجائے چلنے کے نہایت اشتیاق کے ساتھ کہیں گی کہ ''میرے سرتاج آپ کے انتخاب پر قربان ہوجانا میرا اور آپ کی سینکڑوں بی بیوں کا فرض ہے۔'' بیگم کے الفاظ پر ہم جھوم جائیں گے اور آخر ان سے کہہ دینا پڑے گا کہ ''اے وفا کی دیوی جنت کی تمام حوریں تجھ پر قربان۔'' بیگم کی آنکھوں میں مسرت کے آنسوں ہوں گے اور ہمارے دل میں بیگم کی دہشت نہیں بلکہ طوفانی محبت۔ یہ ہوگی ہم غرباں مئوشوہر کی جنت۔

شوہر یا ایڈیٹر

ہم کو اس کا اعتراف ہے کہ ہم ایک شوہر ہیں اور ہم اس کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ ہم ایک ایڈیٹر ہیں۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کے نزدیک ہم صرف شوہر ہیں اور اخبار کے ڈائریکٹر صاحب مجھ کو محض ایڈیٹر سمجھتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ بیگم صاحبہ اور ڈائریکٹر صاحب دونوں اپنی جگہ پر ایسے مستحکم دلائل رکھتے ہیں کہ اب میں خود اس فکر میں ہوں کہ دراصل میں ایڈیٹر ہوں یا شوہر؟ اور اگر صرف ایڈیٹر ہوں تو شوہر کیسے ہوسکتا ہوں؟ اور شوہر ہوں تو ایڈیٹر کیوں کر بنا ہوا ہوں؟ یعنی ع

اگر نہیں ہوں تو کیوں اور ہوں تو کیا ہوں میں

بیگم صاحبہ کا دعویٰ یہ ہے کہ میں دراصل شوہر ہوں اور ایڈیٹر محض ایک معاشی ذریعہ ہے۔ یعنی وہ یہ کہتی ہیں کہ اگر میں ایڈیٹر نہ ہوتا تو بھی شوہر ضرور ہوتا۔ یعنی معاشی حیثیت سے تو یہ ممکن تھا کہ اگر میں ایڈیٹر نہ ہوتا۔ تو فلم ایکٹر ہوتا۔ فلم ایکٹر نہ ہوتا تو بڑھئی ہوتا۔ بڑھئی نہ ہوتا تو زردوز ہوتا۔ مختصر یہ ہے کہ سب ہی کچھ ہوسکتا تھا مگر شوہر ہونا برحق تھا۔ اور بحیثیت ایک شوہر کے میرے لیے یہ ناممکن تھا کہ میں کچھ اور ہوسکتا یعنی کچھ ہوتا یا نہ ہوتا مگر شوہر تو ہونا ہی پڑتا۔ لہٰذا ثابت یہ ہوا کہ شوہر ہونا اصل حقیقت ہے اور یہ ایڈیٹری محض ایک ضمنی حیثیت ہے۔ ان مستحکم دلائل کے بعد اب ڈائریکٹر صاحب کے دعوے کو ملاحظہ فرمائیے کہ وہ بھی اپنی جگہ پر ایک ناقابل انکار

استحکام کا حامل ہے۔ان کا خیال یہ ہے کہ شوہر ہونا تو گویا ایک نجی اور گھریلو بات ہے مگر اس خاکسار کی عملی اور ذمہ دارانہ حیثیت یہ ہے کہ یہ خاک بسر ایڈیٹر ہے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ میری شوہرانہ حیثیت میری ایڈیٹرانہ حیثیت کی منت پذیر ہے یعنی اگر میں ایڈیٹر نہ ہوتا تو جس آسانی کے ساتھ موجودہ اہل خانہ کا شوہر بن گیا ہوں نہ بن سکتا یہ تو ممکن تھا کہ میں ان بیوی کا نہ سہی کسی اور بیوی کا شوہر بن جاتا۔اور شوہر ہونے کے لیے کسی خاص کاوش کی ضرورت نہ تھی اس لیے کہ ع

تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

گویا یہ تو ایک ایسی معاملت تھی جو بغیر ہاتھ پیر ہلائے بھی ممکن تھی۔مگر یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جو شخص ایڈیٹر ہونے والا ہوتا ہے وہ دنیا کے کسی اور کام کا نہ ہو یعنی جو دنیا میں کچھ نہیں کر سکتا وہ ایڈیٹری کر سکتا ہے۔چنانچہ اس بے روزگاری کے دور میں بے روزگاروں کی جس قدر سرپرستی صحافت نے کی ہے شاید ہی کسی اور شعبہ نے کی ہو۔ مختصر یہ کہ ڈائریکٹر صاحب کے نزدیک شوہرانہ حیثیت واہیات ہے۔البتہ ایڈیٹرانہ حیثیت ہی صرف میری واحد حیثیت ہے۔

ڈائریکٹر صاحب اور بیگم صاحبہ کے اس اختلاف خیال کے بعد خود ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ حیثیتیں یہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر اہمیت رکھتی ہیں اور کسی ایک سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔مگر فرق یہ ہے کہ ایڈیٹری حیلہ روزی ہے اور بیوی بہانہ موت، اب یہ سمجھئے کہ اگر روزی اور موت دونوں ایک دوسرے کے دوش بدوش برحق ہیں تو ایڈیٹرانہ حیثیت اور شوہرانہ حیثیت کا اجتماع ضدین بھی انگیز کرنا ہی پڑے گا۔اور دونوں کی اہمیت کا ایک ہی سانس میں اعتراف کرتے ہیں بن پڑے گا۔خیر وہ تو عورت ذات ہیں ان کا کیا سوال جبکہ ڈائریکٹر صاحب کا ایسا جہاندیدہ مرد ہماری شوہرانہ حیثیت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔اور ان دونوں کی ناسمجھی نے اس

خاکسار من ابتدائے شوہر لغایت ایڈیٹر کو عجیب دوعملی میں مبتلا کر رکھا ہے اور روز بروز اب تو یہی خیال دماغ میں جڑ پکڑتا جاتا ہے کہ خدا جس کو ایڈیٹر بنانے والا ہو اس کو اپنی قدرت کاملہ کے صدقہ میں شوہر نہ بنائے۔اور اگر شوہر بنانا مشیت ایزدی ہی ہو تو اس شوہر کو خواہ کچھ بنا دے ایڈیٹر نہ بنائے۔مگر ایک سوال یہ ہے کہ اگر یہ دعا مقبول بھی ہوگئی تو آئندہ نسلوں کے کام آئے گی۔ہم آخر کیا کریں جو بیک وقت شوہر بھی ہیں اور ایڈیٹر بھی۔

اخبار کا دفتر ایڈیٹر بن کر بیٹھنے کی جگہ ضرور ہوتا ہے مگر ایڈیٹری کرنے کی جگہ قطعاً نہیں ہو سکتا۔اس لیے کہ وہاں تو صبح سے شام تک ایڈیٹر صاحب سے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے جو قدم بوسی۔اذیّت کوشی اور دماغ نوشی کے لیے برابر آتے جاتے رہتے ہیں۔کوئی صاحب محض شرف نیاز حاصل کرنے کے لیے چلے آئے۔ کسی صاحب سے گھر میں لڑائی ہوئی تو غم غلط کرنے کے لیے ایڈیٹر صاحب پر نازل ہو گئے۔کسی صاحب کو کسی لیڈر کی کوئی بات بری معلوم ہوئی تو ایڈیٹر سے باز پرس کرنے کے لیے آ موجود ہوئے۔کوئی صاحب جنرل فرانکو سے ناراض ہو کر ایڈیٹر کو ڈانٹنے آ رہے ہیں۔تو کوئی کسی ملکی تحریک سے بدعقیدہ ہو کر ایڈیٹر کو چیلین دینے کے لیے آتے ہیں۔مختصر یہ کہ اخبار کا دفتر میں ایڈیٹر کا کمرہ تو گویا ”خانہ انوری“ ہوتا ہے کہ ہر بلا جو آسمان سے نازل ہوتی ہے اسی کا پتہ پوچھتی ہے۔لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ ادارت کے تمام فرائض تو گھر کے کسی خاموش گوشہ میں بیٹھ کر انجام دیئے جائیں اور دفتر میں محض ایڈیٹر بن کر بیٹھا جائے۔ڈائریکٹر صاحب بھی یہی چاہتے ہیں اور خود ہمارا خیال بھی یہی ہے۔مگر گھر کا حال یہ ہے کہ دن بھر کے بعد جب ہم دفتر سے گھر پہونچتے ہیں تو بیگم صاحبہ ہمارے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ سمجھتی ہیں۔اور سیاسیات میں الجھے اور تھکے ہوئے دماغ کو گھریلو معاملات اور خاندانی مناقشات

سے متاثر ہ کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ہم تو بیٹھے قلم دوات لے کر تحریک وحدت العرب پر ایک زبردست لیڈنگ آرٹکل لکھتے اور انھوں نے بکمال محبت تشریف لا کر فرمایا۔

"کیا اس وقت بھی کچھ لکھتا ہے؟"

ہم نے ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر پائنیر کے صفحات میں منہ چھپا کر کہا۔ "ہوں۔" مگر چونکہ ان کو اس "ہوں" سے اطمینان نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا زور دیتے ہوئے دریافت کیا۔ "بھائی جان کو کوئی خط لکھئے گا۔ میرا اسلام بھی لکھ دیجیے گا اور سلمان کو بھی پوچھ دیجیے گا۔"

ہم نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔ "اچھا لکھ دیا جائے گا۔"

بیگم نے اس خیال سے کہ شاید ہم وحدت العرب بھائی جان کو خط لکھتے ہوئے سلمان کو پوچھنا نہ بھول جائیں۔ مزید تاکید کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے ان کا خط آئے ہوئے عرصہ ہو چکا ہے۔ بے حد خفا ہوں گے اور خفگی کی بات بھی ہے۔ اب ان کا آخر ہے کون جو کچھ بھی ہیں آپ ہی ہیں۔ اور آپ کا یہ حال ہے کہ یہ کمبخت دفتر سر اٹھانے کی مہلت نہیں دیتا۔ ایسی بھی کیا نوکری کہ آدمی دنیا کے کام ہی کا نہ رہے بس اسی کا ہو کر رہ جائے۔"

بیگم کے ان الفاظ کی آواز تو بیشک کانوں میں جا رہی تھی مگر معنی اور مفہوم سمجھنے کے لیے دماغ کا جو حصہ مخصوص ہے اس میں ایران، افغانستان، ترکستان، عراق اور البانیہ وغیرہ بسے ہوئے تھے۔ لہٰذا ہم نے یکا یک چونک کر کہا۔ "متحدہ محاذ کی ضرورت ہے۔"

بیگم نے حیرت سے کہا۔ "کس چیز کی ضرورت ہے؟"

ہم نے اپنے ہوش میں آ کر کہا۔ "ایں کیا کہا؟"

بیگم نے ہنس کر کہا۔ "اے واہ خود ہی کچھ کہا اور خود ہی سوال کر رہے ہیں۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ بھائی جان کو خط ضرور لکھ دیجیے گا۔ اور اس میں یہ بھی لکھ دیجیے گا کہ باجی نے جس فراک کی پیمائش دی تھی۔ وہ درزی نے کھو دی ہے۔ اب شہر بانو کی ناپ پھر سے بھیج دیں تو اچھا ہے اور ہاں یہ بھی لکھئے گا کہ قوام پہونچا یا نہیں......"

وہ خط کا مضمون بتاتی رہیں اور ہم پھر اخبار پڑھتے پڑھتے ان کی طرف سے غافل ہو کر طہران اور استنبول پہونچ گئے۔ اللہ جانے انھوں نے کیا کیا کہا ہو گا کہ یکا یک ان کے آخری الفاظ کہ "میل جول رکھنے سے میل جول رہتا ہے۔" دماغ میں اس طرح گونجے کہ ہم نے بھی الفاظ کی پوری قوت کے ساتھ کہا۔ "بیشک اتاترک اور رضا شاہ کو اس وقت بیدار ہونا چاہیے۔"

بیگم منہ کھول کر رہ گئیں اور ہم نے ان کو دیکھ کر اپنی اس گمشدگی اور ازخود رفتگی کا احساس کرتے ہوئے ہنس کر کہا "نہیں سمجھیں؟ میرا مطلب یہ ہے کہ میں اس وقت اخبار کا کام کر رہا ہوں۔ اور آپ ہیں کہ خدا جانے کیا ارشاد فرمائے جاتی ہے۔"

بیگم نے جل کر کہا۔ "چولھے میں گیا اخبار۔ ہر وقت اخبار۔ ہر وقت اخبار۔ اخبار نہ ہوا جان کا عذاب ہو گیا۔ اب آپ اخبار ہی اوڑھا اور اخبار ہی بچھایا کیجیے۔"

ہم نے گھر میں پھوٹ پڑتے ہوئے دیکھ کر وحدت العرب کے مسئلہ کو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر دیا اور بیگم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "سنئے تو سہی۔ میرے خیال میں آپ نے آج تک یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ میں ایڈیٹر ہوں اور ایک ایڈیٹر ہر وقت اڈیٹر ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسے وقت میں تو وہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا جب کہ اس کے دماغ میں کوئی مقالہ افتتاحیہ کروٹیں لے رہا ہو۔ چنانچہ اس وقت ایڈیٹوریل لکھنے والا ہوں۔ دماغ میں وہی خیالات بھرے ہوئے ہیں اور آپ خدا جانے کیا فرما رہی ہیں۔ میں ذرا یہ مضمون لکھ لوں تو بسر و چشم تعمیل حکم کروں گا۔"

بیگم نے سمجھنے کی کوشش کرنے سے گویا صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ پوچھتی ہوں کہ جب گھر پر بھی آپ کو کام کرنا پڑتا ہے تو آخر دفتر کی حاضری کیوں ضروری ہے؟ اور اگر دفتر کی حاضری ضروری ہے تو گھر پر آخر آپ کیوں کام کرتے ہیں؟ کیا آپ چوبیس گھنٹہ کے ملازم ہیں اور گھر والوں کا کوئی حق آپ پر نہیں ہے کہ دو گھڑی گھریلو معاملات پر بھی کوئی بات چیت ہو سکے۔''

ہم نے کہا۔ ''بیگم یہ بات نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دفتر میں آنے جانے والوں کا اس قدر ہجوم رہتا ہے کہ وہاں یکسوئی کے ساتھ کچھ لکھا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا وہاں تو صرف لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں اور معمولی معمولی کام انجام پاتے ہیں۔ مگر ایڈیٹوریل نہایت اہم چیز ہوتا ہے اور اس کو لکھنے کے لیے پوری یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ اہم کام گھر کے لیے اٹھا لاتا ہوں غالباً اب آپ سمجھ گئی ہوں گی۔''

بیگم نے کہا۔ ''سمجھ تو گئی مگر صحت بھی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ آخر دماغ کو کسی وقت آرام کی ضرورت ہے یا نہیں؟''

ہم نے کہا۔ ''ضرورت تو ہے مگر اس وقت آپ لکھ لینے دیں اس کے بعد اس سلسلہ میں بھی یکسوئی کے ساتھ تبادلۂ خیال ہو جائے گا۔''

بیگم صاحبہ نے ہمارا رخ لکھنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا آپ لکھیے مگر روز روز کا یہ جھگڑا ٹھیک نہیں ہے۔''

بیگم صاحبہ تو خیر یہ کہہ کر چلی گئیں اور ہم نے موقع غنیمت جان کر جلدی جلدی لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن ابھی تمہیدی فقرے بھی ختم نہ ہونے پائے تھے کہ بڑے صاحبزادے اپنا کوک کا موٹر لیے ہوئے تشریف لائے اور اس میں کوک بھر کر ہمارے کانوں کے پاس جو اس کو چھوڑا ہے تو معلوم یہ ہوا کہ حکومت ترکیہ کا کوئی ہوائی جہاز

عین ہمارے کان کے اندر گر پڑا ہے۔ ہم یکایک چونک پڑے اور ہمارے اس چونکنے پر صاحبزادے کو ایسی تفریح ہوئی کہ وہ قہقہہ بلند کرتے ہوئے ہماری گود میں آ گرے اور اس وقت ہماری سمجھ میں آیا کہ ہم دُول اسلامیہ کے متحدہ محاذ پر نہیں بلکہ غریب خانہ میں ہیں۔ اور یہ جو کچھ واقعہ ہوا ہے وہ میدان جنگ میں نہیں بلکہ گھر ہی پر بندہ زادہ کے ہاتھوں ہوا ہے لہٰذا اس کو ڈانٹ کر کہا۔ ''کیا کرتے ہے۔ یہ کیا شرارت ہے؟'' صاحبزادے نے کہا۔ ''آپ سمجھے ہوں گے کہ ریل گاڑی کان میں گھس گئی۔''

ہم نے بدستور غصہ میں کہا۔ ''بھاگ جاؤ یہاں سے بدمعاش ہم کام کر رہے ہیں۔''

صاحبزادہ نے کہا۔ ''اچھا تو پیسہ دیجیے۔''

ہم نے غصہ میں کہا۔ ''جاؤ یہاں سے نہیں تو کان لیتے ہیں ہم تمہارے، بیوقوف کہیں کا۔''

صاحبزادے نے وحدت العرب کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے مچل کر کہا۔ ''پیسہ دیجیے'' ایسے ضدی بچوں سے خدا بچائے۔ اب بتائے کہ اس وقت ہمارا کیا حال ہوگا۔ جی چاہتا تھا کہ ان صاحبزادے کو سر سے اونچا اٹھا کر دے ماریں یا خود اپنی بوٹیاں نوچیں۔ غصہ میں جلبلا کر ہم نے قلم تو رکھ دیا اور اٹھ کر صاحبزادہ کا کان جو پکڑتے ہیں تو انھوں نے اپنے دہانہ کو پوری وسعت کے ساتھ کھول کر وہ فلک شگاف نعرۂ احتجاج بلند کیا ہے کہ مسئلہ وحدت العرب تو خیر دماغ سے نکل ہی گیا مگر بیگم صاحبہ کے خلاف جو محاذ اتفاقی طور پر تیار ہو گیا تھا۔ اس نے دماغ کو اور بھی پریشان کر دیا کہ اب اگر وہ آ گئیں تو کیا جواب دیں گے۔ چنانچہ جو خطرہ تھا وہ پورا ہوا یعنی صاحبزادے کی آواز سن کر وہ آموجود ہوئیں اور آتے ہی ہم سے پوچھا۔ ''یہ

کیوں رویا؟"

ہم نے کہا۔"اسی سے پوچھیے کہ اس کو کس نے رلایا ہے۔"

بیگم نے بغیر اس سے پوچھے ہوئے کہا۔"اس سے کیا پوچھوں آخر آپ بتاتے کیوں نہیں۔"

ہم نے ایک اقراری مجرم کی طرح کہا۔"اس نے خود ہی ضد کی اور خود ہی مچل گیا۔اب جو میں نے پیار کرنے کے لیے اٹھایا تو لگا رونے۔"

صاحبزادے نے حلق پھاڑ کر کہا۔"پیار کب کیا۔ ہمارے کان پکڑ کر مروڑ دیئے۔"

بیگم نے ہماری صورت دیکھی تو ہم کو ہنسی آگئی۔ بیگم نے اس کو اعتراف جرم سمجھتے ہوئے کہا۔"کیا اچھے معلوم ہوتے ہیں آپ کہ بچوں سے لڑتے ہیں۔اب آپ ہی اس کو منائیے۔"

ہم نے اپنے ایڈیٹوریل کی طرف سے صبر کرتے ہوئے کہا۔"منا تو رہے ہیں یہ لکھنے بھی تو نہیں دیتا۔"

بیگم نے کہا۔"ہاں تو آخر کب تک لکھتے رہے۔ دن بھر تو آپ کو دیکھتا نہیں ہے اور اس وقت بھی آپ آتے ہیں تو کونے میں منہ ڈالے ہوئے لکھ رہے ہیں آخر اس کا بھی تو کچھ حق ہے۔"

ہم نے کہا۔"بہتر ہے۔اس حق کی جس طرح کہیے ادائیگی کروں۔"

صاحبزادہ نے خود ہی کہا۔"ہم کو گھمانے چلیے گا۔نہیں تو ہم سے دوستی نہیں ہو سکتی۔"

ہم نے ایڈیٹوریل کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔"چلو بازار چلیں۔"

اب آپ ہی بتائیے کہ اس وقت تو ایڈیٹوریل یوں رہ گیا۔اور بیوی بچوں کی نذر ہو گیا۔ دوسرے دن جو دفتر پہنچے تو حسب معمول ملنے والوں ہجوم پایا۔ اب جو ایڈیٹوریل کو مکمل کرنے کے لیے چپراسی سے کہا کہ کسی کو کمرے میں نہ آنے دو تو ڈائریکٹر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔"کیا آج گھر پر ایڈیٹوریل نہیں لکھا تھا؟"

ہم نے کہا۔"کیا بتائیں صاحب خانگی جھگڑے اور بیوی بچوں کے قصے مہلت نہیں دیتے۔"

ڈائریکٹر صاحب نے ان جھگڑوں کو معمولی سمجھتے ہوئے کہا۔"آپ بھی ان گھریلو باتوں کو اہمیت دیتے ہیں یہ سب قصے تو ہوا ہی کرتے ہیں۔"

ہم جلے ہوئے تو تھے ہی لہٰذا ان سے ترکی بہ ترکی کہا۔"خدا کرے آپ کی شادی ہو اور ان جھگڑوں سے آپ کو پالا پڑے۔"

ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔"شادی کیا پھر سے ہو گی۔شادی تو ہو چکی ہے اور بیوی بھی وطن میں ہے مگر یہ جھگڑے وگڑے کچھ نہیں ہیں۔"

ہم نے کہا۔"ہاں تو ملاح در چین کشتی در فرنگ، جھگڑا کیا خاک ہو۔"

ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔"آپ بھی میری پیروی کریں۔اور بال بچوں کو وطن پہونچا دیں نا۔"

اب بتائیے کہ اگر یہ مشورہ بیگم سن پائیں تو کیا ہماری ایڈیٹری اور یہ ملازمت رہ سکتی ہے۔ وہ فاقہ کشی کر لیں گی مگر یہ نوکری نہ کرنے دیں گی۔جس میں بیوی کو وطن میں رکھنے کے مشورے دیئے جاتے ہوں۔

حادثات

۳۷ء ہمارے لیے مبارک و مسعود ثابت ہوا یا نامبارک و منحوس اس کا فیصلہ محض حادثات کی تفصیل سننے کے بعد آپ خود کرلیں گے۔

ہم خود اپنی زبان سے کیا کہیں۔ اس سال کے پہلے مہینہ کا پہلا ہی ہفتہ تھا کہ عزیز از جان ٹائیگر کو کھانسی شروع ہوئی اور اس کھانسی کی اطلاع ہم کو اس وقت ہوئی جب کہ مرض اپنے ابتدائی مدارج طے کر کے استحکام کی منزل تک پہونچ گیا تھا۔ ہم ٹھہرے ملازمت پیشہ آدمی صبح اٹھ کر دفتر چلے جاتے تھے۔ اور شام کے قریب اس طرح تھکے ماندے گھر پہونچتے تھے کہ خود اپنا ہوش نہ ہوتا تھا۔ رہ گئیں بیگم انھوں نے ٹائیگر غریب کو ہمیشہ ایک کم حقیقت کتا سمجھا۔ اور اس کی محبت کی کبھی قدر نہ کی۔ ان کے نزدیک ٹائیگر کی بیماری گویا کوئی بات ہی نہ تھی لہٰذا وہ بھلا کیوں ذکر کرتیں۔ آخر ایک روز ہم نے خود ٹائیگر کو مضمحل دیکھ کر بیگم سے پوچھا۔ ''یہ ٹائیگر آج کچھ پژمردہ سا نظر آرہا ہے۔ آخر کیا بات ہے؟''

بیگم نے ناک بھوں چڑھا۔'' کر کہا! کھانسی ہوگئی ہے کمبخت کو؟''

ہم نے محسوس کیا کہ گویا کسی نے کلیجہ پر گھونسہ مارا اور تڑپ کر پوچھا کب سے کھانسی ہے اس کو۔

بیگم نے لاپروائی سے کہا۔ ''اب مجھے دن تو یاد نہیں ہے ہاں کوئی سات آٹھ

روز سے کھانسی ہوگئی ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''اور نہ کوئی دوا نہ کوئی پرہیز۔''

بیگم نے تنفر سے کہا۔ ''یہ چو چلے آپ ہی کو آتے ہیں۔''

ہم نے واقعی متفکر ہو کر کہا۔ ''یہ مرے گا یا جئے گا۔''

بیگم نے جل کر کہا۔ ''مرے موا یا جئے میں کیا جانوں۔''

ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ رفیقۂ حیات کی اس سرد مہری نے ہمارا دل توڑ دیا۔ خدا جانے ٹائیگر نے جب یہ الفاظ سنے ہوں گے تو اس غریب کے احساس کو کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی۔ بہرحال ہم نے ٹائیگر کو چمکار کر بلایا اور اس کا طبی معائنہ جس حد تک خود کر سکتے تھے کیا۔ وہ یقیناً کمزور ہوگیا تھا اور اس کے تنفس میں ایک خاص قسم کی تشویش انگیز کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ پھیپھڑوں کی آواز بھی صاف نہ تھی اور دل کی حرکت بھی کبھی کبھی اس قدر تیز ہو جاتی تھی کہ گویا سول سروس کپ کی ریس ہے اور کبھی اس قدر سست کہ گویا۔

ایک کچھوے کے آگئی جی میں
کیجیے سیر و گشت خشکی میں

بہرحال ٹائیگر کی یہ حالت دیکھ کر ہم کو سخت تشویش پیدا ہوگئی اور رات جوں توں گذار کر صبح ہی ہم اس کو لے کر ڈاکٹر صاحب کے پاس پہونچے اور ان کو مریض کا تمام حال سنا کر خوب اچھی طرح معائنہ کرایا۔ اس کے بعد ان کے مجوزہ نسخہ کو نہایت احتیاط کے ساتھ استعمال کرانے لگے۔ انتہائی پرہیز بھی ہوتا رہا اور تیمارداری میں بھی کوئی کسر ہم نے اٹھا نہ رکھی۔ یہاں تک کہ دو ایک روز کی رخصت بھی ہم کو لینا پڑی۔ مگر غریب ٹائیگر کا وقت آچکا تھا لہٰذا ع

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

اور آخر کار ہمارے ٹائیگر نے ہم کو تڑپتا ہوا چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا۔ ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ ٹائیگر آنجہانی بظاہر ایک کتا تھا مگر اس کا شجرہ ہمارے پاس محفوظ ہے جو اصحاب کہف کے کتے سے تو خیر نہیں ملتا تھا مگر وہ ایک نجیب الطرفین گرے ہاؤنڈ ضرور تھا۔ اور ہم سے جو خاص محبت اس کو تھی اس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ اس وقت بھی اس کی تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم رہی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سامنے کھڑا ہوا اپنی دم کی جنبشوں اور اپنی کمر کی لطیف لچک کے ساتھ زبان نکالے ہوئے ہانپ ہانپ کر اعلان خلوص کر رہا ہے۔ اب اس کی گردن کا پٹا اس کی زنجیر اور اس کے کھانے کے برتن دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ گھر بغیر اس کے ویران نظر آتا ہے کان اس کی آواز کے لیے ترس کر رہ گئے ہیں وہی آواز جس سے پہلے تمام گھر گونجا کرتا تھا۔

-x-x-

ٹائیگر کا داغ اٹھائے ہوئے ابھی مشکل سے ایک مہینہ گزرا ہوگا کہ خدا جانے کون ظالم ہماری بائیسکل غائب کر لے گیا۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ گویا ہمارے پیروں کے نیچے کی زمین نکل گئی۔ آہ کیا زمانہ تھا وہ بھی ہم اپنی گمشدہ بائیسکل پر ادھر سے اُدھر فراٹے بھرتے ہوئے نظر آتے تھے مگر اب ہم ہیں اور بائیسکل کی تلاش میں پاپیادہ کوچہ نوردیاں۔ ڈھونڈھتے تھک چکے ہیں۔ اور تھکنے کی بات بھی ہے کہ بائیسکل کو پیدل ڈھونڈھا جائے۔ ہم تو خیر اس کے ملنے کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں مگر خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے پولیس کے اس سائیکل اسٹاف کو جو برابر ہم کو بھی تلقین صبر کر رہا ہے کہ بائیسکل ضرور مل جائے گی۔ البتہ یہ طے نہیں ہے کہ ہماری زندگی میں ملے گی یا اس کے بعد بہرصورت ایک موہوم سی امید ہے

جو زندگی کی سہارا بنی ہوئی ہے ورنہ یقین جانئے کہ جب بائیسکل پر سوار ہو کر لوگ ہمارے سامنے سے گزرتے ہیں تو کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ خدا جانے اب ہماری بائیسکل کہاں ہے۔ اور کس حال میں ہے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کو ہماری اس بیقراری کی خبر بھی ہے یا نہیں۔ بہرحال ہماری دعا تو یہ ہے کہ وہ جہاں بھی ہو خوش ہو۔ اور خدا اس کو تمام آفات ارضی وسماوی اور تمام امراض ٹیوب وٹائر سے محفوظ رکھے۔ دراصل اس کی گمشدگی کے سلسلہ میں غلطی ہماری ہی تھی کہ ہم نے اس کی کبھی قدر نہ کی اور ہمیشہ بغیر قفل کے نہایت ناقدری کے ساتھ چھوڑ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ کسی قدردان نے اس کو دیکھ لیا اور اپنی عزت وآبرو کو خطرہ میں ڈال کر اس کو لے اڑا۔ ظاہر ہے کہ وہ ہم سے زیادہ مستحق تھا ورنہ بائیسکل کے لیے اپنے کو قابل دست اندازی پولیس ثابت نہ کرتا۔ مگر سچ کہا ہے کسی نے کہ انسان کچھ کھو کر پاتا ہے چنانچہ اب رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ ایک مرتبہ ہماری گم گشتہ بائیسکل مل جاتی اور ہم قفل ڈالنے کے تمام ارمان جی بھر کر پورے کر لیتے۔ مگر آہ اب وہ کہاں! کاش ہماری بائیسکل کے کان ہوتے وہ سن سکتی اور ہم نہایت درد بھری آواز کے ساتھ اپنا فسانۂ فراق ان کو سناتے کہ۔

تمہارے جانے سے کیا ہم پہ بے کلی نہ ہوئی
گئی ہو جب سے یہاں صبح و شام بھی نہ ہوئی

نتیجہ دیکھ لو کوچہ نوردیوں کا ذرا
وہ درد پیر میں اٹھا کہ پھر کمی نہ ہوئی

عجیب دردِ محبت ہے جو ہے ٹانگوں میں
اذیت ایسی ہوئی ہے کہ جو کبھی نہ ہوئی

تمہارے ہجر میں پیدل جو اب گزرتی ہے
ہماری موت ہوئی یعنی زندگی نہ ہوئی

یہ ڈر ہے ہو کے رہے گا اب ہم پہ جرمانہ
کہ وقت پر کبھی دفتر کی حاضری نہ ہوئی

عدم کی راہ بھی پیدل تو ہم سے ہوگی نہ طے
وگرنہ زیست کا کیا تھا ہوئی ہوئی نہ ہوئی

بائیسکلوں کے اس اغوا کے سلسلہ میں اگر لکھنؤ کی پولیس لاہور کی پولیس کی تقلید کرتی تو شاید آج ہم کو یہ دکھڑا نہ رونا پڑتا اور ہمارے پیروں پر یہ بیوگی کا عالم طاری نہ ہوتا۔ لاہور کی پولیس نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جہاں اس نے کوئی بغیر قفل کی بائیسکل رکھی ہوئی دیکھی فوراً اس میں پنکچر کر دیتی ہے۔ پنکچر سے مختلف فائدے ہیں۔ اوّل تو یہ لاپروائی کی ایک سزا ہے اور غیرت داروں کے لیے نہایت کافی انتباہ، دوسرے بائیسکل چوروں کی ہمت بھی ذرا مشکل سے ہو سکتی ہے کہ وہ پنکچر شدہ بائیسکل کو گھسیٹ کر لے جائیں۔ بائیسکل پر بیٹھ کر بھاگ جانا دوسری بات ہے مگر بائیسکل کو اپنے اوپر سوار کر کے بھاگنا ذرا مشکل کام ہے۔ مختصر یہ کہ ہم کو لاہور پولیس کا یہ طریقہ اس قدر پسند آیا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ مستقل طور پر بغرض رفاہ عام بائیسکلوں میں پنکچر کرتے پھرا کریں تا کہ ماجور بھی ہوں اور مصاب بھی۔

-x-x-

ٹائیگر اور بائیسکل کے بعد داد دیجیے ہماری سخت جانی کو کہ ہم ایک تیسرا داغ

بھی اس ایک دل پر کھائے ہوئے زندہ بیٹھے ہیں۔ اور خدا جانے ابھی اور کیا کیا صدمے ہماری قسمت میں لکھے ہوئے ہیں۔ ٹائیگر کی موت اور بائیسکل کے اغوا نے دل ودماغ کو اس حد تک ماؤف کر دیا ہے کہ اگر ہم غم غلط کرنے کی کوشش نہ کریں تو خودکشی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لہٰذا دل بہلانے اور ہر وقت کی غم آگینی کو دور کرنے کے لے شامتِ اعمال ایک مشاعرہ منعقد کر بیٹھے شاعرہ آپ کی دعا سے بے حد کامیاب ہوا۔ مگر مشاعرہ کے اختتام پر معلوم ہوا کہ غزل خواہ کسی کی مقبول ہوئی ہو مگر جوتا ہمارا مقبول ہوا تھا یعنی اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہر طرف پہلے تو اس کو ڈھونڈھا اور آخرکار جوتے سے ہاتھ دھو کر بیٹھ رہے۔ معلوم نہیں کہ جوتے کی رعایت سے ہاتھ دھونا زیادہ صحیح ہے یا پیر دھونا بہر حال اس مسئلہ پر کوئی اہل زبان روشنی ڈالے گا ہم تو صرف اہل پاپوش ہیں۔ بہر حال اپنے جوتے کو حاصل مشاعرہ سمجھنے کے بعد ہم صبر کر کے بیٹھ تو رہے مگر آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ جوتوں اور مشاعروں کا مسئلہ روز بروز اہمیت حاصل کرتا جاتا ہے۔ اور ضرورت اس کی ہے کہ مفکرین وقت اس طرف اپنی توجہ مبذول کریں کہ مشاعروں کی وجہ سے جوتے یا جوتوں کی وجہ سے جوتے یا جوتوں کی وجہ سے مشاعرے کیونکر چھوڑے جاسکتے ہیں۔ حال یہ ہے کہ مشاعروں میں شعراء اور سامعین کے علاوہ ایک خاص جماعت اپنے بوسیدہ جوتے بغرض تبادلہ پہن کر تشریف لاتی ہے۔ اس جماعت کے افراد اپنے بوسیدہ جوتے چھوڑ جاتے ہیں اور جس کسی کا نیا جوتا پیر میں ٹھیک آ جائے پہنتے ہیں اور سر پر پیر رکھ کر بھاگتے ہیں۔ شرکائے مشاعرہ تو شعر سن سن کر جھومنے اور داد دینے میں مصروف رہتے ہیں اور وہاں بے خبری کے عالم میں یہ معاصرانہ تبادلہ تکمیل کو پہونچ جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے جوتے کی گمشدگی کا افسانہ یہ ہے کہ وہ غریبا مئوقسم کا جوتا نہیں ہے بلکہ وہ جوتا جو ڈنر کے لباس کے ساتھ پہنا جائے۔ اس کو ہم نے لب فرش چھوڑ دیا اور خود

انتظامات میں مصروف رہے یہاں تک کہ جب آدھی رات کو مشاعرہ ختم ہوا اور ہم کو جوتے کی ضرورت پیش آئی تو معلوم ہوا کہ وہ موجود نہیں ہے۔ چپکے چپکے ہر ایک کے پیر پر نظر ڈالی اور آخر مایوس ہو کر ایک ایک کا منہ دیکھنے لگے مگر نہ کسی کے پیروں میں جوتے کا پتہ چلا اور نہ کسی کے چہرے پر جوتے کے آثار نظر آئے۔ لہٰذا ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

جب سب لوگ جا چکے تو ہم دیکھتے کیا ہیں کہ ایک گملے کے پیچھے کوئی نہایت خوفناک قسم کا جانور دانت نکالے ہوئے بیٹھا ہے۔ ہم نے دوڑ کر بندوق اٹھالی تا کہ اس جانور کے مہلک حملہ سے اپنے کو محفوظ رکھ سکیں مگر قریب جا کر دیکھا تو دراصل ایک جوتا تھا جو ہمارے جوتے کے نعم البدل کے طور پر ہم کو ملا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کو جوتا کہنا یا جوتا سمجھنا ہی ایک قسم کی زیادتی ہے ورنہ وہ تو جوتے سے زیادہ طاعون زدہ چوہا، مگر مچھ کا بچہ، ہاتھی کا نوزائیدہ لخت جگر یا پھولا ہوا مینڈک معلوم ہوتا تھا۔ گھسی ہوئی ایڑی کے بعد پھیلا ہوا پنجہ اور بگڑی ہوئی نوک کے ساتھ ہی آگے کے ٹانکے اس خوش سلیقگی سے کھلے ہوئے تھے کہ گویا گینڈے کو بیساختہ ہنسی آگئی ہے اور ٹوٹی ہوئی ڈوریوں سے جیبھ اس طرح نکلی ہوئی تھی کہ گویا گرمی کی شدت سے کوئی کتا زبان نکالے ہوئے ہانپ رہا ہے۔ یا گیدڑ منہ چڑھا رہا ہے یا کسی بھوکی بلی کے منہ سے کسی نے چوہا چھین لیا ہے۔ ہم نے الٹ پلٹ کر اس جوتے کے پہلے تو بغور دیکھا اس کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ اگر اس کو بجنسہ عجائب خانہ میں صرف یہ لکھ کر رکھوا دیا جائے کہ ''یہ ایک جوتا ہے'' تو دیکھنے والے اس کو حیرت سے دیکھیں گے۔ اور تعجب سے کہیں گے کہ اگلے زمانے میں بھی لوگ کیسے کیسے جوتے پہنا کرتے تھے۔ بہرحال ہم نے اس جوتے کو نہایت احتیاط کے ساتھ پھنکوا دیا تا کہ اور میونسپلٹی والے اس جوتے

کو دیکھ کر ہمارا چالان نہ کر دیں۔ خیر ہمارا جوتا تو گیا مگر سوال یہ ہے کہ آخر مشاعروں کو جوتا چوروں سے کیوں کر محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ حاضرین مشاعرہ کا محض شرکت مشاعرہ کے لیے برہنہ پا ہو جانا ناممکن ہے اور مشاعروں میں فرشی نشست بھی ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ کرسیوں پر تو مشاعرہ، مشاعرہ نہیں بلکہ راؤنڈ ٹیبل کانفرس کا اجلاس نظر آتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر کوئی ایسا حل دریافت کیا جائے جو مشاعروں اور جوتوں کی اہمیت کو مساوی حیثیت سے ملحوظ رکھے۔ مال عرب پیش عرب والا طریقہ بھی اچھا تھا۔ بشرطیکہ لوگ برہنہ پائی کے مقابلہ میں پاپوش بدست ہونا پسند کر لیتے۔ مگر اس کو عام طور پر اپنی توہین سمجھا جاتا ہے کہ اپنے جوتوں کی حفاظت کی جائے۔ ایک صورت یہ ہے کہ لوگ مشاعروں میں ایسے جوتے پہن کر آیا کریں جو وہ نوکروں کو دینے والے ہوں یا جن کو اس لیے اٹھا رکھا ہو کہ برسات میں پہنیں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسے جوتے کوئی نہ چرائے گا اور اگر ایسے جوتوں کو بھی کوئی لے گیا تو اس چوری کا صدمہ نہ ہوگا۔

مگر مشاعروں میں بن ٹھن کر شرکت کرنے والے اس کو بھی گوارا نہ کریں گے کہ ان کے پیروں پر پائے طاؤس کا شبہ ہو۔ آخر کار گھوم پھر کر اسی نتیجہ پر پہونچنا پڑتا ہے کہ لب فرش جوتے اتارنے کی رسم ہی اڑا دی جائے اور لوگ اپنے جوتے پہن کر بیٹھا کریں۔ تا کہ اگر چور چرائے تو جوتے کو اس کے مالک کے ساتھ چرائے ورنہ حسرت سے اچھے سے اچھا جوتا پیر میں بندھا ہوا دور سے دیکھے اور دیکھ دیکھ کر رہ جائے جوتا پہن کر فرش پر محفل میں بیٹھنا بدتمیزی تو ضرور ہے مگر اس بدتمیزی سے نجات مل جاتی ہے جو جوتا کھونے کے بعد ایک خفت کی صورت میں جوتا کھونے والے پر اس طرح طاری ہوتی ہے کہ گویا آپ نے جوتا

کھویا نہیں بلکہ کسی کا جوتا چرایا ہے۔

-x-x-

ان تینوں حادثات کی تفصیل آپ سن چکے اب آپ ہی بتائیے کہ جس شخص کا کوئی سال اس قسم کے پیہم حادثات سے شروع ہوا ہو اس کا حال سوا اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

بابو

بابو ہندوستان کی اس مخلوق کو کہتے ہیں جو دفاتر میں فائلوں کی چہار دیواری کے درمیان ناک کی پھنگی پر عینک لگائے ہوئے کاغذ سیاہ کرتی ہوئی نظر آئے۔ اور اس کے متعلق دیکھنے والے کو نہایت آسانی کے ساتھ یہ اندازہ ہو سکے کہ سائنس داں نے اپنے کمال سے ٹائپ کی طرح خط شکست لکھنے کی یہ انسانی صورت والی مشین ایجاد کی ہے جو پان بھی کھاتی ہے اور عینک بھی لگاتی ہے۔ کبھی کبھی بات بھی کرتی ہے اور اکثر گھورتی بھی ہے۔ اور واقعی اگر بابو کی زندگی کا جائزہ لیجیے اور اس کے پروگرام پر غور کیجیے تو آپ کو اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ انسان تو خیر برائے نام ہوتا ہے ورنہ زیادہ تر اس کے مشاغل مشین سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ روزانہ مقررہ وقت پر دفتر آنا۔ دفتر آ کر ایک ہی قسم کے کام کو روزانہ انجام دینا مقررہ وقت پر دفتر سے جانا اور ایک مقررہ نظام کے ماتحت گھریلو زندگی بسر کرنا۔ عام انسانوں کی طرح بابو کی زندگی میں مختلف قسم کے مد و جزر بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کی دنیا کے صرف دو کُرے ہوتے ہیں۔ گھر اور دفتر، دفتر اور گھر اور یہ دونوں کُرے ایک دوسرے کے لازم و ملزوم بھی بن کر رہ جاتے ہیں یعنی بابو کا گھر دفتر کے سہارے قائم رہتا ہے اور دفتر گھر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر بابو کو گھر کی فکر نہ ہو تو دفتر کی ہرگز پروا نہ کرے اور اگر دفتر نہ ہو تو گھر کا خدا ہی حافظ ہے۔ مگر باوجود اس ربط کے بابو کی گھریلو اور دفتری زندگی میں

ایک مستقل تضاد ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر زیادہ گہرائیوں میں جایئے تو اس تضاد میں بھی آپ کو یکسانیت کی جھلک نظر آئے گی۔ بلکہ اگر بابو سے پوچھیے تو شاید وہ گھبرا کر گھر کو دفتر یا دفتر کو گھر کہہ جائے۔ اس لیے کہ اس بے چارے کی زندگی حصۂ مساوی جن دو حصوں میں تقسیم ہوئی ہے ان میں سے ایک کو وہ گھر کہتا ہے اور ایک کو دفتر۔ اور ان دونوں جگہوں کی علیحدہ علیحدہ ذمہ داریاں اس پر کچھ اس طرح ہوتی ہیں کہ اس کو جلدی سے گھر اور دفتر میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ البتہ غور کرنے کے بعد وہ بتا سکتا ہے کہ دفتر اور گھر دونوں میں گھر کون سا ہے اور دفتر کون سا۔

بابو نے اسی غلط بحث سے بچنے کے لیے دفتر اور گھر میں چند موٹی موٹی پہچانیں اپنے ذہن میں محفوظ کر لی ہیں تاکہ گھر اور دفتر میں آسانی کے ساتھ امتیاز ہو سکے۔ مثلاً گھر پر بیوائن ہوتی ہیں اور دفتر میں صاحب۔ گھر پر بچے ہوتے ہیں اور دفتر میں اس کے دوسرے ہمعصر بابو۔ گھر پر کہار ہوتا ہے اور دفتر میں چپراسی۔ گھر پر کھانے کو ملتا ہے اور دفتر میں کھایا پیا ایک کیا جاتا ہے۔ گھر پر لیٹا جاتا ہے اور دفتر میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ گھر پر نون تیل لکڑی کی فکر ہوتی ہے اور دفتر میں کیش بک، اکاؤنٹ بک اور لیجر کی فکر۔ گھر پر دھوتی باندھی جاتی ہے اور دفتر میں دھوتی کے اوپر ایک شرعی پاجامہ نما پتلون۔ گھر پر حقہ یا ناریل پیا جاتا ہے اور دفتر میں آنکھ بچا کر بیڑی۔ گھر پہ بچے پریشان کرتے ہیں اور دفتر میں اہل معاملہ اور اہل غرض حضرات۔ گھر پر بیوی کی ناز برداری کرنا پڑتی ہے اور دفتر میں بڑے بابو یا چھوٹے صاحب کی۔ ان چند موٹی موٹی پہچانوں میں سے ایک بابو نہایت آسانی کے ساتھ بتا سکتا ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہے گھر پر یا دفتر میں۔ دفتر میں یا گھر پر۔ بابوؤں کی سیکڑوں قسمیں ہوتی ہیں اور بھانت بھانت کے بابو اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔ مگر ان سب کی زندگی کم وبیش ملتی جلتی ہوتی ہے اور ان سب کے حالات تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ خواہ وہ ڈاک

بابو ہوں یا تار بابو۔ ٹکٹ بابو ہوں یا کسی اور قسم کے بابو مگر ان سب کے حالات زندگی صرف یہ ہوتے ہیں کہ دفتر میں کثرت کار اور گھر پر کثرت اولاد۔ دفتر میں ترقی کی فکر اور گھر پر بوائین کے تقاضے سے لڑکی کی شادی کا غم۔ دفتر میں بڑے بابو کا اندیشہ اور گھر پر رام چرن کی مہتاری کا خطرہ۔ دفتر میں اہل معاملہ کے سامنے شیر اور بڑے بابو کے سامنے بھیگی بلی اور گھر پر بچوں کے باپ اور بچوں کی ماں کے صاحبزادے۔ گھر پر مہاجن سے قرض لینے کی فکر اور دفتر میں پہلی تاریخ کے لیے دن گننا۔ مختصر یہ کہ ایک بابو کی تمام سیاست تمام قابلیت اور تمام اہلیت کا دائرہ محدود ہے۔ گھر اور دفتر کے درمیان اس کے علاوہ خواہ دنیا میں کچھ ہو اس کو خبر نہیں ہوتی۔ اس کی بلا سے اسپین کی حکومت تبدیل ہو جائے اس کو تو بڑے صاحب کی تبدیلی کی خبر بھی بالکل عین وقت پر ہوتی ہے۔ ہر ہٹلر کے ارادے کیا ہیں۔ اس پر وہ غور کرے جس کو بڑے بابو کے ارادوں کے سمجھنے سے فرصت ہو۔ جدید دستور کے نشیب وفراز اس کے نزدیک مہمل ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ دفتر میں جو جدید انتظام ہوتا ہے اس کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جشن تاجپوشی میں اس کے نزدیک سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوا کہ دفتر میں ایک دن کی چھٹی تھی۔ اور اسی دن کے لیے جنس خرید کر لانا پڑی اور تمام دن غلہ کی منڈی میں ترازو اور بانٹ سے واسطہ پڑا۔ ہندوستان کے سیاسی جمود کا جو کچھ بھی نتیجہ ہو بہرحال وہ تو یہ جانتا ہے کہ اس کے دفتر پر جمود کی کیفیت نہ کبھی طاری تھی نہ آئندہ اس قسم کی کوئی امید ہے۔ جمعیۃ اقوام کا چونکہ اس کے دفتر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا وہ اس سے دلچسپی لینا ہی نہیں چاہتا۔ ہندوستان کی قومی زبان اردو رہے یا ہندی اس کے لیے دونوں برابر ہیں۔ اس لیے کہ اس کو تو گھر میں ہندوستانی بولنا ہے اور دفتر میں انگریزی لکھنا۔ فقیراپی کی سرگرمیوں پر وہ اس لیے غور نہیں کرتا کہ جہاں تک اس کا خیال ہے۔ فقیراپی کا کوئی اثر اس کے دفتری معاملات پر نہیں

پڑسکتا۔ مختصر یہ کہ وہ دنیا کے تمام معاملات کو اپنی ناک کی پھنگی پر رکھی ہوئی عینک سے اگر دیکھتا بھی ہے تو اپنے سے غیر متعلق سمجھ کر نہایت مہمل سمجھتا ہے ورنہ عام طور پر وہ اپنے فائلوں ہی کو ختم کرنے اور پچھڑے ہوئے کام کو نپٹانے میں ایسا مصروف رہتا ہے کہ اس کو دنیا کی خبر ہی نہیں ہوتی۔

دفتر کی مصروفیتوں سے کچھ کم اس کے گھر کی مصروفیتیں نہیں ہوتیں۔ اگر آپ بابو کی گھریلو زندگی دیکھیں تو سب سے پہلے وہ آپ کو کندھے پر رومال ڈالے ہوئے ترکاری منڈی میں نظر آئے گا۔ جہاں اس کی تمام توجہ شلجم اور پرول کی جانب مبذول ہوگی۔ منڈی سے ترکاری لے کر واپس ہوتے ہوئے بنئے کی دوکان اس کا دوسرا اسٹیشن ہوگا۔ اور وہاں سے ایک ہی رومال میں مختلف پوٹلیاں باندھے ہوئے اور ایک ہاتھ میں کٹورا لیے ہوئے جس وقت وہ اپنے گھر کی طرف تیز قدم اٹھائے گا۔ اس وقت بھی اس کے دماغ میں سوائے اس کے اور کوئی فکر نہ ہوگی کہ آٹھ بج چکے ہیں ابھی اسپتال جانا ہے۔ پھر کھانا کھانا ہے اور پھر ٹھیک وقت پر دفتر پہونچنا ہے۔ چنانچہ گھر پہونچتے ہی تمام سودا بیوائن کے حوالہ کر کے وہ مختلف چھوٹی چھوٹی بڑی شیشیاں رومال میں باندھے گا۔ نسخے جیب میں رکھے گا۔ اور پھر کسی بچے کی انگلی پکڑے گا۔ اور کسی کو گود میں لے کر اسپتال پہونچ جائے گا۔ اسپتال میں بھی بار بار اس کی نظر گھڑی کی طرف ہوگی اور اسی کی رفتار کے تناسب سے کمپاؤنڈروں کی خوشامد کا سلسلہ شروع ہو جائے گا کہ لڑکے کی آنکھ میں جلدی سے دوا ڈال دیجیے۔ اور اس لڑکی کا کان دھو دیجیے مجھے دفتر کو دیر ہو رہی ہے۔ لڑکے کی آنکھ میں دوا ڈلوانے اور لڑکی کا کان دھلوانے کے بعد بیوائن کے لیے دوا لینا بھی ضروری ہے ورنہ وہ برا مان جائیں گی کہ میرے کلیجہ کی دھڑکن کا کوئی خیال ہی نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ اسپتال سے دواؤں کے خزانہ سے مالا مال لڑکی کو لادے اور لڑکے کی انگلی پکڑے ہوئے جس وقت بابو

صاحب گھر پہونچیں گے اس وقت دفتر جانے میں مشکل سے چند ہی منٹ باقی ہوں گے۔ جلدی جلدی الٹے سیدھے دس پانچ لقمے مار کر فوراً دفتر کے کپڑے پہنیں گے۔ ایک آدھ کش حقہ کا لیں گے اور بستہ سنبھال کر چھتری بغل میں دبائے اس طرح دفتر کی طرف بھاگیں گے کہ گویا کوئی لاٹھی لیے ہوئے پیچھے آرہا ہے۔ یہاں تک کہ راستہ کی تمام چہل پہل ان کے لیے قابل توجہ نہ ہوگی۔ اگر کسی نے سلام کیا تو بغیر دیکھے ہوئے جواب دے دیا اور اگر کسی نے آواز دی تو بہرے بن کر قدم اور تیز کر دیئے۔ اب اگر کوئی ان حضرت سے پوچھے کہ راستہ میں کیا ہورہا تھا تو آپ اس طرح کورے نکلیں گے کہ گویا اس راستے سے گذرے ہی نہیں ہیں۔

دفتر میں بابو جی کی شان البتہ دیکھنے سے تعلق رکھی ہے۔ کام کی کثرت ہر چند آپ کو پن چکی طرح مصروف کار رکھتی ہے تاہم اگر کوئی اہل معاملہ آ گیا تو آپ اپنے کو اس کے نزدیک لاٹ صاحب سے کم ثابت نہیں کرتے۔ خصوصاً جب آپ کو یہ معلوم ہو کہ اس شخص کے کاغذات میرے ہی پاس ہیں اور میں ان کو نہایت آسانی کے ساتھ گڑبڑ میں ڈال سکتا ہوں۔ یا اگر چاہوں تو اسی وقت نکال کر برسوں کا کام منٹوں میں کرسکتا ہوں رشوت لینے کا خیال نہ سہی بلاوجہ پریشان کرنا بھی نہیں چاہتے اگر اہل معاملہ کا کام نکل جائے تو ان کا کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے اپنی اہمیت جتانا بھی ضروری ہے اور چونکہ اہمیت اسی طرح جتائی جاسکتی ہے کہ معمولی سے معمولی بات کو نہایت مہتم بالشان بنا کر پیش کیا جائے لہٰذا سامنے رکھے ہوئے کاغذ کو بھی عنقا ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ مثلاً اہل معاملہ نے نہایت خوشامد کے ساتھ کہا:-

''بابو جی آپ چاہیں تو چٹکی بجاتے میرا کاغذ نکلوا سکتے ہیں۔''

بابو جی پہلے تو اپنے کام میں مصروف رہیں گے اور کوئی جواب ہی نہ دیں گے

اس کے بعد جب وہ پھر کہے گا۔ "بابو جی۔"

"تو آپ صرف کاغذ پر نظر جمائے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر کہیں گے۔ ہاں ہاں۔ کہہ تو دیا کہ بڑے جھگڑے میں پڑا ہوا ہے وہ کاغذ۔"

اہل معاملہ پھر کھیسیں نکال کر کہے گا۔ بابو جی بڑا نقصان ہو جائے گا۔ آپ ذرا مہربانی کر دیں تو کام نکل جائے۔"

بابو جی چشم غلط انداز سے اس کو دیکھتے ہوئے کہیں گے۔ "تم دیکھ رہے ہو کہ میں خالی تو بیٹھا ہوا ہوں نہیں کہ بس تمہارا کاغذ ڈھونڈھنے لگوں۔ جب فرصت ہوگی اس وقت پرانے فائل نکال کر تلاش کر دوں گا۔"

اہل معاملہ خوشامدانہ کہے گا۔ "یہ تو ٹھیک ہے بابو جی مگر بڑی مہربانی ہوگی۔ میرا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔"

اب بابو جی اس کو جواب دینا پھر ضروری نہ سمجھیں گے اور اپنے کام میں مصروف رہیں گے۔ یہاں تک کہ وہ کٹہرے کے باہر پہلے تو کچھ دیر تپائی پر بیٹھ کر اونگھے گا۔ اس کے بعد الہامی طور پر اس کے ذہن میں آئے گا کہ بابو جی کو پان کھلانا چاہئیں چنانچہ وہ فوراً پان لے کر پھر بابو جی کی خدمت میں حاضر ہوگا کہ "بابو جی یہ پان لے لو۔"

بابو جی کی نظریں فوراً اس کی طرف اٹھ جائیں گی اور وہ پان لیتے ہوئے کہیں گے۔ "پان تو ابھی کھا رہا تھا۔ خیر لاؤ۔"

جب اہل معاملہ کے پان بابو جی کے منہ میں پہونچ جائیں گے تو وہ خود ہی اس سے کہیں گے۔ "اب کی تو ہولی۔ دوالی سب گذر گئیں اور تم ہم کو بھولے ہی رہے۔"

اہم معاملہ تاسف کے ساتھ کہے گا۔ "کیا کہیں بابو جی کچھ ایسی ہی فکریں

تھیں۔ اب بڑے لڑکے کی شادی ہے جتنی چاہیے مٹھائی کھانا۔"

بابو جی کہیں گے۔ "اب کی کیا کوئی باغ نہیں لیا ہے۔ کیا آموں کی فصل میں بھی سوکھا ہی رہے گا۔"

اہل معاملہ کہے گا۔ "نہیں بابو جی بھلا یہ کوئی بات ہے۔ تمہارا باغ حاضر ہے چاہے باغ چلو چاہے گھر پر منگا لو آم۔"

بابو جی آموں کا معاملہ پختہ کرنے کے بعد کہیں گے۔ "پارسال تو خیر اچار ہی مل گیا تھا اب کی تو وہ بھی غائب ہی رہا۔ سیٹھ جی تم روز بروز سیانے ہوتے جاتے ہو۔"

سیٹھ جی اچار کے سلسلہ میں اپنی کوتاہی کا عاجزانہ اعتراف کرنے کے بعد جب اچار بھیجنے کا وعدہ کر لیں گے تو بابو جی نہایت خلوص کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلہ میں ان سے پہلے تو کچھ مشورہ کریں گے اس کے بعد اگاہی پر روپیہ لینے کا تذکرہ چھیڑ کر اس بات کی کوشش کریں گے کہ سیٹھ جی خود ہی اس کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ اگر سیٹھ جی ہوئے کوئی بدھو اور تیار ہو گئے تو اسی دن ان کا کاغذ ڈھونڈھ دیا گیا اور بابو جی خود ان کے زرخرید غلام نظر آنے لگے اور سیٹھ جی نے ٹال مٹول سے کام لیا تو آموں اور اچار کے وعدہ کے باوجود اور پانوں کے باوصف ان کا کاغذ کھٹائی میں پڑ گیا اور پھر وہ...... اس وقت ملے گا جب سیٹھ جی کے دوڑتے دوڑتے چیتھڑے ہو جائیں۔

بہر حال کچھ بھی ہو بابو کی دفتری زندگی کے وقار اور ان کے بابوانہ اقتدار کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور ایسے ایسے خدا جانے کتنے اہل غرض دفتر میں بابو جی کے حضور ناک رگڑتے اور ہاتھ جوڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ خود بابو جی کو بھی اس دفتر میں بڑے بابو اور چھوٹے صاحب کے سامنے اسی قسم کی باتیں کرنا

پڑتی ہوں۔

دفتر سے واپسی پر بابو جی کا حلیہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بغل میں بستہ اور چھتری۔ سر پر کسی بے ڈھنگے زاویہ سے رکھی ہوئی ٹوپی ہاتھ میں رومال۔ باچھوں سے بہا ہوا پان اور چہرہ پر دن بھر کی خستگی کے تمام نقوش نمایاں مگر دماغ پر زور دے دے کر یہی سوچتے جاتے ہیں کہ بوائن نے دو پیسہ کے چقندروں اور ایک پیسہ کے پانوں کے علاوہ اور کیا کہا تھا کہ لیتے آنا اس لیے کہ خیال یہ بھی ہے کہ اگر وہ چیز یاد نہ آئی تو گھر پہونچ کر پھر بازار آنا پڑے گا۔ مختصر یہ کہ شام کے قریب بابو جی لدے پھندے گھر پہونچتے ہیں۔ اور گھر پر پہونچ کر پھر گھریلو افکار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کہ اب کی ہرگز مکاندار کو کرایہ اس وقت تک نہ دوں گا جب تک کہ چھت نہ بنوا دے۔ تمام چھت ٹپکتی ہے اور اگر اس نے واقعی چھت بنوا دی تو کیا کرایہ دینا ہی پڑے گا۔ حالانکہ اگر اس مہینہ کرایہ نہ لیتا تو اچھا تھا اس لیے کہ جوتا بالکل ٹوٹ گیا ہے اور بوائن اپنے بھائی کے لڑکے کے مونڈن میں بھی جانا چاہتی ہے اس کا خرچ الگ ہے۔ لہٰذا ان تمام باتوں پر ایک ناریل پی کر غور کرنا چاہیے۔ اور اگر کچھ سمجھ میں نہ آئے تو روٹی کھا کر سو رہنا چاہیے۔

اگر میں ہٹلر ہوتا

اگر میں یہ ہوتا اور اگر میں وہ ہوتا کے سلسلہ کی بہت سی تقریریں میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ نوبت یہاں تک پہونچی تھی کہ اگر میں گھوڑا ہوتا تو کیا کرتا مگر اس سے بھی آگے آج عرض کرنا یہ ہے کہ اگر میں ہٹلر ہوتا تو کیا کرتا۔ بظاہر ایک سیدھا سا سوال ہے اور جواب بھی چنداں مشکل نہیں۔ کہنے کو کہا جا سکتا ہے کہ میں اگر ہٹلر ہوتا تو مجھ کو بھی وہی کرنا پڑتا جو ہٹلر کو کرنا چاہیے۔ مگر ایسی صورت میں جب کہ ہٹلر خود ہی وہ باتیں کر رہے ہیں جو ان کو نہ کرنا چاہئیں یہ سوال یقیناً غور طلب بن جاتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ مجھ کو ڈکٹیٹری سے تو انکار نہیں اس لیے کہ میری موجودہ حیثیت سے ڈکٹیٹری بہرحال بلند چیز ہے مگر جب ہٹلر کی ڈکٹیٹری پر غور کرتا ہوں اور اپنے کو ہٹلر فرض کر کے ہٹلر کی موجودہ سرگرمیوں کا نقشہ اپنے پیش نظر لاتا ہوں تو اس سردی میں بھی پسینہ آ جاتا ہے اور اپنی موجودہ کم حیثیتی اس ڈکٹیٹری کے مقابلہ میں بہت غنیمت نظر آتی ہے۔ وہ جو کسی ریڈر میں دیہاتی اور شہری چوہے کی کہانی پڑھی تھی اور جس سے یہ سبق سیکھا تھا کہ ؎

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
وہ ہے خوف وذلت کے حلوے سے بہتر

یہی سبق اور یہی شعر اس موقعہ پر صادق آتا ہے۔ حالانکہ یہاں چوہوں کا

ذکر نہیں ہے۔ گفتگو ہے میری اور ہٹلر کی مگر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شعر ہم دونوں کے متعلق نہیں ہے۔ بہر حال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر غور کیجیے تو ہٹلر اور اس خاکسار میں ہر اعتبار سے تو خیر زمین اور آسمان کا فرق ہے ہی مگر اس بنیادی اصول میں بھی اختلاف ہے۔ ان کا قول ہے کہ ''مرو اور اگر نہ مر سکو تو مجبوراً جیو'' اور میں قائل ہوں کہ ''جیو اور جینے دو'' کا میرے یہاں سب سے مقدم زندگی ہے اور اس کے بعد کچھ اور۔ ان کا اصول غالباً یہ ہے کہ جب خود مرنا ہے تو دوسروں کی زندگی کو پرسکون کیوں رہنے دو۔ تو صاحب میں تو نہ اس خودکشی کا قائل ہوں۔ نہ مجھ کو ان معظمہ سے اتفاق ہے جو خود کبڑی ہو کر دنیا بھر کے لیے کبڑا ہونے کی دعائیں کرتی تھیں۔ مطلب یہ کہ اب قسم کی ڈکٹیٹری اور اس قسم کے ہٹلر بننے سے تو بندہ دور ہی سے سات سلام کرتا ہے۔ البتہ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر ہٹلر خود نہ ہوتا بلکہ اس کی جگہ میں ہٹلر ہوتا تو کیا کرتا۔ اس سوال کا اس رخ سے جواب دینے میں مجھے کوئی عذر نہیں۔

اگر میں ہٹلر ہوتا اور اتنے بڑے ملک کی ڈکٹیٹری مجھے حاصل ہوتی تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کبھی خواہ مخواہ کے دردسر سمیٹتا نہ پھرتا۔ برلن کے عالیشان محل میں رہتا جس کے سونے اور کھانے کے کمرے میری توجہ کے خاص مرکز ہوتے اور باہر لان پر بھی خدام دولت ہر وقت منتظر رہتے کہ خدا جانے کس وقت ڈکٹیٹر صاحب ٹینس کھیلنے کے لیے تشریف لے آئیں حالانکہ میں کبھی اپنے کو اس کا پابند نہ بناتا کہ ٹینس کے وقت برج نہ کھیل سکوں۔ اوقات میرے پابند ہوتے نہ کہ ڈکٹیٹر ہو کر اوقات کا میں پابند بنتا۔ آرام کی نیند سوتا اور دلچسپیوں میں دن بسر کرتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اپنے فرائض کو خدانخواستہ بھول جاتا اور حکومت کے تمام کام چوپٹ کر کے رکھ دیتا۔ جی نہیں ریشتاغ کے اجلاس میرے زمانے میں بھی ہوتے اور

میں بھی اپنے محل سے نکل کر اپنی قوم کا سلام لیتا ہوا جلوس کی شکل میں ریشتاغ کی عمارت تک جاتا۔ مگر وہاں جا کر نوچ کھسوٹ کے مسائل پر غور کرنے کے بجائے اپنے ملک جرمنی کو تمام دنیا کی آنکھوں کا تارا بنانے کی فکر کرتا کہ کس طرح دوسرے ملکوں سے تعلقات خوشگوار بنائے جائیں۔ کیوں کر ہندوستان کو اپنی شرافت کا قائل کیا جائے۔ کس طرح فرانس سے دوستی کے پینگ بڑھائے جائیں اور کون کون سی صورتیں اختیار کی جائیں کہ ساری دنیا کی زبان پر عزت اور محبت کے ساتھ جرمنی کا نام آ جائے۔ اس کے علاوہ خود اپنے اہل ملک کے لیے ہٹلر کی طرح موت کے بہانے نہ ڈھونڈھتا پھرتا بلکہ ان کو زندگی کے حقوق دیکر یہ فکر رکھتا کہ ان حقوق سے وہ خاطر خواہ فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں یا نہیں۔ یہ نہیں کہ صحتیں خراب ہیں۔ پیٹ کو روٹی نہیں جڑتی مگر ڈکٹیٹر صاحب کو نہ تو صحت کی فکر ہے نہ روزی کی البتہ ادھار کھائے بیٹھے ہیں اس پر کہ ہر وہ شخص جس میں کسی قسم کی زندگی کے ذرا بھی آثار پائے جائیں۔ کندھے پر بندوق رکھے۔ میدان جنگ کی طرف جاتا ہوا نظر آئے۔ ورنہ اس کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ گویا زندہ رہے تو مرنے کو جائے ورنہ اس سے بہتر ہے کہ زندہ ہی نہ رہے۔ کھیتیاں ویران پڑی ہیں اور اسلحہ سازی کے کارخانے دن رات چل رہے ہیں۔ پیٹ میں اناج پہونچے یا نہ پہونچے مگر کارتوسوں میں بارود ضرور بھر جائے۔ زندگی اور صحت کی تدابیر پر غور کرنے والے سائنس دان زہریلی گیس، موت کی شعاع اور اس قسم کی ہلاکت آفریں تدابیر پر غور کریں۔ کام ہے ان کا مرنے والوں کو موت سے بچانا اور سپرد ہے ان کے جینے والوں کو مارنے کا کام تو صاحب اس خاکسار سے تو یہ حرکتیں قیامت تک سرزد نہ ہوسکتیں۔ میں اپنی قوم کو جان بوجھ کر ہلاکت اور بربادی کی طرف یوں کبھی نہ جھونکتا جس طرح ہٹلر صاحب مشقِ ستم فرما رہے ہیں اور اگر، شیطان کے کان بہرے، میرا بھی دماغی، توازن اسی طرح

گڑبڑ ہو جاتا تو میں ڈکٹیٹری چھوڑ کر پہلے اپنا علاج کراتا اس کے بعد ملک اور قوم کے معاملات میں دخل دیتا۔ کوشش کر رہا ہوں کہ جو کچھ عرض کرنا ہے اس میں موازنہ کی کیفیت پیدا نہ ہو مگر عجب مصیبت یہ ہے کہ ع

بنتی نہیں کسی طرح ہٹلر کہے بغیر

لہٰذا اب یوں کہتا ہوں کہ اپنی جان سے دور اگر میں ہٹلر ہوتا تو اپنے ساتھ اپنی قوم کی زندگی اس بوکھلاہٹ کے ساتھ موت کے سپرد کبھی نہ کرتا بلکہ یقین جانئے کہ زندہ رکھ کر دوسروں کو زندہ رکھتا اور جو کام جرمنی کے یہ خداوند نعمت صاحب توپ کے گولوں سے لے رہے ہیں وہ کام میں اپنے ہمسایوں سے اخلاق اور مروت سے لے لیتا۔ تخفیف اسلحہ کی تحریک اول تو میرے ہی دماغ کا نتیجہ ہوتی ورنہ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ اس تحریک کا سب سے بڑا حامی میں خود ہوتا۔ یہ نہیں کہ تخفیف اسلحہ کے پردہ میں جنگی تیاریاں شروع کر کے دوسروں سے یہ جھوٹ بولتا کہ یہ سب کچھ تو محض اپنے بچاؤ کے لیے ہے اور اس کے بعد جب کیل کانٹے سے اپنے نزدیک درست ہو جاتے تو بے بات کی بات پیدا کر کے میدان میں آ کودتا۔ لاحول ولاقوۃ پھر وہی موازنہ کی کیفیت پیدا ہوئی۔ حالانکہ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ ہٹلر سے کوئی مطلب نہیں اگر میں خود ہٹلر ہوتا اور جو ہٹلر ہیں وہ ہوتے ہی نہیں تو کیا صورت ہوتی اور میں کس قسم کا ہٹلر ثابت ہوتا۔ اس سلسلہ میں ذرا میرا تفصیلی پروگرام سن لیجیے کہ میرا وقت کیوں کر گزرتا اور میری نقل و حرکت کا مفہوم کیا ہوتا۔ غالباً اس سے میری پالیسی کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکے گا۔

برلن کے عظیم الشان محل میں بحیثیت ڈکٹیٹر کے جب صبح میں بیدار ہوتا تو محل میں تعینات فوجی دستہ میری سلامتی کا ترانہ گاتا اور حجام ان چیف روبکاری خاص چند برقی شعاعوں سے جو ہلاکت آفریں نہیں بلکہ ''شیو آفریں'' ہوتیں شیو بنانے کا اعزاز

حاصل کرتا۔ اس کے بعد ہی آفیسر انچارج حمام خاص احکام غسل حاصل کرنے کے لیے باریاب ہوتا۔ مختصر یہ کہ تھوڑی ہی دیر میں مجھ عظیم المرتبت شخصیت کو ان ضروریات سے فراغت حاصل ہو جاتی اور میں صبح کے شاہانہ ناشتہ کے ساتھ ہی ذمہ داران حکومت کو شرف باریابی بخشتا تا کہ وہ اپنے اپنے محکمہ کی خیریت سنائیں اور میں ان کو ضروری احکام دے کر رعایا کی فلاح کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ مشیران حکومت کو جلد جلد ضروری ہدایات دے کر رخصت کرتا اور اس کے بعد پوسٹ ماسٹر جنرل ڈاک خانہ برلن میرے نام کی ڈاک لے کر حاضر خدمت ہوتا۔ اس ڈاک میں مختلف حکومتوں کے تاجداروں اور ڈکٹیٹروں کے دوستانہ خطوط اور تار وغیرہ ہوتے، خود میری رعایا کی عرض داشتیں ہوتیں۔ کچھ اخباروں کے وی پی ہوتے کچھ سربستہ راز منی آرڈروں کی رسیدیں ہوتیں۔ کسی ڈکٹیٹر کا خط کھولتا تو اس کو اپنی خیریت نہ پہونچنے پر بے قرار پاتا۔ کسی بادشاہ نے اپنی دختر کی شادی کے سلسلہ میں مجھ سے مشورہ طلب کیا ہوتا۔ کسی حکومت کے نمایندہ نے مجھ سے شکایت کی ہوتی کہ دیکھئے صاحب فلاں فلاں حکومت نے ہمارے فلاں فلاں گاؤں میں اپنے مویشی چرنے کے لیے بھیج دئے ہیں اور ہم کو اندیشہ ہے کہ ان مویشیوں کے بعد ان کے چرواہے آئیں گے اور چرواہوں کی تلاش میں ان کے رشتہ دار، نتیجہ یہ ہوگا کہ اسی طرح ان کی فوج ہماری مملکت میں آ جائے گی۔ اس سلسلہ میں ہم آپ کو ثالث مقرر کرتے ہیں۔ آپ ان کو سمجھایئے کہ یہ طریقہ اس تہذیب وتمدن کے دور میں صلح دامن کے خلاف ہے۔ اس طرح کے مختلف پیغامات اس ڈاک میں نکلتے اور میں ڈاک دیکھنے کے بعد پوسٹ ماسٹر جنرل کو رخصت کرتا اور ڈاک کے ایک ایک تار اور ایک ایک خط کا جواب خود لکھتا یا اپنے پرائیوٹ سکریٹری سے لکھواتا۔ ہر ایک کو پرخلوص جواب اور آخر میں اشتیاق ملاقات۔ مویشیوں کی مداخلت بیجا کی شکایت کرنے والے ڈکٹیٹر کو

اپنے پاس آنے کا دعوت نامہ یا خود موقعہ پر پہونچنے کی اطلاع دیتا تا کہ دونوں حکومتوں کے ذمہ داروں کو فوراً گلے سے لگا دیا جائے۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کی صلح جویانہ تدابیر خود بھی اختیار کرتا رہتا اور دوسروں کو بھی ان کی ترغیب دیتا۔ بلکہ اگر خود میری مملکت میں کسی اور ہمسایہ ملک کے مویشی آجاتے اور مجھ کو ان کی آمد کی اطلاع ملتی تو میں ان کے استقبال کا حکم دیتا اور میری ہدایت ہوتی کہ نہ صرف ان کو شوق سے جرمنی کے کھیت چرنے کی اجازت دے دی جائے بلکہ ان کو ان کھیتوں کی طرف ہنکا دیا جائے جن میں ان کے مرغوب ترین چارے کے سامان موجود ہوں۔ اس کے بعد جس ملک کے وہ مویشی ہوتے اس کو شکریہ کا ایک خط بھیجتا کہ آپ کی اس بے تکلفی سے دلی مسرت حاصل ہوئی کہ آپ نے اپنے مویشیوں کے لیے جرمنی کو خانۂ بے تکلف سمجھا۔ آپ کے مویشی ہمارے مہمان ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ میزبانی کے فرائض کچھ دن اور ادا کریں۔ بات تو یہ چھوٹی ہوتی مگر اس کا اثر کتنا پڑتا۔ کیا پھر وہ حکومت کسی وقت بھی میری حکومت سے دشمنی کا ارادہ اپنے ذہن میں لا سکتی۔ میرے خیال میں تو ہرگز نہیں۔ آپ کہیں گے کہ سب کہنے کی باتیں ہیں، جس وقت ضروریات مجبور کرتیں مجھ کو بھی نصیب دشمناں ہٹلر کا رویہ اختیار کرنا پڑتا۔ مثلاً میری حکومت میں خام اشیا کی کمی ہوتی اس وقت زندگی سے بیزار ہو کر آخر میں کیا کرتا۔ یہی نا کہ ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ تو صاحب اس سے مجھ کو کب انکار ہے کہ کوشش نہ کی جائے۔ مگر کوشش کے معنی یہ تو ہیں نہیں کہ جو چیز اپنے پاس نہیں ہے اس کو حاصل کرنے کے لیے زبردستی شروع کر دی جائے۔ دراصل اس کا آسان طریقہ میری حکومت میں یہ ہوتا کہ فرض کر لیجیے میری حکومت کو پٹرول کی ضرورت ہوتی اور میں دیکھتا کہ رومانیہ کے پاس پٹرول کافی ہے تو میں فرانس سے پٹرول جھپٹنے کے بجائے رومانیہ کو ایک دوستانہ خط لکھتا۔

برادر بجان برابر۔ اپنے ہٹلر کا سلام قبول کرو۔ اب تو خیریت کے دو لفظوں کے لیے ترس گئے۔ خیر صاحب آپ نہ پوچھئے مگر ہم تو ہر وقت دعائے خیر سے یاد کرتے ہیں۔ بھائی چرچل کے خط سے خیریت معلوم ہو ہی جاتی ہے۔ اس وقت ایک تکلیف دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ شاید آپ کو جرمنی میں پٹرول کے قحط کی اطلاع اب تک نہ ہوئی ہوگی ورنہ مجھ کو یہ عریضہ لکھنے ہی کی ضرورت نہ ہوتی۔ امید ہے کہ آپ پٹرول مہیا کرنے کے لیے اسی وقت احکامات صادر کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔ جرمنی کی تمام مصنوعات آپ کی ہیں اور آپ کو میری ہی قسم جو کسی معاملہ میں کبھی تکلف کریں۔ اور باقی سب خیریت ہے۔ بچے آداب عرض کرتے ہیں۔ سب خورد و کلاں کو حسب مراتب سلام و دعا

بندۂ خلوص، احقر۔ ہٹلر کیوں صاحب کیا اس خط کا اثر نہ ہوتا۔ اور کیا اس قسم کے باہمی تعلقات کے بعد بھی توپ اور بندوق کی ضرورت ہوتی؟ سچ پوچھئے تو اس لڑائی جھگڑے کی ضرورت تو اس لیے پیش آ رہی ہے کہ جنگجو ہٹلر صاحب اپنے سوا کسی اور کو دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ حالانکہ قدرت کا ایک مقررہ اصول یہ ہے کہ چیونٹی کی موت اسی وقت آتی ہے جب اس کے پر نکل آتے ہیں۔ اگر وہ محض رینگتی رہے جس کے لیے وہ بنائی گئی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں مگر وہ اڑنے کی کوشش کرتی ہے اور یہی اس کی موت ہے۔ میں تو زندہ رہنے کے لیے رینگتا ہی رہتا اور مرنے کے لیے اڑنے کی کوشش کبھی نہ کرتا۔ جب صلح میرا اصول ہوتا اور ہر ایک سے دوستی میرا اشعار تو ظاہر ہے کہ بلا وجہ مجھ سے دشمنی کون کرتا۔ اور فرض کر لیجیے کہ اگر اس صلح جوئی اور امن پسندی کے باوجود روس وغیرہ ''آؤ پڑوسن لڑیں'' کی دعوت بھی دیتے تو میرے جان نثار دوست اور میرے غم خوار ہمسائے سب میری مدد کو ہر وقت موجود رہتے۔ اس لیے کہ میں خود ان سب کا غم خوار اور ہمیشہ کام آنے والا دوست ہوتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا

کہ جنگ کے امکانات تقریباً نہ ہونے کے برابر ہوتے اور جنگی گتھیاں سلجھانے والا دماغ رعایا کی فارغ البالی اس کی صحت اور تندرستی کے امکانات کی جستجو میں رہتا۔ خود بھی سکون حاصل رہتا رعایا بھی امن چین سے زندگی بسر کرتی۔ ہمسائے بھی خوش اور دوسری حکومتیں بھی مطمئن۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر میرے ماتحت مثلاً گوئرنگ وغیرہ کہتے بھی کہ سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلے گا تو میں ان کو ڈانٹ دیتا کہ گھی نہیں نکلتا تو تیل کھاؤ۔ مگر انگلیاں کیوں ٹیڑھی کرو۔ بات صرف اس قدر ہے کہ خود ہٹلر صاحب ہی مجھ کو یہ سمجھادیں کہ موت حاصل کرنا خواہ وہ اپنے لیے ہو یا کسی کے لیے کونسا اعجاز ہے۔ وہ جو ایک شعر ہے ؎

کوئی دیکھے ان کی ذردیدہ نگاہی کا فریب
کوئی پوچھے جان لینا کون سا اعجاز ہے

کمال تو ہے زندگی کی راہیں ڈھونڈھنا۔ مرنے اور مارنے کا طریقہ تو ہٹلر صاحب کیا وحشی بھی جانتے تھے اور جنگل کے درندے بھی جانتے ہیں۔

برلن کا اسپتال

(شیشیاں رکھنے، دوائیں انڈیلنے اور مریضوں کے کراہنے کی آوازیں۔ ڈاکٹر صاحب نرس کو آواز دیتے ہیں۔)

ڈاکٹر : ''نرس۔ نرس (گھنٹی بجاتا ہے) بوائے بوائے۔''

بوائے : ''حضور!''

ڈاکٹر : ''دیکھو نرس مس صاحبہ کو سلام بولو۔''

(نرس خود ہی کھٹ کھٹ کرتی ہوئی آتی ہے۔)

نرس : ''گڈ ایوننگ ڈاکٹر۔''

ڈاکٹر : ''گڈ ایوننگ مس۔ نمبر ۱۰ کا کیا حال ہے؟''

نرس : ''اوہ۔ اس کو انجکشن سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ اب تک یہی بکتا ہے کہ نازی خونخوار ہیں۔''

ڈاکٹر : ''ایک انجکشن اور دیا جائے گا اور نمبر ۱۸ اب ٹھیک ہے؟''

نرس : ''اس کو ۳۳ ڈوز دیئے گئے مگر اس کا دماغ ابھی تک گڑبڑ ہے وہ بولتا ہے کہ جرمن وحشیوں کو مات کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر : ''اور وہ جس مریض کا کل آپریشن ہوا تھا؟''

نرس : ''وہ آج صبح مرگیا اور مرتے مرتے یہی کہتا رہا کہ پاگلوں کی طرح

لڑنے سے اس طرح کا مرنا اچھا ہے۔"

ڈاکٹر : "اس کا مرنا ہی اچھا ہوا اس نے ایک جلسہ میں تقریر کی تھی کہ اگر نازی سپاہی اس جنگ سے باز نہ آئے تو جرمنی یورپ کے نقشہ سے اڑ جائے گا۔ وہ پاگل تھا۔ بالکل پاگل۔ اچھا بوائے نئے مریضوں کو بلاؤ اور نرس دیکھو ہم مریضوں کو دیکھنے کے بعد راؤنڈ کریں گے۔"

نرس : "بہت اچھا"

(نرس جاتی ہے۔)

بوائے : "حضور پولیس ایک مریض کو لائی ہے اور چار پانچ مریض جیل کی لاری پر آئے ہیں۔"

ڈاکٹر : "سب کو ایک ایک کر کے بلاؤ۔ پہلے وہ پولیس والا مریض۔"

بوائے : "ادھر آؤ۔ یہاں کھڑے ہو۔"

(زنجیروں کی آواز اور قدموں کی چاپ)

ڈاکٹر : "تمہارا نام؟"

مریض : "جان۔"

ڈاکٹر : باپ کا نام؟

مریض : جیک

ڈاکٹر : عمر

مریض : ۲۵ سال

ڈاکٹر : تم کیا بیمار ہو؟

مریض : میں بالکل تندرست ہوں۔ مجھے کوئی شکایت نہیں میری صحت بالکل اچھی ہے۔

ڈاکٹر : پھر تم کو پولیس نے مریض کیوں کر سمجھا؟

مریض : مرض سمجھتا اگر پولیس کا کام ہے تو چالان کرنا ڈاکٹروں کا کام ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر : اوہو۔ ہم یہ نہیں پوچھتے۔ ہمارے سوال کا جواب دو تم کو مریض کیوں کر سمجھا گیا؟

مریض : یہ سمجھنے والوں سے پوچھا جائے جن کا خیال ہے کہ میرا دل کمزور ہے اور دماغ بھی خراب ہے۔ حالانکہ میں نے صرف فوج میں بھرتی ہونے سے اس لیے انکار کیا تھا کہ میرے نزدیک نازی حق پر نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ وہ صرف امن کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر : تمہارا یہ خیال کب سے ہے؟ یعنی تم کب سے ایسی باتیں سوچنے لگے ہو؟

مریض : جب سے نازی پارٹی نے زبردستیاں شروع کی ہیں۔

ڈاکٹر : ہوں! تمہارے یہاں کسی اور کو بھی یہ مرض ہوا ہے؟

مریض : مرض؟ مرض کیسا۔ یہ مرض ہے کہ میں ایک انصاف کی بات کہہ رہا ہوں؟

ڈاکٹر : یہی مطلب ہے کہ تم کو یہ انصاف کب سے ہو گیا ہے؟

مریض : مجھے ہمیشہ اپنی ذات پر انصاف پسند اور حق گو ہونے کا فخر رہا ہے۔

ڈاکٹر : آئی سی (I See)۔ تم انصاف کے علاوہ حق گوئی میں بھی مبتلا ہو۔ اچھا تم اسپتال میں رہ کر علاج کرو۔ تم کو آرام ہو سکتا ہے مگر سخت پرہیز کرو۔ تمہارا انصاف بھی ٹھیک ہو جائے گا اور حق گوئی بھی جاتا رہے گا۔ بوائے اس کو لے جاؤ۔ اور اس مریض کو لاؤ۔

(زنجیروں کی آواز اور قدموں کی چاپ)

ڈاکٹر : اس کو کیا ہوا ہے؟

بوائے : حضور اس کی آنکھیں خراب ہیں۔

دوسرا مریض: میری آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔ میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں، میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ اسپتال ہے یہ گھڑی لگی ہے اس میں آٹھ بج کر تین منٹ آ رہے ہیں۔ یہ ڈاکٹر ہیں ان کا یہ چشمہ ہے۔

ڈاکٹر : پھر تمہاری آنکھ میں اور کیا خرابی ہے؟

دوسرا مریض: کوئی خرابی نہیں۔ میری آنکھوں میں اچھی خاصی روشنی ہے مجھے کبھی چشمہ تک کی ضرورت نہیں ہوئی۔ میں فاصلے کی چیزیں بھی دیکھ سکتا ہوں اور نزدیک کی بھی۔ مہین سے مہین چھاپے کی عبارت پڑھ سکتا ہوں۔

ڈاکٹر : یہ تو سب ٹھیک ہے مگر پھر کیا بات ہے؟

بوائے : حضور رپورٹ یہ ہے کہ اس نے دشمنوں کے فوجی افسر کی تصویر دیکھ کر کہا تھا کہ یہ صورت سے شریف اور راہ راست پر معلوم ہوتا ہے اور ہمارے کمانڈر کی تصویر دیکھ کر کہا کہ ظلم صورت سے برستا ہے۔

ڈاکٹر : اوہو۔ یہ تو بہت بڑی آنکھوں کی بیماری ہے۔ آنکھوں کی پتلیوں نے غلط چیزیں دیکھنا شروع کر دی ہیں اور یہ اندھے ہو جانے کی علامت ہے۔ تمہاری آنکھیں کبھی دُکھنے آئی تھیں؟

دوسرا مریض: بچپن کے علاوہ کبھی نہیں۔

ڈاکٹر کسی غیر ملکی کوئلہ کی کان کا کوئلہ ریل وغیرہ میں تمہاری آنکھ کے اندر کبھی پڑا؟

دوسرا مریض: کبھی نہیں اور اگر پڑا ہو تو یاد نہیں۔

ڈاکٹر : تمہارے سر میں کبھی درد ہوتا ہے؟

دوسرا مریض: عام طور پر نہیں۔

ڈاکٹر : اچھا اپنی زبان دکھاؤ۔ اور۔ اور ٹھیک ہے۔ کیا تم نے اپنے افسر کی تصویر دیکھ کر ظالم سمجھا؟

دوسرا مریض: میں اس کو ظالم سمجھتا ہوں۔ وہ قوم کو تباہی کی طرف لے جانے والوں میں سے ایک ہے۔ وہ امن وامان کے دشمنوں کا ساتھی ہے۔ اس کی تصویر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر : اس کا مطلب یہ ہوا کہ جیل کی رپورٹ غلط ہے۔ تمہاری صرف آنکھیں ہی نہیں دل ودماغ بھی خراب ہے۔ آنکھوں کا تو صرف ایکسس (Axis) بدل گیا ہے مگر دماغ الٹی بات سمجھتا ہے اور دل بھی کمزور ہے۔

(نرس دوڑتی ہوئی آتی ہے)

نرس : وہ مریض جو ابھی پولیس لائی تھی لیٹنے سے انکار کرتا ہے اور وارڈ کے دوسرے مریضوں کو لکچر دے کر اپنے جراثیم پھیلا رہا ہے؟

ڈاکٹر : لکچر دیتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی زبان پر بھی زہر پھیل گیا ہے۔ اس کو آپریشن تھیٹر میں لے چلو میں اس مریض کو دیکھ کر ابھی آتا ہوں۔

دوسرا مریض: کیا اس کی زبان کاٹی جائے گی؟

ڈاکٹر : اس کی جان بچانے کے لیے جسم کے بیکار اور زہریلے حصہ کو کاٹ ڈالنا ہی پڑے گا۔

دوسرا مریض: بے چارے کی زبان۔ اس کی زبان میں کیا خرابی ہے۔

ڈاکٹر : نازی پارٹی کے خلاف لیکچر دیتا ہے اور اس سے بڑھ کر اور خرابی کیا ہوگی۔ اگر اس کی زبان فوراً نہ کاٹی گئی تو نہ صرف وہ تباہ ہو جائے گا بلکہ اس کی چھوت بہت سے تندرستوں کی صحت خراب کر دے گی۔ اگر کسی مریض کا ہاتھ سڑ جائے تو باقی جسم کو بچانے کے لیے ہاتھ کاٹ ڈالنا چاہیے اسی طرح اس کی زبان کاٹنا پڑے گی۔

دوسرا مریض: تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری یہ ظالمانہ چارہ گری سچ بولنے والوں کو سچائی سے، انصاف پسندی کے حامیوں کو انصاف سے، امن پسندی کے طرفداروں کو امن سے باز رکھے گی۔

ڈاکٹر : یہ سب بہت خطرناک بیماریاں ہیں۔ ہم نے ان بیماریوں کی روک تھام کے لیے نئے نئے آپریشن اور عجیب و غریب انجکشن اور دوائیں ایجاد کر لی ہیں جن کا بہت جلد اور بہت اچھا اثر مریض پر ہوتا ہے۔ سچ بولنے والے بہت سے مریض جھوٹ کے عادی ہو گئے۔ ایک معمولی انجکشن نے بہت سے ایمان داروں کو ایمان داری کا دشمن بنا دیا۔ بہت سے انصاف پسندی کے مریض ہماری دوا کی دو تین خوراکوں کے بعد انصاف کے نام کو بھول گئے اور سب سے بڑا اور عام مرض انسانیت تو ہم نے اینٹی ہیومن ویکسی نیشن یعنی (Anti Human Vaccination) انسانیت کش ٹیکہ سے ایسا کھویا ہے کہ ہماری نازی فوج میں یہ مرض نام کو بھی نہیں۔

دوسرا مریض: کیا مطلب یعنی تم انسانیت کے بھی دشمن ہو۔

ڈاکٹر : تم بہت بھولے ہو۔ جب تک یہ کمزوری ہم میں سے دور نہ ہو اس

وقت تک ہم جنگ جو نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ہم نازی بچوں، بڈھوں، جوانوں، مردوں اور عورتوں سب کو صرف چیچک طاعون اور ہیضہ ہی کے ٹیکے نہیں لگاتے بلکہ یہ ٹیکہ بھی لگاتے ہیں، کیا تمہارے یہ ٹیکہ نہیں لگا ہے؟

دوسرا مریض: نہیں۔ میں برلن کا رہنے والا نہیں ہوں دیہات سے یہاں آیا ہوا تھا۔

ڈاکٹر : مگر ہمارے ویکسی نیٹر (Vacciantor) تو دیہاتوں میں بھی گھوم رہے ہیں اور جنگ کے زمانے میں تو اس وبا کو ہم اپنے ملک میں رکھ ہی نہیں سکتے۔ تمہارے سب سے پہلے یہ ٹیکہ لگنا چاہیے۔

دوسرا مریض: (گھبرا کر) نہیں نہیں میں ہرگز اپنی انسانیت سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا۔

ڈاکٹر : کوئی تکلیف نہ ہوگی تم چپ رہو۔ بوائے فوراً ٹیکہ کا سامان لاؤ۔

دوسرا مریض: نہیں ڈاکٹر صاحب مجھے زہر دے دیجیے۔ مجھے مار ڈالیے میں انسان پیدا ہوا ہوں انسانیت میرا حق ہے میں انسانیت کو کھو کر زندہ رہنا نہیں چاہتا۔

ڈاکٹر : تم میں انسانیت کے بہت سے جراثیم ہیں۔ تم فوراً ٹھیک ہو جاؤ گے گھبراؤ نہیں یہ ویکسی نیشن (Vaccination) تم کو بہت جلد انسانیت سے دور کر دے گا۔ تم انسانیت کا جامہ اتار پھینکو گے۔ یہ بہت عمدہ چیز ہے اس میں شیر اور دوسرے درندوں کا ست ہے اور پاگل کتے جو ہم بڑی مشکل سے مہیا کرتے ہیں ان کا جوہر انجکشن میں موجود ہے۔

دوسرا مریض: میں درندہ بن کر نہیں رہ سکتا۔ میں پاگل کتوں کی طرح بھونکنا نہیں چاہتا۔ میں انسان ہوں مجھ کو انسان رہنے دو۔

ڈاکٹر : کوئی فکر کی بات نہیں، تمہاری ساری انسانیت رگ رگ سے کھینچ کر چھوٹے سے زخم کی صورت میں بازو پر آجائے گی۔ زخم تھوڑے دنوں میں سوکھ جائے گا اور انسانیت کھرنڈ بن کر جھڑ جائے گی۔ اس کے بعد تم اعلیٰ درجہ کے نازی سپاہی ہو جاؤ گے تم کو وار اسپرٹ مکسچر WAR SPITIT MIXTURE کی دو تین خوراکیں بہت بڑا جنگ جو بنا دیں گی۔

(قدموں کی چاپ)

بوائے : ٹیکہ کا سامان درست ہے۔

دوسرا مریض: مجھے چھوڑ دو یا گولی مار دو میں انسان ہوں، انسان رہنا اور انسان ہی رہ کر مرنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر : مت بکو یہ سب انسانیت کا قصور ہے کہ تم جنگ جو بننا اور انسانیت کے خلاف جنگ میں حصہ لینا نہیں چاہتے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تم کو بالکل انسان نہ رہنے دیں گے تم پکے نازی بن جاؤ گے۔ صورت شکل آدمیوں کی سی ہوگی مگر درندوں کی طرح پھاڑ کھانے کی اسپرٹ پیدا ہو جائے گی۔ تم سچ، انصاف، ایمانداری، رحم دلی، شرافت اور اسی قسم کی بہت سی چھوٹی چھوٹی بیماریوں سے بچ جاؤ گے۔ چلو ادھر۔"

دوسرا مریض: نہیں ڈاکٹر مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لیے چھوڑ دو۔

(نرس کے قدموں کی چاپ)

نرس : ڈاکٹر وہ مریض آپریشن تھیٹر میں ہے۔

ڈاکٹر : میرا خیال ہے اس کے بھی ٹیکہ نہیں لگا ہے، پہلے اس پر بھی ٹیکہ کا امتحان کیا جائے۔ اچھا ان کو ٹیکہ لگانے کے بعد دیکھا جائے گا۔

دوسرا مریض: میں یہ ٹیکہ جانور بنا دینے والا نہیں لگوا سکتا۔

ڈاکٹر : نہیں تم جانور نہیں بن سکتے۔ ہمارا ذمہ ہے کہ دُم نہیں نکلے گی چلو بڑھو ادھر۔

دوسرا مریض: (روتی آواز میں) ڈاکٹر صاحب مجھے چھوڑ دیجیے۔ میں بالکل اچھا ہوں میں ٹیکہ نہیں لگواؤں گا۔

ڈاکٹر : اس کو پکڑ لو بوائے۔ نرس تم ٹیکہ کا سامان سنبھالو۔

دوسرا مریض: (چیخ کر) ارے مار ڈالا۔ میری انسانیت ختم کر دی (زور سے) آہ۔ آہ۔

ڈاکٹر : بس بس۔ بوائے اس کو آرام سے لٹا دو۔ یہ بے ہوش ہو رہا ہے۔

نرس : اور وہ مریض؟

ڈاکٹر : ہاں اب اس کو لاؤ۔ اس کے بھی ٹیکہ لگا دیا جائے۔

(نرس جاتی ہے)

بوائے : اس نے تو آنکھیں بند کر لیں۔

ڈاکٹر : ٹیکہ اثر کر رہا ہے۔ ایک گھنٹہ تک اس کو بے ہوش رہنا چاہیے اس کے بعد ہوش میں آتے ہی اس کو ایک خوراک وار اسپرٹ مکسچر War Spirit Mixture کی دے دی جائے۔

بوائے : کل جو مریض آئے تھے آج وہ سب بالکل ٹھیک ہیں اس مکسچر نے سب کو بہادر نازی بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر : یہ مریض بھی ٹھیک ہوجائیں گے۔ اور جو مریض ٹھیک ہو گئے ہیں ان کو فوراً اچھاؤنی بھجوادو۔

(قدموں کی چاپ، زنجیروں کی آواز)

نرس : دیکھو خاموش چلے آؤ ہم تم کو بالکل اچھا کرنا چاہتے ہیں تم بہادری نازی بن جاؤ گے۔

مریض : خونخوار بنانا چاہتی ہو۔ درندہ بنانا چاہتی ہو جو انصاف، حق وصداقت، امن اور آدمیت کے خلاف جنگ کرے۔

ڈاکٹر : چپ رہو ہم ابھی تمہاری یہ سب تکلیفیں دور کردیں گے۔ اِدھر آؤ آگے بڑھو۔

مریض : یہ ظلم ہے۔ میری مرضی کے خلاف تم میری فطرت بدل رہے ہو۔ تم جرمنی کو تباہی کی طرف لے جارہے ہو۔

ڈاکٹر : چپ رہو۔ شور نہ مچاؤ۔ تم ابھی ٹھیک ہوجاؤ گے۔ تمہارے کبھی ٹیکہ لگا ہے؟

مریض : لگا ہے۔ چیچک اور طاعون دونوں کا لگا ہے۔ ہیضہ کا ٹیکہ نہیں لگا۔ اس لیے کہ میں خود ہی فاقے کرتا ہوں۔

ڈاکٹر : نہیں نہیں۔ تم نہیں سمجھے۔ نازی بنانے کا ٹیکہ لگا ہے تمہارے؟

مریض : میں یہ کلنگ کا ٹیکہ کبھی نہ لگنے دوں گا۔ تم نے ساری قوم کا ناس مارا۔ جرمنی کو درندوں کا جنگل بنا کر رکھ دیا اور انھیں درندوں کا شکار کھیلنے کے لیے دنیا کو مجبور کیا ہے۔

ڈاکٹر : نہیں لگا ہے اس کے ٹیکہ اور یہ سب اسی کی خرابی ہے۔ ہمارے ویکسی نیٹر Vaccinator جاتے کیوں سو رہے ہیں۔ ان کو حکم ہے کہ کوئی

جرمنی کا باشندہ بغیر ٹیکہ کے نہ رہے۔ بوائے اس کو پکڑلو۔

مریض : یہ ظلم ہے (بلند آواز سے) زبردستی ہے (اور زیادہ بلند آواز سے) بربریت ہے۔

ڈاکٹر : یہ سب باتیں یہ ٹیکہ پیدا کردے گا۔ اطمینان رکھو۔ بوائے اس کو آگے بڑھاؤ۔

مریض : ارے میں مرجاؤں گا مار ڈالا۔ مار ڈالا۔ اف۔ آہ۔

ڈاکٹر : بس ٹھیک ہے۔ لٹادو اس کو آرام سے۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی)

ڈاکٹر : بوائے ٹیلیفون سنو۔

بوائے : (ٹیلیفون ریسیور اٹھا کر) برلن ہاسپٹل۔ کہاں سے۔ رشتاغ اچھا اچھا۔ ہاں ڈاکٹر صاحب موجود ہیں۔ کون، جنرل وان ڈف، ہاں، ہاں ابھی ابھی، کہتا ہوں۔ او کے (Ok)۔

(ریسیور رکھنے کی آواز)

ڈاکٹر : کون تھا؟

بوائے : (گھبرائی ہوئی آواز میں) نازی ملٹری سکریٹری کے پرائیوٹ سکریٹری کا فون ہے۔ رشتاغ میں ایک دم جنرل وان ڈف پر دورہ پڑا ہے سب ان کو سنبھالے بیٹھے ہیں اور وہ بار بار یہی کہہ رہے ہیں کہ صلح کرلینا چاہیے۔ انھوں نے صلح کرنے کے حق میں بہت بڑی تقریر کی ہے۔ آپ کو فوراً وہاں طلب کیا ہے۔

ڈاکٹر : صلح کا دورہ پڑا ہے۔ اچھا ہنڈ بیگ۔ انجکشن کا سامان وار اسپرٹ مکسچر کے تین چار ڈوز فوراً موٹر پر رکھو اور ان مریضوں کو دیکھتے رہو۔

ہوش میں آتے ہی مکسچر دیا جائے گا۔ میں جنرل ڈف کا علاج کرکے ابھی آتا ہوں۔ صلح کا دورہ (بڑبڑاتا ہوا جاتا ہے) صلح کا دورہ خطرناک بات ہے۔

(قدموں کی چاپ غائب ہو جاتی ہے اور موٹر روانہ ہونے کی آواز آتی ہے۔)

نرس : وارڈ بوائے۔ وارڈ بوائے۔

(شیشیاں اِدھر اُدھر رکھنے اور دوا انڈیلنے کی آواز)

بوائے : (آکر) مس صاحبہ مجھ کو پکارا تھا؟

نرس : دیکھو تم مریضوں کو دیکھتے رہو۔ ہوش آنے ہی والا ہے۔ یہ مکسچر فوراً پلانا ہوگا۔

بوائے : مس صاحبہ وہ دیکھیے آنکھیں کھول رہا ہے۔

نرس : اور یہ مریض بھی منہ چلا رہا ہے۔ (ذرا بلند آواز میں) کیسا ہے تم۔؟

مریض : (پاگلوں کی طرح ہنس کر) مارو۔ مارو (پھر خوفناک ہنسی ہنس کر) مارو۔ مارو۔ مارو۔ (قہقہہ)

نرس : بوائے فوراً مکسچر دو۔ ٹیکہ کامیاب رہا۔ اب اس کا دماغ ٹھیک ہے۔

بوائے : لو اسے پی لو۔ اے جی سنتے ہو اسے پی لو۔

مریض : (پاگلوں کی طرح ہنس کر) تم بھی مارو۔ اڑا دو۔ (ہنسنا)

بوائے : اسے پی لو بہادر نازی۔ جلدی سے پی لو۔

مریض : پی لو۔ پی لو۔ (ہنستا ہے) لاؤ۔ پلاؤ۔ پیو۔ پی لو۔ (ہنستا ہے)

نرس : بہت عمدہ۔ بہت اچھا اثر ہوا ہے بالکل ٹھیک ہو گیا ہے یہ مریض۔ بوائے دیکھو دوسرا مریض انگڑائی لے رہا ہے اس مریض کو ہٹا دو نہیں تو دونوں آپس میں لڑ پڑیں گے۔

بوائے : آؤ جوان ادھر آؤ۔ تمہیں بندوق دیں۔ توپ دکھائیں۔

مریض : (خوفناک ہنسی کے ساتھ) مار ڈالو۔ جو ملے مار ڈالو۔ کوئی نہ بچے (قہقہے فاصلے پر جا کر غائب ہو جاتے ہیں)

دوسرا مریض: (گھبرائی ہوئی آواز میں) توپ، بندوق (روتا ہے) توپ، بندوق (ہنستا ہے) توپ بندوق (قہقہہ)

نرس : لو جلدی سے یہ دوا پی لو۔ بہادر نازی۔ اسے پی جاؤ۔

دوسرا مریض: (قہقہہ بلند کرکے) توپ پلاؤ۔ بندوق۔ بندوق۔ بن اور دوق (قہقہہ)

نرس : اب تم بالکل ٹھیک ہو۔ بہادر ہو سپاہی ہو۔ لو اسے پی لو۔

دوسرا مریض: آگ لگا دو (قہقہہ بلند کرکے) اجاڑ دو۔ ویران کر دو۔ مارو لوٹو۔ (قہقہہ)

نرس : اوہ بہت عمدہ اثر۔ بالکل تندرست ہو گیا۔ اسے پی لو (کچھ پینے کی آواز) ٹھیک ہے۔

(موٹر رکنے کی آواز)

بوائے : (آتے ہوئے) ڈاکٹر صاحب آگئے شاید۔

نرس : (شیشی رکھتے ہوئے) ہاں ڈاکٹر آگئے۔

(قدموں کی چاپ)

ڈاکٹر : نرس کیا حال ہے مریضوں کا؟

نرس : بالکل ٹھیک ہوگئے۔ بڑا اچھا اثر کیا ہے ٹیکہ نے۔ جنرل وان ڈف کا کیا ہوا؟

ڈاکٹر : ایک دم دماغ سیدھا ہو گیا تھا۔ تقریر کرتے کرتے اس نے نازی

پالیسی کی دھجیاں اڑانا شروع کر دیں اور آخر میں تو ایسا بہکا کہ صلح کی اپیل کرنے لگا۔ میں نے جاتے ہی اس کو ریشتاغ سے نکالا۔

نرس : ریشتاغ کو تو ڈس انفکٹ Disinfect کرانا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر : اوہ۔ فوراً میں نے حکم دیا ہے کہ تمام بلڈنگ ڈس انفکٹ کی جائے اور تمام ممبروں کو وار اسپرٹ مکسچر کا ایک ایک ڈوز پینے کی ہدایت کی۔

نرس : تو اب جنرل وان ڈف ٹھیک ہیں نا بالکل؟

ڈاکٹر : ٹھیک کیسے نہ ہوتے ٹیکہ تو ان کے لگ ہی چکا تھا۔ میں نے جاتے ہی ان کو سو فی صدی کا اینٹی پیس Anti Peace انجکشن دیا۔ پہلے تو بہت اچھلے کودے اس کے بعد کھڑے ہو گئے تقریر کرنے اور جو کچھ صلح کی تائید میں کہہ چکے تھے خود ہی اس کی تردید کر دی۔

نرس : سب بہت خوش ہوئے ہوں گے۔

ڈاکٹر : گوئرنگ نے مجھ کو گود میں اٹھا لیا اور باقی تمام ممبروں نے مبارکباد دی۔ میں ان مریضوں کے خیال سے زیادہ ٹھہرا ہی نہیں۔ تو یہ مریض کیسے ہیں؟

نرس : ابھی ہوش میں آئے ہیں میں نے مکسچر پلا دیا ہے اور اب وہ بالکل نازیوں جیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ بلاؤں میں ان کو؟"

ڈاکٹر : ساتھ ساتھ نہیں۔ ایک ایک کر کے۔"

(نرس جاتی ہے)

بوائے : حضور اتنی جلد وہ پلٹے ہیں صحت کی طرف کہ تعجب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر : ان کو اس دوا سے ٹھیک ہونا ہی چاہیے تھا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر یہ دوائیں بے اثر ہوتیں تو آج میدان میں نازی

جھنڈے کے نیچے سرفروشی کرنے والا ایک بھی نہ ملتا۔

بوائے : دوائیں کیا ہیں جادو کا اثر رکھتی ہیں۔ بڑے بڑے پرانے اور پیدائشی صلح پسند راست باز۔ ایماندار سچے ایک ہی ٹیکے اور ایک ہی خوراک میں ایسے تندرست ہوئے کہ جیسے وہ کبھی بیمار ہی نہ تھے۔

(نرس آتی ہے اور اس کے ساتھ وحشیانہ طریقہ پر ہنستا ہوا مریض آتا ہے)

ڈاکٹر : کہو دوست کیا حال ہے۔ لڑائی پر جاؤ گے؟

مریض : ضرور جائیں گے۔ ماریں گے، لوٹیں گے (قہقہہ) توپ، بندوق، مشین گن (قہقہہ)

ڈاکٹر : مگر دیکھو تو یہ بات صلح کے خلاف ہے، صلح کتنی اچھی چیز ہے۔

مریض : صلح۔ ہش۔ صلح فالج کو کہتے ہیں۔ صلح بزدلی ہے۔ ہنگامہ آفت۔ قیامت (قہقہہ) توپ بندوق (مسلسل قہقہہ)

ڈاکٹر : شاباش بہادر مگر سنو تو سہی یہ لڑائی انسانیت کے خلاف ہے۔

مریض : انسانیت؟ (ہنستا ہے) انسانیت ڈھونگ ہے۔ نازی کو آدمی بنا دینے والی کمزور چیز، لڑائی کی دشمن، ہم لڑیں گے، قیامت مچا دیں گے۔

ڈاکٹر : یہ تو ٹھیک ہے بہادر سپاہی مگر ایمانداری؟

مریض : (بہت زور سے ہنس کر) ایمانداری؟ ایمانداری کو توپ سے اڑا دیں گے۔ ہم نازی ہیں ایمانداری سے لڑینگے۔ ایمانداری کا پیچھا کریں گے (قہقہہ)

ڈاکٹر : بالکل ٹھیک ہے۔ اچھا دیکھو نرس اس کے کان بہرے کر دو تاکہ یہ جنگ کے ہنگاموں کی آواز کے علاوہ اپنی ہی کہے کسی اور کی نہ سنے۔ یاد رکھو سب سے پہلا نازی اصول یہی ہے کہ بارہ ہاتھ کی زبان ہو۔

اور کان ندارد۔

نرس : میں اسے بہرا کیے دیتی ہوں عقل کے دروازے بند ہی ہو چکے ہیں اور اب یہ پورا نازی بن گیا ہے۔

ڈاکٹر : ہاں اسے بہرا کر کے چھاؤنی بھیج دو اور دوسرے مریض کو لاؤ۔

بوائے : لایئے مس صاحب میں اس کو بہرا کرنے کے کمرے میں پہونچا دوں۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی)

ڈاکٹر : (ریسور اٹھا کر) ہاؤس سرجن برلن ہاسپٹل۔ اچھا اچھا ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ بہت اچھا کیا (نرس آتی ہے) اور بہت اچھا انتظام ہے۔ بیشک ہم سب نے غلط سمجھا تھا۔ ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک۔ بائی بائی

نرس : کون تھا؟

ڈاکٹر : سپرنٹنڈنٹ پاگل خانہ۔ اس نے کہا کہ ہم لوگوں نے مدتوں سے یہ غلطی کی تھی کہ بہت سے پاگل جیل خانے میں بھر رکھے ہیں اور کارآمد نازیوں کو خواہ مخواہ پاگل خانہ میں بھر رکھا ہے مگر اب ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ان سب کو فوج میں ہونا چاہیے اور جیل والے قیدیوں کو اصل میں پاگل خانے میں جانا چاہیے۔

نرس : ڈاکٹر آخر اس بات پر آج تک کسی نے غور کیوں نہیں کیا تھا۔ وہ تو سچ مچ بنے بنائے سپاہی ہیں۔

ڈاکٹر : اور جیل والے بنے بنائے پاگل۔"

نرس : بالکل! اچھا تو اب اس غلطی کو ٹھیک کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر : ہاں۔ سارا پاگل خانہ خالی کر کے فرنٹ پر بھیج دیا گیا ہے اور جیل کو پاگل خانہ بنا دیا گیا ہے۔

نرس : ٹھیک ہے اچھا اب اس مریض کو دیکھو یہ چپ بہت رہتا ہے۔

ڈاکٹر : یہ تو وہی ہے نا جس کو آج ہی اس پہلے مریض کے ساتھ انجکشن دیا گیا ہے۔

نرس : ہاں ہاں وہی تو ہے۔

ڈاکٹر : کیوں تم کیسے ہو کیا حال ہے تمہارا؟

دوسرا مریض : میں خالی بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہوں۔ کس کا منھ نوچوں کس سے لڑوں (وحشیانہ طریقہ پر) کس کو گولی کا نشانہ بناؤں کس کو پھاڑ کھاؤں۔

ڈاکٹر : بُری بات۔ بہت بُری بات۔ یہ سب انسانیت کے خلاف باتیں ہیں۔

دوسرا مریض : انسانیت؟ انسانیت کیسی؟ (قہقہہ لگا کر) انسانیت کیا ہوتی ہے؟ ہم نازی ہیں۔ ارے ہم نازی ہیں۔ انسانیت کو ہم کیا کریں گے۔

ڈاکٹر : تم لڑنا چاہتے ہو مگر یہ تو بہت بری بات ہے کہ حق کے خلاف لڑو۔

دوسرا مریض : حق۔ ہمارا حق صرف لڑنا ہے۔ اُدھم مچانا ہمارا حق ہے۔ ہم صرف شرپسند ہیں۔ ہنگامہ ہمارا حق ہے۔ جنگ ہمارا حق ہے اور باقی حق کچھ نہیں۔

نرس : دیکھ رہے ہو ڈاکٹر کتنا حیرت انگیز طریقہ پر اثر ہوا ہے۔

ڈاکٹر : اس کو بھی بہرا کر کے چھاؤنی روانہ کر دو۔

مریض نمبر۲ : ہو (قہقہہ بلند کرتے ہوئے) چھاؤنی۔؟ چھاؤنی نہیں توپ۔ توپ کا گولہ۔ بم کا گولہ۔ (مسلسل قہقہے)

(آوازیں بتدریج غائب ہو جاتی ہیں۔)

میں جاتا ہوں

(معنون کرتا ہوں میں اپنے اس مضمون کو اُن سور ماؤں کے نام سے جو ہٹلر سے نہیں بلکہ اپنی بیویوں سے ڈرتے ہیں اور لڑائی پہ نہ جانے کا صرف یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ وہ کسی طرح نہیں مانتیں، حالانکہ ان کو منانے کی ترکیب کچھ اور ہی ہے۔)

گھر میں ایک کہرام تھا، بچے اجاڑ پھر رہے تھے، ملازم سہمے ہوئے سے نظر آرہے تھے۔ چولھا ٹھنڈا پڑا تھا، بلی بھوک کے مارے سب کے پیروں میں لپٹتی پھرتی تھی اور ہر ایک اس کو جھڑک دیتا تھا۔ بیگم لحاف کے اندر گھسی ہوئی رو رہی تھیں اور ہم آرام کرسی پر لیٹے ہوئے سیٹی بجا رہے تھے کہ یکا یک ڈیوڑھی سے آواز آئی۔

''سواری اتروالو'' بیگم نے لحاف کے اندر سے اپنا تمتمایا ہوا چہرہ نکالا۔ نوکر ڈیوڑھی کی طرف دوڑے، بچے کچھ ٹھٹک گئے، بلی نے کہا ''میاؤں'' اور ہم نے اپنے دل میں کہا الٰہی خیر۔

دیکھتے کیا ہیں کہ خوش دامن صاحبہ پانچے سنبھالتی گھر بھر کو گھورتی مسولینی کی طرح پھنکاریں مارتی تشریف لا رہی ہیں۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ ماجرا کیا ہے۔ کرسی سے اٹھ کر فرشی سلام کیا اور خشمگیں آنکھوں سے خشک قسم کا جواب پایا۔ گویا کہا تو گیا ''جیتے رہو'' مگر معنی اس کے یہ ہوئے کہ ''خدا غارت کرے تم کو''۔ خوش دامن صاحبہ ایک جنگی ٹینک کی طرح صحن کے نشیب و فراز طے کرتی ہوئی اپنی صاحبزادی

کے بستر کے پاس پہونچیں اور سرہانے بیٹھ کر پہلے تو اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو درست فرمایا اس کے بعد ہم کو آواز دے کر اس طرح طلب کیا گیا کہ گویا کوئی فوجی مجرم کورٹ مارشل کے لیے بلایا گیا ہو۔ مگر ہم ٹھہرے ہونے والے سپاہی جس کو کچھ ہی دنوں کے بعد میدان میں جا کر اس سے کہیں زیادہ خوفناک مناظر سے دوچار ہونا تھا لہٰذا فوجی جرأت کے ساتھ آرام کرسی سے اٹھے اور خوش دامن صاحبہ سے جا کر عرض کیا ''فرمایئے۔''

خوش دامن صاحبہ نے گوئرنگ کی طرح نتھنے پھلا کر کہا۔ ''یہ آخر تم نے کیا آفت مچا رکھی ہے؟ اگر بھیا تم کو اپنی جان کی پرواہ نہیں ہے تو کم سے کم ان معصوم بچوں کی طرف دیکھو آخر بیوی بچوں کا بھی کوئی حق ہے۔''

وہ پوچھ بیٹھیں بیوی بچوں کے حق کے متعلق اور ہم سوچ رہے تھے ساس کے حقوق کے متعلق، بہرحال ہم نے نہایت اطمینان کے ساتھ کہا۔ ''مجھے اپنی جان بھی عزیز ہے اور بیوی بچوں کی حق تلفی کا بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

خوش دامن صاحبہ نے ٹیپ کا بند ارشاد فرمایا۔ ''پھر یہ آخر لڑائی پر جانے کی کیا سوجھی ہے؟''

ہم نے ایک بہادر سپاہی کی طرح اس خطرناک سوال کا جواب دیا۔ ''اس لیے جانے کا ارادہ ہے کہ موت صرف ایک مرتبہ آتی ہے اور صرف میدان جنگ ہی میں نہیں بلکہ گھر کا پتہ بھی اس کو معلوم ہے اور اگر اس کو آنا ہے تو وہ یہاں تک آسکتی ہے۔''

خوش دامن صاحبہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آج تک کبھی لاجواب نہیں ہوئیں چنانچہ اس موقعہ پر بھی بولیں۔ ''یہ تو ٹھیک ہے کہ موت برحق ہے اور جو پیدا ہوا ہے اس کو ایک دن مرنا ضرور ہے مگر یہ تو جان بوجھ کر موت کے منھ میں

جاتا ہوا۔"

ہم نے کہا۔ "یہ آپ کیوں کر کہہ سکتی ہیں؟ آخر آپ لوگ اس بات کو اس رُخ سے کیوں دیکھتے ہیں؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ لڑائی پر جانے کے معنی یہ ہیں کہ موت کو گویا اپنے سے دور بھگایا جائے اور زندگی کو موت کے بھیانک درندوں کے چنگل سے آزاد کرایا جائے۔"

خوش دامن صاحبہ کی تعلیم ذرا واجبی سی ہے۔ لہٰذا وہ فوراً بولیں۔ "کیا مطلب ہے؟"

ہم نے مطلب سمجھاتے ہوئے یہ سمجھ کر کہ یہ کچھ بھی نہ سمجھی ہوں گی اور براہ راست اپنی بیٹی کی ماں ثابت ہوں گی۔ بہرحال کہنا شروع کیا۔

"یہ لڑائی دراصل موت اور زندگی کی لڑائی ہے۔ میں جس طرف سے لڑنے جارہا ہوں وہ طاقت زندگی حاصل کرنے اور زندہ رہنے کے حق کے لیے اس طاقت سے لڑ رہی ہے جو سوائے اپنے کسی اور کو زندہ دیکھنا ہی نہیں چاہتی۔ اگر جیت ہماری ہوئی تو ہم سب کی زندگی محفوظ اور بے خطر ہوگی ورنہ ہماری زندگی پر موت کی حکومت ہوگی۔"

بیگم صاحبہ نے اپنا دہکتا ہوا چہرہ اوپر اٹھا کر اپنی والدہ صاحبہ کی سرحد سے ہم پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیوی بچوں کا خیال تو اسے ہوتا ہے جو بیوی بچوں کو کسی شمار قطار میں بھی سمجھے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اسی بیوی بچوں کے جنجال سے اپنی جان چھڑانے کی یہ ترکیب نکالی ہے۔ مگر میں بھی کہے دیتی ہوں کہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر میں تو ہرگز جانے نہ دوں گی۔"

ہم نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنے کو ہٹلر اور مسولینی سے بھی بڑا خطرہ سمجھتی ہیں کہ گویا میں آپ سے بچنے کے لیے ان دونوں کے مقابلہ کو آسان سمجھتا

ہوں۔ مگر ہاں اتنا میں بھی جانتا ہوں کہ ان دونوں پر فتح پالینا آسان ہے مگر آپ......" بیگم نے بات کاٹ کر کہا۔ "آخر صاف صاف کیوں نہیں کہتے ہو کہ یہ سب کچھ کیوں کیا ہے اور یہ ارادہ کس وجہ سے ہوا ہے؟"

خوش دامن صاحبہ نے پھر اپنا رُخ بمشکل تمام یعنی بڑے اہتمام کے ساتھ ہماری طرف کرتے ہوئے فرمایا۔ "وہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ آخر بات کیا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "ان کو تو ہے وہم۔ نہ میں نے کسی خاص سبب کی وجہ سے یہ ارادہ کیا ہے نہ اس ارادہ کی کوئی اور وجہ سوائے اس کے ہو سکتی ہے کہ یہ ایک فرض ہے۔"

بیگم نے کہا۔ "خیر بس اب رہنے بھی دو۔ نہ پہلے کبھی اس فرض کا خیال آیا نہ کچھ۔ اس دن جب میں نے وہ موئے پتے کھیلنے کو منع کیا ہے اور ذرا سی بات کہہ کر ایک قیامت تم سے اٹھوائی ہے بس جب ہی سے یہ رٹ لگی ہوئی ہے۔"

خوش دامن صاحبہ نے پان کا تبادلہ ایک گال سے دوسرے گال کے ضلع میں کرتے ہوئے فرمایا۔ "پتے کیسے؟ کیا اب یہ شوق بھی ہوا ہے"

بیگم نے گویا آخری ترپ چلتے ہوئے کہا۔ "ایسا ویسا شوق! دن رات موئے پتے ہونے لگے ہیں، آدھی آدھی رات تک دوستوں کا مجمع ہے اور بازی پر بازی ہو رہی ہے۔ میں نے آخر اُس دن اتنی بات ضرور کہی کہ یہ موا منحوس کھیل ہے۔ جس گھر میں ایسے کھیل ہوں وہاں کبھی برکت نہیں ہو سکتی، پھر یہ کہ ایک تو اتنی سی تنخواہ میں یونہی خرچ چلنا دشوار ہے۔ دوسرے جب روپیہ لگا لگا کر تاش ہوں گے تو گھر کا خدا ہی حافظ ہے بس یہ کہنا تھا کہ جیسے کسی نے بارود میں آگ لگادی، بھڑ کے چھتے کو چھیڑ دیا، سارا گھر انھوں نے سر پر اٹھالیا یہ چیز توڑ وہ پھوڑ، کیتلی موئی ٹوٹی آئینہ چور چور ہو گیا اور۔"

ہم نے عاجز آ کر کہا۔ "ارے صاحب اسی وجہ سے تو منہ کالا کر رہا ہوں کہ

آپ کو میرے غصے، میرے جوئے اور میرے منحوس اشغال سے نجات مل جائے گی۔ اب آخر یہ دُکھڑا کیوں رویا جا رہا ہے۔''

خوش دامن صاحبہ نے اگال دان سے مشورہ کرنے کے بعد کہا۔''بھیا اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں تمہارا گھر ہے اور تمہاری کمائی چاہے اسے رکھو یا اُڑاؤ تمہیں اختیار ہے مگر ہاں اتنا میں بھی کہوں گی کہ اس موئے شوق کے پیچھے لاکھ کے گھر خاک ہوتے ہوئے دیکھے ہیں۔ اللہ بخشے تمہارے خسر کو گھوڑ دوڑ کا شوق تھا۔ ہزاروں روپیہ اس موئے شوق کے پیچھے پھونک دیا، مگر جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو ایسی توبہ کی کہ پھر کبھی گھوڑ دوڑ کا نام تک نہیں لیا۔''

ہم نے کہا۔''ارے صاحب، کبھی کبھی کا دل بہلاوا ہے۔ آج کل کون ایسا ہے جو برج نہ کھیلتا ہو، مہذب لوگوں کا خاص مشغلہ یہی ہے۔ میں تو خیر گھر ہی میں بیٹھ کر کھیل لیا کرتا ہوں ورنہ اور لوگ تو کلب میں جا کر کھیلتے ہیں اور ان کو کوئی بھی نہ جواری کہتا ہے نہ کوئی اس طرح ٹوکتا ہے۔ گھر سے رات بھر غائب رہتا یا دوسرے لوگوں کی طرح اس شوق کے بجائے کوئی اور شوق شروع کر دیتا تو پتہ چلتا ان بیگم صاحبہ کو کہ شوق کسے کہتے ہیں۔ مگر نہ مجھے دنیا کا کوئی شوق نہ میں کسی بُری بات میں۔ لے دے کر تاش کبھی کبھی کھیل لیتا ہوں تو تمام دنیا میں اس کا رونا رویا جاتا ہے۔ بہر حال اب یہ سب قصے ہی پاک ہوئے جاتے ہیں۔''

خوش دامن صاحبہ نے اپنے تمام اختیارات سے کام لے کر کہا۔''ہوش میں آ لڑکے۔ قصہ پاک ہوا جاتا ہے۔ جاؤ تو سہی لڑائی پر پھر دیکھو۔ یہ نہ سمجھ لینا گھر سے نکلنا ایسا آسان کام ہے۔''

ہم نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔''اب تو بہر حال طے ہی ہو چکا ہے۔ آج ۸ر تاریخ ہے، ۲۰ر کو بمبئی سے جہاز روانہ ہوگا اس پر روانگی کا

حکم مل چکا ہے۔''

بیگم نے کہا۔''سب کچھ طے ہو چکا ہے مارے غصے کے فوراً اپنے کو بھرتی کرا دیا۔ اس کے بعد ہی روانگی کا حکم بھی جا کر لے آئے۔''

خوش دامن صاحبہ نے ماتھے پر''ہائے بدبختی'' والا ہاتھ رکھ کر فرمایا۔''واہ واہ جس کا ایسا کچا ساتھ ہو کہ چھوٹے چھوٹے بچے جن کو ابھی ذرا بھی سمجھ نہیں، گھر میں کوئی دوسرا نہیں جو گھر سنبھال سکے نہ کوئی موٹی ایسی جائداد رکھی ہے کہ سب کا پورا پڑ جائے وہ ناسمجھی میں ایسی حرکت کر بیٹھے۔ اور آخر تھی یہ تمہاری بھی تو زیادتی تھی کہ مرد کو بات بات پر تم نے ٹوکا۔ اے تاش کھیلتے تھے تو تمہاری بلا سے، مرد نہ معلوم کیا کیا کرتے پھرتے ہیں۔ تمہارے باوا کو تو اگر میں آدھی بات بھی گھوڑ دوڑ کے لیے کہہ دیتی تو قیامت برپا کر دیتے۔ ایسی باتیں عورتوں کے سمجھانے سے تھوڑی سمجھ میں آیا کرتی ہیں جب سمجھیں گے خود ہی سمجھیں گے۔

ہم نے حالات امید افزا دیکھ کر کہا۔''میں خود کب یہ کہتا ہوں کہ تاش کھیلنا اچھی چیز ہے مگر دل بہلانے اور دن بھر کی دفتر کی چکی کے بعد دماغ تازہ کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ آخر ہونا ہی چاہیے۔ اگر کبھی ایک آدھ روپیہ لگا کر تاش کھیل لیے تو کون سا حرج ہو گیا۔ ہزاروں کمانے والا اگر دس پانچ اڑا بھی دے تو آخر اس میں اس قدر برہمی کی کون سی بات ہے کہ کھانا پینا چھوڑ دیا منہ پھلائے لیٹی ہوئی ہیں، بات کا جواب ندارد۔ سبحان اللہ گویا ہم آدمی تو ہیں نہیں جانور ہیں یا شاید یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ان کے زرخرید ہیں عجیب طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔''

خوش دامن صاحبہ نے موقعہ کی نزاکت اور بیٹی کے سہاگ کو مدنظر رکھ کر فرمایا۔''نہیں تم ٹھیک کہتے ہو یہ ان کی غلطی ہے۔ مگر بیٹا تم اس حکم کو کسی طرح ٹالو۔ ان کی ناسمجھی کی وجہ سے اتنی بڑی ناسمجھی تم کیوں کر رہے ہو؟''

ہم نے کہا۔ ''نا سمجھی تو خیر میں نہیں کر رہا ہوں۔ خدا اس موقعہ پر سب کو لڑائی پر جانے کی توفیق دے۔ بہر حال کوشش کروں گا کہ یہ حکم ٹل جائے۔''

اس معرکہ کے بعد سے گھر میں امن ہے۔ بھرتی تو خیر پہلے بھی نہ ہوئی تھی اور نہ ہمارے ایسے کمزور دل لڑائی کا تصور کر سکتے ہیں مگر وہ جو مثل ہے نا ''بوڑھا ڈرائے مرنے سے جوان ڈرائے نکلنے سے۔'' چنانچہ آموں کے پارسل کی بلٹی کو لڑائی پر جانے کا حکم کہہ کر سب کو دھمکا دیا اور اب نہ لڑائی ہے نہ کچھ۔ باہر مردانہ میں ٹھاٹھ سے تاش ہوتے ہیں اور اندر سے بیگم ہنسی خوشی اپنے جواری شوہر اور اس کے قمار باز دوستوں کو پان بنا بنا کر بھیجتی رہتی ہیں۔ بغیر لڑائی پر گئے ہوئے ہماری تو گویا یہی فتح ہے۔''

بوہنی میں السیٹ

آپ کا ایسا ہی برا بھلا کہنے کو جی چاہتا ہے تو آپ زیادہ سے زیادہ مجھ کو شاعر کہہ سکتے ہیں مگر مشاعرہ میں ہرگز نہیں ہوں۔ اور اگر آپ انصاف سے کام لیں تو یہ واقعی زیادتی ہے کہ ایک فرد واحد کو پورا مشاعرہ سمجھ لیا جائے۔ مگر مجھ بدنصیب پر یہ زیادتی ہو چکی ہے۔ جس کی داستان ذرا تفصیل طلب ہے۔

جھوٹ کیوں کہوں شاعر تو خیر میں ہوں۔ بھئی شاعر ہونا اسی کو کہتے ہیں نا کہ انسان کا ایک تخلص ہو، وہ شعر کہتا ہو، کہہ کر پڑھتا ہو اور اگر زیادہ شامت آجائے تو چھپواتا بھی ہو۔ مجھ کو اپنی تمام کمزوریوں کا اعتراف ہے۔ تخلص بھی ہے نظمیں اور غزلیں بھی کہتا ہوں مشاعروں میں شرکت بھی کرتا ہوں اور اپنا کلام رسالوں اور اخباروں میں چھپواتا بھی ہوں مگر اس کے باجود مجھ کو زیادہ سے زیادہ آپ شاعر ہی تو کہہ سکتے ہیں میں مشاعرہ کیوں کر ہو سکتا ہوں، مگر قسمت میں یہ بھی لکھا تھا، میں صرف شاعر نہیں بلکہ مشاعرہ بن کر رہوں چنانچہ قسمت کے لکھے کو میں نہ مٹا سکا۔

جرم صرف یہ ہوا کہ اپنے چند معاصرین کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ایک مشاعرے کے دعوت نامے کے جواب میں لکھ دیا کہ مجھ کو شرکت میں کوئی عذر نہیں مگر میں مشاعرہ کمیٹی سے اتنی رقم وصول کروں گا۔ ظاہر ہے کہ یا تو آدمی اس قسم کی ادبی محافل میں شرکت کی کوئی فیس ہی نہ لے اور اگر لینا ہی ہے تو پھر اپنے شایان شان

لے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ عام آدمی عموماً اور شاعر خصوصاً اپنی قیمت کا کچھ زیادہ ہی تخمینہ لگاتے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ مشاعرہ کمیٹی نے میرے مطالبہ کو بظاہر اپنی حیثیت اور دراصل میری اوقات سے زیادہ سمجھ کر مجھ کو لکھا کہ یہ بہت زیادہ ہے اس میں تخفیف فرمائی جائے۔ اس قسم کے موقعوں پر خود دار آدمی عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اگر مول تول کرے تو شاعری اور ترکاری میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اور اگر راضی برضا ہو جائے تو معاوضہ وہ ملتا ہے جس کی رسید دینے سے تو مر جانا ہی بہتر ہے۔ اور اس صورت میں اب اپنے مطالبے سے نیچے اترنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا خواہ مشاعرے کی شرکت سے محروم ہی کیوں نہ رہنا پڑتا۔ لہٰذا جواب میں ذرا تلخی سے لکھ دیا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ شاعر سے دام چکا رہے ہیں۔ اس ''فرش نشین'' مگر عرش نشین'' کو نیلام پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ اگر مطلوبہ رقم پیش کرنے سے آپ قاصر ہیں تو یہ خاکسار بھی شرکت مشاعرہ سے معذور ہے۔

زندگی میں پہلی مرتبہ تو مشاعرے کو ذریعۂ معاش بنانے کا ارادہ کیا اور اس میں بھی مول تول شروع ہو گیا۔ سبحان اللہ! اس کو کہتے ہیں ''بونی میں الیسٹ'' خیر۔ وہ کچھ بھی ہو مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ نیلامی بولیاں کوئی اپنے اوپر شروع کرا دے۔ شرکت مشاعرہ سے انکار کر کے مشاعرے کی طرف سے ایک آدھ دن میں صبر آ ہی گیا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ صبر آخر آ ہی جاتا ہے اور وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ مگر اس سے زیادہ سچی بات کسی نے یہ کہی ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، یعنی قطعی غیر متوقع طور پر اس مشاعرے کے سکریٹری صاحب کا پھر ایک گرامی نامہ موصول ہوا کہ ''مشاعرہ کمیٹی نے آپ کے والا نامہ پر غور کرنے کے لیے ایک خصوصی اجلاس طلب کیا اور گرما گرم مباحثہ کے بعد آخر کار طے یہ ہوا کہ آپ کا مطالبہ منظور کر لیا جائے۔ چنانچہ گذارش یہ ہے کہ اب آپ مقررہ تاریخ پر پہونچنے کے لیے صبح کی

ٹرین سے روانہ ہو جائیں تا کہ شام کو یہاں پہنچ سکیں اور آپ کا استقبال آپ کے شایان شان ہو سکے۔''

کیوں صاحب ان حالات میں اگر یہ خط آپ کے پاس آتا تو کیا آپ کو اپنی اہمیت کا احساس نہ ہوتا اور کیا آپ غور نہ کرتے کہ صرف آپ کے ایک خط پر غور کرنے کے لیے ایک عظیم الشان مشاعرے کی مشاعرہ کمیٹی کا اجلاس خصوصی طلب کیا گیا اور اس میں گرما گرم مباحثہ ہوا اور فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہوا۔ پھر یہ کہ آپ کے شایان شان استقبال تک کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آپ یقیناً اس خط کو بار بار پڑھتے جیسا کہ میں نے پڑھا اور ایک ایک لفظ کے معنی نکالتے جس طرح میں نے نکالے اور آخر اس استقبال کے شایان شان اپنے کو بنانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کہ سیاہ شیروانی تو ہونا ہی چاہیے اس لیے کہ ایک تو یہ شام کا لباس ہے۔ دوسرے سیاہ شیروانی پر سفید ہار کے سفید پھول خوب کھلتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ٹرین سے اترتے ہی مشاعرہ کمیٹی کے لوگ استقبال کی ابتداء ہار پہنا کر کریں گے اور فوٹو گرافر مختلف زاویوں سے تصویریں بھی لیں گے۔ ان تصاویر میں سیاہ شیروانی اور اس پر ہاروں کے سفید پھول پھوٹ نکلیں گے۔ پھر شیروانی تو تصویر کو سجا دیتی ہے بشرطیکہ چوڑی دار پاجامہ کسی موچی نے نہیں بلکہ کسی باقاعدہ درزی نے سیا ہو۔ شیروانی بغیر چوڑی دار پاجامہ کے سہاگن نہیں معلوم ہوتی اور چوڑی دار پاجامہ بغیر پھول دار موزوں اور واڈلس کے پمپ کے کچھ بندوق کا غلاف بن کر رہ جاتا ہے۔ لطف آجائے اگر اس لباس پر ایک اعلیٰ درجہ کی جناح کیپ بھی ہو۔ اس تمام سامان کا تخمینہ ذرا حوصلہ شکن ضرور تھا مگر مشاعرہ کمیٹی سے جو رقم طے ہوئی تھی اس میں یہ چیزیں بھی شامل تھیں۔ چنانچہ یہ تمام سامان خریدنے میں پوری ریاست سے کام لیا گیا اور درزی کو ہدایت کر دی کہ اجرت کا کوئی سوال نہیں البتہ شیروانی ایسی ہو کہ مشاعرہ لوٹ

لائے اور چوڑی دار پاجامہ بھی ایسا ہو کہ حاصل مشاعرہ سمجھا جائے۔ کرتا آپ کی دعا سے موجود تھا جو اسی قسم کی تقریبات کے لیے تبرک کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ اس کرتے پر جو بیل کڑھی ہوئی ہے اس کے پھولوں کو اکثر دھوکہ کھا کر سونگھ لیا کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں اسی کرتے کی سب سے زیادہ فکر تھی اور شکر ہے کہ یہ کُرتہ مع اپنے گریبان کے اگست ۱۹۴۷ء کے دست وحشت سے صاف بچ گیا۔ اس کرتے کے نیچے جالی دار بنیان کچھ ایسا منظر پیش کرتی ہے گویا جمنا کے اندر تاج محل کا عکس پڑ رہا ہو۔ مگر معاف کیجیے گا یہ ایک غیر ملکی قسم کا استعارہ ہے۔ استعارہ بھی نہیں بلکہ غیر ملکی تشبیہ ہے تو اب اس کو یوں سمجھئے کہ اس کرتے کے نیچے جالی دار بنیان ایسی معلوم ہوتی ہے گویا سمندر میں کلفٹن جھانک رہا ہو۔ مگر ان چیزوں کے علاوہ سفر کے لیے اور ایسے سفر کے لیے جس کا اختتام عظیم الشان استقبال پر ہونے والا ہو۔ بے شمار چیزوں کی ضرورت تھی۔ مثلاً ایک اعلیٰ درجہ کا سوٹ کیس ہونا چاہیے تھا۔ خیر وہ تو بیگم صاحبہ نے کہا کہ میں اپنے بھائی جان سے منگا دوں گی۔ بستر کے لیے ہولڈال تو خیر موجود تھا مگر اس کے تسمے گھوڑے تانگے کا کھیل کھیلتے ہوئے بچے اپنے صرف میں لا چکے تھے لہٰذا وہ بھی خریدے گئے۔ اب رہ گیا بستر کا سامان۔ اس سلسلہ میں آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ آپ کا یہ غلام بے حد خوش قسمت واقع ہوا ہے۔ بستر کی سب سے بڑی چیز ہے۔ لحاف۔ وہ بیگم صاحبہ کے جہیز میں آیا تھا اور اگر انکسار سے کام نہ لیا جائے تو وہ دراصل اس قابل ہے کہ فریم کرا کے گول کمرے میں لگا دیا جائے۔ یہ لحاف عام طور پر ایک بڑے سے صندوق میں بند رہتا ہے اور اس کو استعمال کرنے کے لیے اس خاکسار کو انتظار ہے کسی ایسے وقت کا جب اس کارساز کی قدرت کاملہ کسی ملک کی فرمانروائی عطا کرے گی تو شاہی چھپر کھٹ پر یہ لحاف زیب دے گا۔ مگر اس مشاعرے کے لیے بیگم نے اس لحاف کو استعمال کرنے کی اجازت دیدی۔ پھر

گھر بھر کے تکیے جمع کیے گئے اور ان کا طبی معائنہ شروع ہوا کہ ان میں سے وہ کون سے دو تکیے ہیں جو کم سے کم مرمت کے بعد بادیٔ النظر میں تکیے سمجھے جا سکیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ شہر میں بلوہ ہوگیا ہے اور یہ تکیے نہیں بلکہ اس بلوے کے زخمی یہاں لا کر تلے اوپر ڈھیر کر دیے گئے ہیں۔ بمشکل تمام دو تکیے نظرِ انتخاب کا مرکز بنے اور طے پایا کہ تکیہ بذات خود کوئی چیز نہیں تکیے کو تو اس کا غلاف سجاتا ہے اور غلاف خدا کے فضل سے ایسے ایسے ہمارے یہاں موجود ہیں کہ لوگوں کو چاہیے کہ دور دور سے دیکھنے کو آئیں اور سیاحوں کی نظر پڑے تو تصویریں اتار لے جائیں۔ چنانچہ ان دو تکیوں کے لیے جو دو غلاف نکالے گئے ان میں سے ایک پر اُودے نیلے۔ پیلے ریشم سے کڑھا ہوا تھا Wel come اور دوسرے پر ایک ایسی چڑیا کی دیدہ زیب تصویر تھی جس کو دیکھ کر علم حیوانات کے ماہر حیران ہیں کہ یہ آخر کس نسل کی چڑیا ہے اور دنیا کے کس حصے میں پائی جاتی ہے۔ بستر کی چادر البتہ کوئی ایسی نہ تھی جو ایسے تکیوں اور ایسے لحاف کے ساتھ سج سکے۔ متعدد بکس ٹٹولنے کے بعد ایک خوبصورت چادر مل تو گئی مگر اس میں یہ نقص نکل آیا کہ اس کے کناروں پر چاروں طرف عجیب عجیب مصرعے چھپے ہوئے تھے۔ مثلاً ع

روزیٔ خود میخورد برخوان تو

ظاہر ہے کہ ایسی چادر ساتھ لیجانے سے تو یہی اچھا تھا کہ بغیر بستر کے پہونچ جاتے۔ مگر واہ ری منتظم بیوی۔ دروازے کا ایک پردہ اتار کر اس کے کڑے نکال دیئے اور اب جناب وہ ایسی لاجواب چادر بنی ہے کہ بس دیکھا کیجیے۔ خدا خدا کر کے بستر اور سوٹ کیس کا سامان مکمل ہوگیا اور اب اس سفر کے لیے صرف دو چیزوں کی ضرورت تھی۔ ایک ذرا خوبصورت سا لوٹا دوسرے ذرا مناسب سلیپر۔ لوٹوں کے سلسلہ کی مجبوری یہ تھی کہ جو لوٹے صورت شکل کے اعتبار سے درست تھے وہ ٹپکتے تھے

اور ایک لوٹا جو ٹپکتا نہ تھا اس کی ٹونٹی خدا جانے کسی حادثہ میں ٹوٹ گئی تھی اور بیگم صاحبہ اس بات کی سخت مخالف تھیں کہ اتنے بڑے شاعر کے لیے ایک لوٹا تک کسی سے مانگا جائے۔ کافی غور و فکر کے بعد طے پایا کہ لوٹا دراصل عہد جہالت کی یادگار ہے اور اس روشنی اور ترقی کے دور میں بغیر لوٹے کے بھی زندگی بسر ہو سکتی ہے بلکہ وہ زندگی جو لوٹے کے ساتھ بسر ہو نہ ترقی یافتہ زندگی کہلاتی ہے نہ ترقی پسند زندگی۔ چنانچہ لوٹا تو لایا گیا تخفیف میں اور سلیپر کی جگہ بیگم صاحبہ نے مشورہ دیا کہ وہ پھول دار کھڑاویں رکھ لیں جن میں سے ایک کی کھونٹی رات سے غائب تھی۔ مگر حال ہی میں پتہ چلا کہ شطرنج کے مہروں میں رکھی ہوئی ہے اور بادشاہ کے بجائے اس لیے استعمال ہوتی ہے کہ شاہ موصوف فقیری لے کر مدت سے مفقود الخبر ہیں۔ بہر حال وہ کھڑاویں بھی احتیاطاً رکھ لیں کہ "داشتہ آید بکار"۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جس کے لیے دن گنے جا رہے تھے۔ گھڑی میں آدھی رات کا الارم لگا کر سوئے تھے مگر الارم بجنے سے پہلے ہی بیدار ہو کر الارم کو بجنے کی زحمت سے بچایا۔ راتوں رات نہا دھو کر سج بن کر تیار ہو گئے اور صبح ہوتے ہی گھر سے اپنا سامان اور بیوی کی دعائیں لے کر اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ جب منزل مقصد پر شاندار استقبال ہونے والا ہو تو راستہ خواہ مخواہ طویل ہو جاتا ہے اور وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ ہر چند کہ اپنے نزدیک ٹرین میں سوئے بھی۔ مشاعرے میں جو غزل پڑھنے والے تھے اس پر بار بار نظر ثانی کی۔ اس کی دھن بٹھائی۔ کئی مرتبہ غسل خانہ میں جا کر آئینہ کے سامنے وہ غزل پڑھ پڑھ کر اپنے کو سنائی۔ داد پر سلام کرنے کے طریقوں کا ریہرسل کیا اور آخر جب منزل مقصد قریب آئی تو سوٹ کیس سے برش نکال کر پہلے سیاہ شیروانی کو صاف کیا۔ پھر وارنش کے پمپ کو چمکایا چوڑی دار پاجامے کی چوڑیاں مرتب کیں۔ ہاتھ منہ دھو کر بال بنائے جناح کیپ کے زاویے درست کیے۔ یہاں

تک کہ وہ اسٹیشن آ گیا جس پر شعر و ادب کے ایک دیرینہ خدمت گذار کو اس کی خدمات کا صلہ ملنے والا تھا۔ شوق نے کہا مار چھلانگ پلیٹ فارم پر۔ ضبط نے کہا خیر مقدم کرنے والوں کو آنے دو۔ یہی وقت ہے رکھ رکھاؤ کا۔ چنانچہ ایک اخبار لے کر بیٹھ گئے جو اس وقت کسی ایسی زبان کا اخبار معلوم ہو رہا تھا جس کے گویا حرف شناس ہی نہ تھے۔ یہاں تک کہ انجن نے روانگی کی سیٹی دے دی اور اب اس رکھ رکھاؤ کو اٹھانا ہی پڑا۔ ہولڈال پلیٹ فارم پر پھینکا۔ سوٹ کیس ہاتھ میں لیا اور پلیٹ فارم پر آ گئے۔ جہاں حدِ نظر تک نہ اس عظیم الشان مشاعرے کی مجلس انتظامیہ کے ممبر تھے۔ نہ پھولوں کے ہار لیے ہوئے مشاعرے کے رضا کار۔ نہ فوٹو گرافر۔ اخبار پر تاریخ دیکھی کہ کہیں مارے شوق کے ایک دن پہلے تو نہیں آ گئے۔ اسٹیشن کا نام پڑھا کہ کہیں غلط جگہ تو نہیں اتر گئے اور جب ہر طرح سے اطمینان کر لیا تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک صاحبزادے نے قریب آ کر کچھ سونگھنے کے انداز سے کہا:

"جناب لاہور سے تشریف لائے ہیں؟"

عرض کیا: "جی ہاں حاضر تو ہوا ہوں لاہور سے، یہاں ایک مشاعرہ ہے۔" وہ بات کاٹ کر جلدی سے بولے "او ہو میں تو آپ کو بڑی دیر سے ڈھونڈھ رہا تھا اور اب تو مایوس ہو چلا تھا۔ بہر حال تشریف لائیے۔" اور ایک قلی سے ارشاد فرمایا کہ سامان اٹھائیے۔

اسٹیشن سے جائے قیام تک ایک ایسے تانگے پر لائے گئے جس کا گھوڑا اءٌ لبًا سودا کے گھوڑے کی نسل کا چشم و چراغ تھا۔ اور ٹھہرائے گئے ایک ایسے خانۂ بے تکلف میں جو تھانوی کی رعایت سے کچھ تھان کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ ہم تو دم بخود تھے مگر وہ سودا کے گھوڑے کی نسل کو گھوڑا او فور مسرت سے ہنہنا رہا تھا۔ اسٹیشن پر جس سناٹے کے ساتھ خیر مقدم ہوا تھا اس کے معنی یہ پیدا کیے تھے کہ اسٹیشن پر استقبال مناسب نہ سمجھا

گیا ہوگا اور طے ہوا ہوگا کہ جائے قیام پر گارڈ آف آنر کا معائنہ کرایا جائے۔ مگر یہاں بھی ایسی ویرانی سی ویرانی تھی کہ دشت کو دیکھ کر گھر یاد آرہا تھا۔ بڑی دیر کے بعد ایک صاحب دانت نکالے اور ناک ضبط کیے ہوئے تشریف لائے۔ آداب عرض۔ تشریف لائیے۔ بڑی لیٹ ہوگئی آج گاڑی۔" کاش ان حضرات کو معلوم ہوتا کہ گاڑی سے زیادہ تانگہ لیٹ ہوا تھا جس کا گھوڑا عروض کی پابندی کے ساتھ ہر قدم ناپ تول کر اٹھاتا تھا۔ ان حضرت نے نہایت بے تکلفی سے فرمایا۔ "میری رائے میں مشاعرے کے بعد ہی طعام کا بندوبست کیا جائے اس لیے کہ کافی دیر ہو چکی ہے۔"

عرض کیا۔ "جی ہاں یہی مناسب ہوگا۔"

وہ حضرت بولے "یہ رہا مشاعرہ دس قدم پر تو ہے ہی تشریف لائیے۔"

آگے آگے وہ حضرت اور پیچھے پیچھے یہ خاکسار۔ اس گلی میں داخل ہو کر اس گلی میں برآمد ہوئے اور اس گلی سے مڑ کر پھر ایک گلیارے میں پہونچے۔ یہاں تک کہ گلیاں بھی ختم ہوگئیں اور ایک سپاٹ میدان شروع ہوگیا جس کے ایک گوشے میں کچھ شامیانہ سا نظر آیا۔ کچھ روشنی بھی تھی اور زندگی کے کچھ ایسے آثار تھے جیسے کسی جنازے کی آمد پر قبرستان میں نظر آتے ہیں۔ ابھی ہم لوگ دس پانچ قدم اُدھر ہی تھے کہ ایک صاحب نے لپک کر ہمارے رہنما سے پوچھا۔ "کیوں بھئی آگئے وہ حضرت یا لعنت بھیجی جائے؟"

رہنما نے انگشت شہادت لبوں پر رکھ کر آنکھ سے کچھ ایسا اشارہ کیا کہ وہ حضرت کچھ ٹھٹھک کر رہ گئے اور نہایت منافقت سے فرش راہ ہوتے ہوئے بولے۔ "تشریف لائیں حضور بڑا انتظار کرایا آپ نے غالباً ٹرین کافی لیٹ تھی" اور حضور جی ہاں۔ اور جی نہیں قسم کے واجبی جواب دیتے ہوئے پنڈال میں پہنچ گئے۔ جہاں کسی کے اشارے پر پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔ یہ تالیاں اس کسمپرسی کے عالم

میں بڑی غنیمت محسوس ہوئیں اور وہ احساس کمتری جو خودکشی کی طرف متوجہ کر رہا تھا ان تالیوں میں جیسے اڑ سا گیا۔ ابھی پنڈال تالیوں سے گونج ہی رہا تھا کہ ایک نمانوجوان نے مائیکروفون کے قریب جا کر حاضرین کو مخاطب کیا۔

حضرات ہمیں افسوس ہے کہ ٹرین کے اتفاقاً لیٹ ہوجانے کی وجہ سے ہمارے مہمان محترم دیر سے پہونچے اور آپ کو انتظار کی صبر آزما گھڑیاں گذارنا پڑیں۔ حضرات اگر یہ عام مشاعرہ ہوتا تو آپ کی ضیافت طبع کے لیے ہم دوسرے شعراء کو پیش کرتے رہتے اور یہ وقت کشمکش انتظار میں یوں نہ کٹتا۔ مگر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ مشاعرہ قائداعظم میموریل فنڈ کے لیے منعقد کیا گیا ہے ارادہ یہ تھا کہ اس کی کل آمدنی اخراجات وضع کر کے اسی فنڈ میں دیدی جائے گی۔ ہم نے اس مشاعرہ کے لیے شعراء کی اچھی خاصی فہرست بنائی تھی مگر باوجود اس کے کہ ہم نے متعدد خطوط لکھ کر اپنے اس مہمان محترم کو جو تشریف لائے ہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس مقصدی مشاعرے کی شرکت میں تجارتی لین دین سے کام نہ لیں۔ موصوف اپنے گراں قدر مطالبے سے قطعاً نیچے نہ اترے اور آخر ہم کو یہ طے کرنا پڑا کہ منھ مانگی رقم آپ کو پیش کردی جائے خواہ کسی اور شاعر کو ہم نہ بلا سکیں۔" بھرے پنڈال سے نعرہ بلند ہوا۔ "شرم شرم"

اور ہم نے محسوس کیا کہ ہم کچھ ڈوب سے رہے ہیں۔ مقرر کی تقریر جاری تھی۔

حضرات ہمارا اور آپ کا فرض اب یہ ہے کہ اپنے مہمانِ محترم پر قناعت کریں اور پورا وقت آپ ہی کو دے کر آپ کا کلام ذرا تفصیل سے سنیں۔"

ہم کو محسوس ہوا گویا ہم مشاعرے میں نہیں بلکہ ہوائی جہاز پر سفر کر رہے ہیں اور جہاز اس وقت بادلوں کے اوپر پرواز کر رہا ہے۔ اسی وقت خدا جانے کس بزرگ نے سہارا

دے کر ہم کو مائیکروفون کے قریب لا کر کھڑا کیا اور ہم نے بہت کچھ سنبھل کر ایک غزل شروع کی جس کا پہلا مصرعہ اس غزل کا تھا جو ہم پڑھنا نہ چاہتے تھے مگر دوسرا مصرعہ اس غزل کا تھا جو ہم پڑھنا چاہتے تھے یعنی دوسرا مصرعہ اس غزل کا تھا جو خدا جانے اس وقت کیوں یاد آ گئی تھی۔ پنڈال قہقہوں اور تالیوں سے گونج رہا تھا۔ معلوم نہیں کس خدا ترس کو ہم پر رحم آیا اور ہمارے سامنے پانی کا گلاس پیش کیا گیا۔ اس عرصہ میں سکریٹری صاحب مشاعرے نے سامعین کو شرافت کے چند درس دیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ چپ ہو گئے اور پانی پینے کے بعد ہم نے بجائے غزل پڑھنے کے اعلان کیا۔

''حضرات میں نے اس مشاعرہ کمیٹی سے جو مطالبہ کیا تھا۔ اس کے لیے میرا ارادہ یہ تھا کہ میں وہ کل رقم اپنی طرف سے قائداعظم میموریل فنڈ میں پیش کر دوں گا چنانچہ سکریٹری صاحب مشاعرہ سے درخواست کروں گا کہ وہ رقم میری طرف سے اس فنڈ میں شامل کر لی جائے۔''

کسی غزل پر مجھ کو کبھی اتنی داد نہ ملی تھی جتنی اس اعلان پر ملی اور پھر جو غزل پڑھی مقبول ہوئی۔ (ماہ نو کراچی)

اگر میں تھانیدار ہوتا!

''جمنا مہاراج! جمنا مہاراج۔''

جمنا مہاراج۔ ''کون ہے بھیا۔''

''ارے مہاراج نکلو تو سہی۔ میں ہوں پرشادی۔''

جمنا مہاراج : ''کون؟ پرشادی بھیا۔ کہو کیسے درشن دئے؟''

پرشادی : ''ارے درشن ورشن نہیں دئے وہ دیکھو تمہارے کھیت میں ایک گھوڑا جانے کہاں سے گھس گیا ہے اور سب کھیت ٹھکانے سے لگائے دیتا ہے۔''

جمنا مہاراج : ''کیا کہا گھوڑا؟ لانا تو میری لاٹھی۔''

پرشادی : دوڑو جلدی سے وہ تو نہ جانے کب سے کھیت کو کھلیان بنا رہا ہے''

جمنا مہاراج : ''پرشادی بھیا تم ادھر سے گھیرو اور میں ادھر سے ہکاتا ہوں وہ لاٹھی دی ہو کہ آج ہو ساڑھے تین ٹانگ کا ہو جائے۔''

پرشادی : ''پہلے پکڑ لو اس کو پھر ذرا کٹائی کی جائے۔''

جمنا مہاراج : ''مگر ہے وہ کدھر؟''

پرشادی : ''وہ دیکھو وہ۔''

جمنا مہاراج : ''وہ؟''

پرشادی : ''ہاں ہاں وہ کیا ہے۔''

جمنامہاراج : ''ارے بھیا وہ تو داروغہ جی کا گھوڑا ہے بس چپکے سے ہکا دو۔ مارنا وارنا نہیں۔''

پرشادی : ''کیا کہا دروغہ جی کا گھوڑا ہے۔ تو بھیا تم ہی ہکاؤ۔''

جمنامہاراج : ''تو کیا ہکایا بھی نہ جائے اس کو۔''

پرشادی : ''تم جانو مہاراج ہم تو اس گھوڑے سے کچھ نہ بولیں گے۔''

جمنامہاراج : ''کیوں نہ بولو گے۔''

پرشادی : ''ارے ہاں کون حاکموں کی بات میں بولے دروغہ جی ہمارے مالک ہیں۔ بھلا ہماری یہ مجال ہے کہ ہم ان کے گھوڑے سے بولیں۔''

جمنامہاراج : ''اچھا اچھا وہ دیکھو نہ تم ہکاؤ نہ میں وہ تو خود ہی کھیت سے نکل گیا۔''

پرشادی : ''چلو چھٹی ملی۔''

جمنامہاراج : ''مگر بھیا آج یہ معلوم ہوگیا کہ تم بھی دروغہ جی سے بہت ڈرتے ہو۔''

پرشادی : ''ڈرتے نہیں ہیں مگر ہاں یہ بات ہے کہ وہ بہت بڑے حاکم ہیں۔ ارے مہاراج ہم تو ہم زمیندار صاحب ان کا رعب مانتے ہیں اور سچ پوچھو تو ان سے بڑا حاکم ہے کون اب۔''

جمنامہاراج : ''سچ کہتے ہو بھیا مگر یہ تو بتاؤ کہ اگر تم کو دروغہ جی بنا دیا جائے تو تم کیا کرو۔''

پرشادی : ''کیا بات کرتے ہو مہاراج تم بھی کوئی سنے تو کہے کہ دارو پی گئے ہیں۔''

جمنامہاراج : ''پھر بھی آخر یہ بتاؤ کہ تمہاری تھانیداری کیسی ہو۔''

پرشادی : ''مہاراج سچ جانو کہ اگر ہم کو دروغہ بنا دو تو ہم دکھا دیں کہ دروغہ ہوتا کیا ہے۔ ہم ان دروغہ کی جگہ ہوتے تو آج سب کہتے کہ ہاں یہ ہے دروغہ۔''

جمنامہاراج : ''وہ کیسے بھلا؟''

پرشادی : ''وہ ایسے کہ ہماری دروغائی میں تھانے پر دن رات بس ڈانٹ ڈپٹ۔ لکھا پڑی۔ پہرا چوکی نہ ہوتا۔ ہاں موقع موقع سے یہ باتیں ہو جایا کرتیں۔ نہیں تو ہم بھائی برادری کو تھانے میں جمع رکھتے اور سب کے بیچ میں دروغہ بن کر بیٹھتے رنگ رلیاں ہوتیں گانا بجانا کھانا کھلانا پینا پلانا ہوا کرتا اور یہ معلوم ہوتا کہ جانو ہر وقت تھانے میں کوئی برات ٹھہری ہوئی ہے۔''

جمنامہاراج : ''یہ وزن ہوتے پرشادی بھیا۔''

پرشادی : ''اور نہیں تو کیا ہم بھی دروغہ جی کی طرح ہر وقت کمر کسے بیٹھے رہتے۔ اور راتوں کو دربدر گشت کرتے۔''

جمنامہاراج : ''تو یہ کہو کہ ریاست ہوتی تمہاری تھانیداری بھی۔''

پرشادی : ''اب تم ہی دیکھو مہاراج کہ اتنا بڑا حاکم جس کو زمیندار تک جھک جھک کر سلام کریں ہر وقت دوڑا دوڑا پھرتا ہے۔ نہ دن کو چین ہے نہ رات کو آرام۔ یہ بھی کوئی حاکم ہونے کی نشانی ہے۔ ہم تو بس اپنے چھپر کھٹ پر نائی سے پیر دبواتے اور ناریل گڑگڑاتے۔ ہر وقت جنگل میں منگل ہوتا۔ تھانے میں پکوان پکتے ہم بھی خوش رہتے اور ہمارے سپاہی بھی۔''

جمنا مہاراج : "یہ تو سب ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤ کہ جب تمہارا کوئی حاکم پوچھتا تو کیا جواب دیتے۔"

پرشادی : "ہمارا حاکم کون ہوتا ہم تو سب کے حاکم ہوتے۔ اور جو کوئی ہماری بات میں ٹانگ اڑاتا تو پھر تم جانو کہ اس کو بندھوا کر ڈنڈا مہاراج سے خبر لی جاتی۔"

جمنا مہاراج : "تو یہ کہو کہ تمہارا کوئی حاکم ہی نہیں ہوتا۔"

پرشادی : "کیسی باتیں کرتے ہو مہاراج دورغہ کا بھی کوئی حاکم ہوسکتا ہے۔ ارے مہاراج زمیندار تک سلام کرتا ہے اور کسی کو کیا کہیں۔"

جمنا مہاراج : "تو بھیا ان رنگ رلیوں میں چوری چکاری بھی خوب ہوتی۔"

پرشادی : "چوری چکاری کی تو بات یہ ہے کہ ہم بھیا سب سے صاف صاف کہہ دیتے کہ جو کوئی کسی چور کو پکڑ کے ہمارے پاس لے آئے تو ہم خود گلے گلے پانی اس کے لیے تیار ہیں کہ مارتے مارتے بھرکس نکال دیں مگر جو کوئی ہم سے یہ کہے کہ چور تو چوری کر کے بھاگ جائے اور ہم اس کے لیے دوڑے دوڑے پھریں تو صاف بات یہ ہے کہ ہم ٹھہرے حاکم کسی کے باپ کے نوکر نہیں ہیں۔"

جمنا مہاراج : "ہاں یہ تو قاعدے کی بات ہے۔ مگر بھیا یہ بھی تو سمجھو کہ پولیس کا کام یہ ہے کہ رعایا کو چوروں سے بچائے بدمعاشوں سے بچائے اور ان کی جان اور ان کے مال کی رکھوالی کرے۔"

پرشادی : "یہ سب جھگڑا ہے مہاراج ہم حاکم ہو کے یہ نوکری نہیں کر سکتے۔ ہاں چور کو پکڑ لاؤ تو سزا دینا ہمارا کام۔ جتنی کہو سزا دیدیں اور جس کو کہو سزا دے دیں مگر اس کے لیے مارے مارے پھرنا ہم حاکموں

کا کام نہیں ہوسکتا۔"

جمنا مہاراج : "مگر پرشادی بھیا تمہاری دورغائی دروغائی میں گاؤں والوں کا تو راج ہوتا۔"

پرشادی : "بھلا مہاراج یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ مگر ایک بات ہے کہ سب گاؤں والوں کا راج نہیں ہوسکتا تھا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ نتھا چمار نے ہمارے بیل کو ذرا سا سینگ مارنے پر لاٹھی ماردی۔ ہم بھیا چپ ہو رہے کہ کون اس کے منہ لگے لیکن اگر دروغہ ہوتے تو بس پھانسی ہی دیدیتے دو تین برس کی۔ ہاں جو گاؤں والے ہمارے بھائی برادری کے ہیں اور بھائی برادری رکھتے ہیں ان کے لیے ہماری دروغائی میں راج ہوتا۔"

جمنا مہاراج : "اور جو ہم اس وقت تمہارے گھوڑے کو اپنے کھیت سے مار کے نکال دیتے تو؟"

پرشادی : "یہ بات تو ذرا بیڈھب کہی۔"

جمنا مہاراج : "نہیں نہیں سچ سچ بتاؤ کہ تم کیا کرتے۔"

پرشادی : "سچ پوچھو تو ہم کو مہاراج بڑا غصہ آتا اور تمہارا کھیت روندوا دیتے گھوڑوں سے۔"

جمنا مہاراج : "یہ بات ہے کہ تمہارے دروغہ جی سے اتنے ڈرتے کہ ان کے گھوڑے کو بھی نہ ہنکایا۔"

پرشادی : "ہاں مہاراج کون حاکموں کے گھوڑوں سے بولے۔"

جمنا مہاراج : "تو بھیا تمہاری دروغائی سے یہی دروغائی اچھی ہے کہ ہم نے بیسوں دفعہ اس گھوڑے کو مار مار کر نکالا ہے مگر ہمار کھیت آج تک

گھوڑوں سے روندا نہیں گیا۔"

پرشادی : "سچ کہو کیا تم نے دروغہ جی کے گھوڑے کو مارا بھی ہے؟"

جمنا مہاراج : "ہمارا کھیت خراب کرے تو کیوں نہ ماریں۔"

پرشادی : "تو بھیا تم دروغہ ہو سکتے ہو ہم نہیں۔"

جمنا مہاراج : "یہ بھی ایک ہی کہی پرشادی بھیا تم نے ہاہاہا۔"

پرشادی : "ہاں دادا۔ یہ ہمارا بوتا نہیں کہ دروغہ کے گھوڑے کو ماریں ہاہاہا۔"

سسرال

گیدڑ کی جب موت آتی ہے وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ شہری کی جب شامت آتی ہے تو وہ دیہات میں شادی کر لیتا ہے۔ یہ شامت ہمارے بھاگ میں بھی تھی۔ خیر یوں تو ہم بھی کون سے کلکتہ، بمبئی کے رہنے والے ہیں۔ مگر پھر بھی شہر میں رہے ہے۔ شہر میں پڑھے لکھے لیچے ہو گئے شہری اور لگے دیہات سے گھبرانے۔ مگر بڑے بول کا سر تو نیچا ہو کر ہی رہتا ہے۔ آخر پھر اسی دیہات میں بیوی کی بھیک مانگتے ہوئے پہونچے اور بہت کچھ دوڑ دھوپ کے بعد موضع بھدیسل کے زمیندار صاحب نے ہم کو اپنی غلامی میں لے لیا۔

ہمارے یہ سسر صاحب بڑی آن بان کے زمیندار ہیں اور انسان تو ایسے ہیں کہ اگر شہر میں آ جائیں تو لوگ ان کو دور دور سے دیکھنے آئیں۔ ایک ہے ان کے پاس لٹھ جو ہم سے کچھ ہی پتلا ہوگا۔ دو ڈھائی سیر تو لوہا اس میں جڑا ہوا ہے اور کوئی آدھ سیر کے قریب چاندی۔ ہم نے ایک مرتبہ اگر اس لٹھ کو مگدر کے طور پر اٹھایا تو ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر لٹھ کو ہم روز سویرے دو ایک مرتبہ اٹھا لیا کریں تو اس سے سینہ بھی بڑھے گا اور بازو کے پٹھے بھی چوڑے چکلے پہلوانوں جیسے ہو جائیں گے۔ دوسری چیز ہے ہمارے سسر صاحب کا جوتا جو دور سے تو ہوائی جہاز معلوم ہوتا ہے۔ قریب جائیے تو فرنیچر کے قسم کی کوئی چیز دکھائی دیتی ہے اور جب بالکل پاس پہونچ کر دیکھئے تو معلوم

ہوتا ہے کہ اس گاؤں بھر کے لوگوں نے الگ الگ جوتے بنوانے کے بجائے ایک ہی جوتا بنوالیا ہے اور سب اس کو ایک ساتھ پہنتے ہوں گے۔ اگر یہ جوتا ہم کو مل جائے تو ہم اس سے سوٹ کیس کا کام نکالیں۔ ان دونوں چیزوں سے یہ اندازہ تو ضرور ہوسکتا ہے کہ ہمارے سسر صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ ہمارے ایسے لوگ تو بھنگے ہیں ان کے سامنے۔ اللہ ہماری نظر بد سے بچائے دیو کے دیو ہیں۔ منہ میں بالٹی لگا کر کھڑے کھڑے پانچ چھ سیر دودھ پی جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ بیمار ہوگئے تھے تو شہر کے کسی ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ آپ گن گن کر روٹیاں کھایا کیجیے تو وہ بے چارے گن کر پچیس تیس روٹیاں کھا جاتے تھے۔ ان کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ پہلی مرتبہ تو ان کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھ کر ہم ایسا سمجھے تھے کہ یہ طے کرلیا تھا کہ ادھر کی دنیا اُدھر ہوجائے۔ مگر ان کی لڑکی سے ہم قیامت تک شادی نہیں کریں گے نہ جانے یہ کس دن ہم کو اٹھا کر منہ میں رکھ لیں مگر اب عادت پڑ گئی ہے دیکھتے دیکھتے۔

یہ تو سب کچھ ہے مگر سسر صاحب اگر دنیا میں کسی کی بات مانتے ہیں تو وہ ہماری سکے ہیں کہ شہر کا پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ مڈل سے بھی آگے تک پاس ہے اس کی بات نہ مانیں گے تو کیا تکونو کی بات مانیں گے جس نے شہر میں جا کر کھیتوں کا مقدمہ ہی نہ جانے کیا الٹی سیدھی بات کرکے ہرادیا۔

خیر اب سسر صاحب کی ایک ایک بات کہاں تک بیان کی جائے اس کے لیے تو ایک الگ کتاب لکھنے کا خود ان ہی سے وعدہ کرچکے ہیں۔ مگر اس وقت ان کی چھوٹی لڑکی کے بیاہ کا حال سن لیجیے کہ وہاں کا کیا حال تھا اور ہم پر کیا گذر رہی تھی۔ ہم کو بہت دن پہلے سے موضع بھدیسل بلالیا گیا تھا اور ایک ایک بات ہم سے پوچھ کر کی جارہی تھی۔ اصل میں یہ شادی بھی خود ہم ہی نے ٹھہرائی تھی۔ ہمارے ایک

دوست تھے اور ہم چاہتے تھے کہ شہر میں ہماری طرح کا ایک آدھ دیہاتی داماد اور بڑھے۔ ہمارے سسر صاحب کو تو بس اتنا ہی اطمینان کافی تھا کہ یہ شادی ہم نے ٹھہرائی تھی مگر ہمارے دوست کی جان پر بنی ہوئی تھی کہ اگر اس کم بخت نے زندگی بھر کا مذاق کردیا تو کیا ہوگا۔ رہ گئے ہم تو ہمارا حال یہ تھا کہ ہم سسر صاحب کے اس اطمینان کا خون کرنا ہی نہیں چاہتے تھے اور اپنے دوست سے مذاق کرنے کی نیت بھی نہ تھی۔ البتہ یہ ڈر ضرور لگ رہا تھا کہ معلوم نہیں دیہات کی کس بات کو مذاق سمجھ بیٹھیں۔ اب ہماری سب سے پہلی کوشش یہی تھی کہ دلہن کو ہاتھ کا کتا اور ہاتھ کا بُنا جو جہیز دیا جانے والا تھا وہ کسی طرح ٹل جائے تو اچھا ہے۔ اس لیے کہ خود ہماری بیوی کے جہیز میں جو کرسی آئی تھی اس کو ہم بہت دنوں تک گھڑونچی سمجھتے رہے اور جب پتہ چلا کہ یہ کرسی ہے تو گاؤں گئے تھے سسر صاحب سے پوچھنے کہ اس پر بیٹھنے کا طریقہ کیا ہے۔ مطلب یہ کہ انھیں تمام باتوں سے ہم اپنے دوست کو بچانا چاہتے تھے اور بچانے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ وہاں دھڑا دھڑ زیور پر زیور ڈھل رہے تھے۔ جن میں سے ایک بھی اس قابل نہ تھا کہ اس کو زیور سمجھ کر پہنا جاسکے۔ شہر میں ان چیزوں سے ورزش کی جاتی ہے۔ آخر ہم کو دخل دینا ہی پڑا اور ٹھیک اس موقع پر جب کہ ہمارے سسر صاحب ڈھائی تین سیر کی ایک جھانجھ لیے ہوئے اپنے نسیم سے کہہ رہے تھے کہ ہلکی رہی یہ، ہم سے ضبط نہ ہوسکا اور ہم نے سسر صاحب سے پوچھ ہی لیا۔ ’’بھائی ابا یہ کیا ہے؟‘‘ ہم ان کو بھائی ابا اس لیے کہتے تھے کہ ہماری بیوی ان کو یہی کہتی تھیں ہمارے سوال پر جھانجھ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’جھانجھ ہے بھیا پر میں یہ کہتا ہوں کہ یا تو چیز نہ دی جائے اور یا دی جائے تو ایسی کہ ناک نہ کٹے‘‘ ہم نے دبی زبان سے کہا۔ ناک نہ کٹے‘‘ چاہے پیر ٹوٹ جائے‘‘ چونک کر بول’’ ہائیں! پیر کی کیا بات ہوئی!‘‘ ہم نے ان کو سمجھانے کے لیے آگے کھسک کر کہا۔ ’’بھائی ابا یہاں آپ

لوگ زیور کو تو دیکھتے ہیں اور اس بے چاری کو بھول جاتے ہیں، جس کو زیور پہننا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ جھانجھ، یہ اس کے بعد کڑے، پھر چھڑے اور ایسی ایسی نہ جانے کیا کیا چیزیں پہننے کے بعد اس غریب کا پیر بھی اٹھ سکے گا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو چیز آپ دینا چاہتے ہیں وہ کم سے کم ایسی تو ہو کہ جو اس کے کام آ سکے۔ شہر میں بیاہ کر جا رہی ہے۔ زیور ایسے ہیں کہ ان کو دیکھتے ہی شہر والوں کا بھی دم نکل جائے اور دولھا کو بھی دھڑکن ہونے لگے۔ جب سے میں آیا ہوں چپکے چپکے تمام انتظام دیکھ رہا ہوں اور دل ہی دل میں ہنس رہا ہوں کہ آخر آپ کا ارادہ کیا ہے۔ جہیز کا جو سامان آپ تیار کرانا چاہتے ہیں اس کے لیے کم سے کم ایک پوری ریل گاڑی کی ضرورت تو ہوگی جو اس لڑائی کے زمانے میں تو مل نہیں سکتی۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں جو لڑائی کی وجہ سے لوگ اپنے کو ہلکا پھلکا رکھنا چاہتے ہیں آپ اپنی لڑکی اور داماد کے اوپر یہ بوجھ لاد رہے ہیں جس کو لے کے کہیں نہ آیا جا سکے۔ نہ جایا جا سکے۔ دیجیے تو ایسی چیز دیجیے کہ جس سے لڑکی بھی فائدہ اٹھا سکے داماد بھی خوش ہو اور دیکھنے والے بھی دیکھیں کہ عقل صرف شہر میں نہیں بٹی ہے دیہاتوں میں بھی پہونچی ہے۔" جھانجھ ایک طرف رکھ کر سر سے پیر تک سوالیہ نشان بن گئے اور گل مچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولے "تو بتاؤ نا بھائی آخر میں نے تو سب کچھ تم پر چھوڑ ہی رکھا ہے۔ اب میں شہر والوں کی سی انگریزی پڑھی عقل کہاں سے لاؤں ایسے میں سویرا ہے...... اب بھی جو کہہ دو گے ہو جائے گا" ہم نے کہا۔ "پہلے یہ بتائیے کہ آپ کا ارادہ جہیز پر کتنا روپیہ صرف کرنے کا ہے؟" ایک دم سے ڈنکار کر منیم کو پکارا کہ بڑے بھیا کے بیاہ کا کھاتہ لاؤ اور ہم سے کہنے لگے۔ میرا خیال یہ ہے بلکہ جہاں تک یاد پڑتا ہے ساڑھے تین ہزار کا جہیز تمہاری بیوی کو دیا تھا بس اسی کے لگ بھگ سمجھ لو" ہم نے کہا بس تو ٹھیک ہے آپ یہ تمام روپیہ جنگی قرضے میں دے کے اس کے سرٹیفکیٹ جہیز میں دے

دیجیے سسر صاحب پر ایک دم بجلی سی گری تڑپ کر بولے "ہائیں! کیا کہا؟ ارے بھائی اُردو میں سمجھاؤ نا۔"

ہم نے منہ پھیر کر مسکرانے کے بعد کہا "مطلب یہ ہے کہ یہ روپیہ تو دے دیجیے سرکار کو قرض اور اس کی پکی رسید لڑکی کے حوالے کر دیجیے۔ جب لڑائی ختم ہو جائے گی تو اسی روپیہ سے جو منافع کے ساتھ واپس ملے گا وہ اپنی مرضی کا جو چاہے گی بنوا لے گی" آج غالباً پہلی مرتبہ ان کو اس بات کا افسوس ہوا کہ ان کی بڑی لڑکی کی قسمت ایک پاگل کے ساتھ پھوڑی گئی ہے کہنے لگے۔ "کیسی باتیں کرتے ہو بھیا نہ جانے لڑائی کا اونٹ کس کل بیٹھے۔ کون جیتے کون ہارے پھر کس کو رسید دکھا کر روپیہ مانگتے پھریں گے۔"

ہم نے ان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے اس کو یوں سمجھئے کہ اول تو ہمیں جیت رہے ہیں اور اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی رقموں اور ذرا ذرا سی ہمدردیوں کے بل بوتہ پر جیت رہے ہیں اور فرض کر لیجیے کہ نہ بھی جیتیں تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تمام سامان یہ تمام زیور اور یہ سب کچھ جو آپ جہیز میں دے رہے ہیں باقی بچ جائے گا دشمن کی لوٹ مار اس کو باقی رہنے دیگی۔ بم کے گولے کسی چیز کو استعمال کے قابل رہنے دیں گے۔ یا استعمال کرنے والوں کو صحیح سلامت چھوڑیں گے۔ اس وقت تو آپ کے اسی روپیہ سے دشمن کو پیچھے ہٹایا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہی روپیہ ہم گھروں میں دبا کر رکھ لیں تو وہ نہ تو ہمارے کام آئے گا اور نہ سرکار کے کام بلکہ دشمن لٹیرے اس کو یا تو لوٹ لیں گے یا تباہ کر کے رکھ دیں گے۔" اتفاق کی بات تھی کہ یہ باتیں کچھ کچھ ان کی سمجھ میں آ رہی تھیں کہنے لگے "بات تو کچھ جچتی ہوئی ہے۔ پر یہ تو سوچو گاؤں والے کیا کہیں گے برادری کیا تھوکے گی، سب یہی کہیں گے نا کہ لونڈیا کو ایک کاغذ تھما دیا اور چلتا کیا۔" ہم نے کہا۔ "برادری میں سب سے بڑے بزرگ آپ

ہیں اور گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار بھی آپ ہیں۔ اگر آپ ہی ایسی مثالیں قائم نہ کریں گے تو کون کرے گا۔'' مٹھی میں اپنی داڑھی کو پکڑ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا۔ ''اچھا۔ تو میں کل جواب دوں گا ذرا تمہاری ساس واس سے بھی پوچھ لوں۔'' ساس تک غنیمت تھا مگر یہ واس بڑی خطرناک چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گاؤں بھر کی بڑی بوڑھیوں کا مشورہ لیا جائے گا۔ جو سب کی سب ہماری واس تھیں۔ مگر بڑے میاں کو ہم ایسا رام کر چکے تھے کہ دوسرے دن تک تمام ساسیں اور تمام واسیں لاکھ چیخیں چلائیں مگر ہم کو صبح ہی ساڑھے تین ہزار روپے مل گئے کہ شہر جاکے ان کو جمع کرو اور پکی رسید لا کے دکھاؤ۔

ختم شد

ایک مزاحیہ شاہکار

بیگم بادشاہ غلام

شوکت تھانوی





قیمت صرف تین سو نئے پیسے

انتساب

میں نے بہت سوچا لیکن کچھ میں نہیں
آیا کہ میں اپنی اس کتاب کا انتساب
کیا کروں

شوکت تھانوی





ناشر زہرے رضا مہدی

شایع کردہ پرواز۔ بکڈپو۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ

طابع یونائیٹڈ انڈیا پریس۔ لکھنؤ





ہم دُعا کر چکے

پاکستان کو ہمیشہ نہایت مفلس اور کنگال ملک سمجھا گیا اور ہمارے پچھلے حاکموں نے تو اس ملک کی حیثیت ایک بین الاقوامی محتاج خانہ کی بنا رکھی تھی جس کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی تھا اور لب پر یہ صدائیں کہ :۔

"اللہ کے نام کی روٹی۔ محمد نام کا پیسہ۔ حسن کے نام کا کپڑا
بُلا کر دے بھلا ہو گا"

چنانچہ امریکی سخی داتا اپنے مویشیوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر اسکو گیہوں بھیجدیا کرتے تھے۔ روپے پیسے سے بھی مدد دیا کرتے تھے۔ اور مرے ہوئے گوروں کے پرانے کوٹ بھی آجایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس مسکین مُلک کے لئے امریکی گھی اور امریکی دودھ بھی آتا تھا۔ جبکہ

جواب میں یہ ملک دامن پھیلا پھیلا کر امریکہ کو جان و مال دولت و اقبال کی دعائیں دیتا رہتا تھا کہ "اللہ سلامت رکھے۔ قدم قدم کی خیر۔ تیری ہر مانی کا ہر لعل جئے۔ تو دودھوں نہائے پوتوں پھلے اولاد سے گودی اور ڈالر سے جیب بھری رہے"

اب اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ امریکہ سے جب یہ گیہوں جہاز پر لاد کر پاکستان بھیجا گیا ہی تو اس گیہوں کا باقاعدہ خیر مقدم کیا گیا تھا جن اونٹوں پر یہ گیہوں لادا گیا تھا اُن کے گلے میں تختیاں لٹکائی گئی تھیں جن پر لکھا ہوا تھا۔

THANK YOU AMERICA

اور پاکستان کے شاعروں نے مارے غیرت کے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ؎

تھینک یو کہتے ہوئے اونٹ تو ہم دیکھ چکے
دیکھیے اور دکھائے ابھی گندم کیا کیا

اونٹوں کی زبان سے تھینک یو کہلوانے میں بڑا شاعرانہ استعارہ تھا مطلب یہ تھا کہ ہم اہل پاکستان فی الحال وہ اونٹ ہیں جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہی مگر اے امریکہ تیرا شکریہ کہ تونے اس شتر بے مہار ملک کو فاقوں کی موت سے بچا لیا۔ اس لیے کہ ہمارے پاس زرخیز زمینیں تو ہیں مگر اس وقت

ہم چونکہ خود اپنی آب زرسے آبیاری کر رہے ہیں لہذا ہم کو اتنی فرصت کہاں کہ فصلیں اگانے کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ ہم تو فی الحال اسی طرح دریوزہ گری کر کے پیٹ پالنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خیرات کھا کھا کر اپنے ضمیر کو مارتے رہے اور خود بے حیائی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ ہاتھ پھیلانا ہماری عادت بن گیا۔ جس نے جو کچھ دے دیا دعائیں دے کر لے لیا۔ نہ دیا کسی نے کچھ تو صدائیں لگاتے رہے مسلسل۔

مگر اب پرامن فوجی انقلاب کے بعد اس ملک کے افلاس کا بھانڈا پھوٹا ہے کہ تجوریوں کے علاوہ سمندر کی گہرائیوں تک سے سونا نکلتا ہے۔ ایک سے ایک پھٹیچر اور رشکل صورت کے یتیم کے پاس سے لاکھوں روپے نکلے ہیں۔ ایسے ایسے لوگ لکھ پتی ثابت ہوئے ہیں جو آپ کے پاس آجاتے تو آپ یہی کہتے کہ "شاہ جی آگے بڑھیے برکت ہے۔ بس جمعرات کو آیا کیجئے۔" پتہ چلایا گیا ہے کہ کروڑپتی ایک سے ایک پڑا ہوا ہے آپ کے اس مفلس ملک میں۔ جب لوگوں نے اپنی آمدنی ظاہر کی تو معلوم ہوا کہ چھپی ہوئی آمدنی ساٹھ کروڑ تو صرف کراچی زون میں تھی۔ بتیس کروڑ لاہور زون میں تھی اور اٹھارہ کروڑ مشرقی پاکستان میں گویا پندرہ جنوری تک تو اعداد وشمار خدا جانے کیا ہونگے فی الحال ایک سو دس کروڑ کی چھپی ہوئی آمدنی ظاہر ہوئی ہے۔ ایک کروڑ روپے

سے زائد آمدنی ظاہر کرنے والے کچھ کم نہیں ہیں اس نادار ملک میں پچاس لاکھ روپے سے زائد آمدنی والے بھی آپ کی دعا سے چشم بددور کافی ہیں اور سو کے قریب تو صرف وہی لوگ ہیں جن کی آمدنی ایک لاکھ سے زیادہ تھی مگر یہ "مفلوک الحال" لوگ ٹیکس نہیں دیتے تھے اس لیے کہ اتنی سی آمدنی میں کوئی کیا ٹیکس دے اور کیا بچائے۔ ننگی کیا نہائے گی اور کیا نچوڑے گی۔ ان میں سے نہ جانے کتنے لوگ تو وہ تھے جو میلے کچیلے کپڑے پہنے گندے مکانات میں نہایت قابل رحم زندگی بسر کر رہے تھے کہ اگر آپ انکو دیکھ لیتے تو آپ کا دل بھر آتا اور آپ یقیناً ایک آدھ پیسہ ان کی ہتھیلی پر رکھ دیتے۔

وہ مشہور ہے کہ خزانہ پر سانپ بیٹھتا ہے۔ دراصل سانپ وانپ کچھ نہیں ہوتا یہ خود ہی اپنے زمانہ کے سانپ ہوتے ہیں۔ ان کی قسمت میں پیسہ تو ہوتا ہے پیسے کا سکھ نہیں ہوتا۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن کا مقولہ ہے کہ چمڑی جائے دمڑی نہ جائے۔ پیسہ پیسہ جوڑتے ہیں مگر صرف نہیں کر سکتے بھلا وہ ٹیکس کیا دیں گے۔ جاڑے میں پھٹا ہوا کمبل لپیٹے اکڑا کرتے ہیں اس لیے کہ لحاف اگر بنائیں گے تو اس خزانہ میں روپے کم پڑ جائیں گے۔ وہ بارش میں سر پہ باؤں رکھے پھرا کرتے ہیں چھاتہ اور برساتی خریدنے کی فضول خرچی

نہیں کرتے۔ وہ گرمیوں میں لُو کے تھپیڑے کھانا اور دھوپ میں جُھلسنا برداشت کر لیتے ہیں مگر راستہ پیدل ہی طے کرتے ہیں اس لیئے کہ بس کا کرایہ خرچ کرنا کفایت شعاری کے اصول کے خلاف ہو اور ان ہی بخیل لوگوں کے پاس انتقال کے بعد لاکھوں روپے نکلتے ہیں اور اس دولت کا پتہ بھی اس وقت چلتا ہو جب میونسپلٹی والے ان کو دفن کر چکتے ہیں۔

اس قسم کے فقیروں کے متعلق اکثر خبریں آتی رہتی ہیں کہ آج ایک فقیر نے جو ایک گدڑی میں لپٹا ہوا تھا سر راہ ایک فٹ پاتھ پر دم توڑ دیا لوگوں نے کفن دفن کے چندہ کیا۔ مگر جب مرحوم کو گدڑی سے نکالا گیا تو اسی گدڑی میں پچیس ہزار کے نوٹ بھی ایک پوٹلی میں بندھے ہوئے ملے۔ ظاہر ہو کہ اس نامراد فقیر کا کوئی بھی نہ تھا۔ جس کے لیئے اس نے یہ دولت جمع کی تھی۔ اس پیسہ کو اس نے اپنے اوپر کبھی صرف نہ کیا۔ جس طرح ہاتھ پھیلائے۔ سر جُھکائے بھیک۔ انگا کرتا تھا مسلسل مانگتا رہا۔ سُوکھے ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھاتا رہا۔ ہزاروں روپے لیئے بیٹھا رہا مگر وہ روپئے اس کے کام نہ آسکے۔ اگر سچ پوچھیئے تو یہ بھی ایک شامت ہو کہ دولت مل جائے مگر دولت کو صرف کرنے کی اجازت حاصل نہ ہو سکے اس قسم کے "بامراد محروم" نہایت قابل رحم ہوتے ہیں ان کی حالت اس بکری کی سی ہوتی ہو جس کے سامنے سبز چارہ موجود

ہو مگر تھوتھنی پر جالی چڑھا دی گئی ہو۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ غالب نے یہ شعر اپنے اپنے متعلق کہا ہے۔ جی نہیں یہ شعر ان ہی حضرات کے متعلق ہے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

گدڑی کے ان لعلوں کا یہ ملک پاکستان مدتوں کنگال مشہور رہا خیرات پر گذر بسر کرتا رہا۔ جھولی پھیلائے بیٹھا رہا اور اپنی خودداری کو سلام چڑھائے رہا۔ اس پر رحم تو سب ہی کھاتے رہے مگر اس کو خاطر میں کبھی کوئی نہ لایا۔ اور کوئی خاطر میں لاتا بھی کیسے جن جن کا یہ دست نگر تھا وہ اس کو اپنا بندۂ احسان تو سمجھ سکتے تھے اس کے علاوہ اور کیا سمجھتے۔ یہ اسی کا نتیجہ تو ہے کہ لارڈ ایٹلی کی گھر والی تک نے منھ بنا کر کہہ کر کہ "آج کل پاکستان کی پروا ہی کس کو ہے" مگر ان بیگم صاحبہ نے یہ بات ذرا غلط وقت پر کہی ہے اگر اب سے کچھ دن پہلے وہ یہ بات کہتیں تو ایک بات بھی تھی مگر اب حالات بدل چکے ہیں اب پاکستان وہ نہیں رہا ہے جس کی کسی کو پرواہ نہ ہو اب پاکستان کی پروا کرنا پڑے گی۔ اور پاکستان اپنی پروا خود کرائے گا۔ اب یہ بھیک منگوں کا ملک نہیں ہے۔ اب یہ یتیم خانہ اور دارالمساکین نہیں ہے اب اس کے سمندر سونا اگلتے ہیں۔ اس کی زمینیں دولت پیدا کرتی ہیں اور اس کے ہر خزانے

سانپ اپنی کینچلی بدل چکے ہیں اور خزانوں پر سے ہٹ گئے ہیں۔ اپنی اس دولت کے احساس نے ہر پاکستانی کو خود دار بنا دیا ہے اور اب اس کو ضرورت نہیں ہے کہ وہ کاسۂ گدائی لئے بین الاقوامی بازار میں فقیرانہ صدائیں بلند کرتا پھرے بلکہ ابھی ۱۵ جنوری کے بعد دنیا اسی کنگال کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھے گی کہ یہ محتاج خانہ تو سونے کی کان نکلا۔ اب اس ملک کی باگ دوڑ ان کے ہاتھ میں نہیں ہے جو کوڑیوں کے ہار پہنے صدائیں لگاتے پھرتے تھے کہ ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

اب اس ملک کا نظم و نسق ان کے ہاتھ میں ہے جو اسی افلاس سے خوش حالی نچوڑ سکتے ہیں اور ایک سے ایک مفلوک الحال کو نچوڑ کر لکھ پتی بنا چکے ہیں۔

ایک قیامت

ادیبوں کے کنونیشن کے بعد اسی کنونیشن کے دو منہ وہین النسیم حجازی صاحب اور ڈاکٹر جاوید اقبال کے اعزاز میں کراچی کے حلقۂ ادب اسلامی نے سنٹرل ہوٹل میں ایک عصرانہ دیا جس میں پستہ، خوبانی۔ شاعری ۔ اخروٹ۔ تقاریر۔ کشمش۔ ادیلے۔ سگریٹ اور چائے وغیرہ سے حاضرین کی تواضع کی گئی۔ سب سے پہلے اس حلقہ کے ناظم مولانا ماہر القادری نے ایک افتتاحی تقریر فرمائی جس میں اس بات پر زور دیا کہ پاکستان کا ادب اسلامی ہونا چاہیے حاضرین نمکین پستے کھا کھا کر مولانا کی شیریں کلامی کی داد دے رہے تھے۔ اور چلغوزے کھٹاک، کھٹاک کر کہہ رہے تھے کہ مولانا بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اور یہ واقعہ بھی ہو کہ مولانا نے بعض باتیں بڑے پتے کی کہیں مثلاً یہ کہ آپ نے اگر اپنے مسلمان ہونے کی بنیاد پر پاکستان

حاصل کیا ہے تو اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے شرماتے کیوں ہیں اور اصلاحی ادب۔ معاشرتی ادب۔ سماجی ادب قسم کے پردے ڈال کر اسلامی ادب کو چھپانے کی کیوں کوشش کرتے ہیں اس لیئے ظاہر ہے کہ جو صحیح قسم کا اصلاحی ادب ہوگا وہ اسلامی ادب ہوگا جو واقعی معاشرتی ادب ہوگا وہ اس لئے اسلامی ادب ہوگا کہ مسلمانوں کی معاشرت ہی اسلامی معاشرت ہوسکتی ہے۔ مولانا نے اس بات پر زور دیا کہ اسلامی ادب کو اسلامی ادب کہنے سے شرمانا کیا معنی صاف صاف کہیئے کہ یہ اسلامی ادب ہے

مولانا کی اس تقریر کے بعد نسیم حجازی صاحب نے تقریر فرمائی جس کا لب لباب یہ تھا کہ ؎

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

اس کے بعد ڈاکٹر جاوید اقبال نے بڑی سلجھی ہوئی تقریر کی ان کا موضوع بھی یہی تھا کہ ہم اور آپ اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے شرماتے ہیں حالانکہ خود مغربی ممالک کے روشن خیالوں اور آزاد منش حضرات کا یہ عالم ہے کہ ان کی فراخدلی بس اسی وقت تک نظر آتی ہے جب تک آپ عیسائیت کو اپنا موضوع بحث نہ بنائیں عیسائیت پر آپ نے بحث شروع کی اور وہ ٹھیٹھ عیسائی بن کر سامنے آگئے۔ یہ تقریر کرتے کرتے ڈاکٹر جاوید اقبال کو یاد آگیا کہ وہ

پہنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ فوراً موضوع تقریر چھوڑ کر کہنے لگے کہ "حضرات میرے لباس کو نہ دیکھیے بلکہ مجھ کو اندرونی طور پر پڑھیے۔" گویا وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ؎

ہوں پوشیدہ اور کا فر کھلا

بہر صورت حاضرین میں سے ایک بزرگ نے زیر لب فرمایا کہ "میاں یہ بھی غنیمت ہو کہ اس لفافہ میں سے یہ مضمون نکل رہا ہو۔" مطلب ان کا یہ تھا کہ وہ اسی کو غنیمت سمجھ رہے تھے کہ ایک سوٹ پہننے والا اسلامی ادب کی ضرورت پر زور دے رہا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ تقریریں اسی طرح چلغوزوں اور پستوں کے شغل کے ساتھ جاری رہیں امید تھی کہ ان تقریروں کے بعد چھٹی مل جائے گی۔ مگر توبہ کیجیے جہاں ایک شاعر بھی موجود ہو وہاں یہ کیسے ممکن ہو کہ مشاعرہ برپا نہ ہو چنانچہ وہی ہوا یہ خدمت میرے سپرد کردی گئی کہ ایک مختصر سا دور مشاعرے کا بھی ہو جائے۔

میں نے حاضرین کو لاکھ سمجھایا کہ اتنی جلدی یہ شعرائے کرام جو یہاں تشریف رکھتے ہیں اسلامی شاعری کے نمونے پیش نہ کر سکیں گے۔ دوسرے جن دو مہمانوں کے اعزاز میں آپ نے یہ بزم آراستہ کی ہو ان میں سے ایک کے شجرے میں تو خیر شاعر نظر بھی آجاتا ہو مگر دوسرا تو اس معاملہ میں بھی بے قصور

ہے لہذا آپ اس کو کس جرم کی سزا دے رہے ہیں۔ مگر تو یہ کیجئے کسی نے ایک نہ سُنی اور مشاعرہ برپا ہو کر رہا وجہ یہ ہے کہ اب مشاعرہ بھی موت کی طرح برحق اور ناگہانی سا ہوتا جا رہا ہے سب سے پہلے جناب اقبال صفی پوری نے ایک غزل سنائی جو اس اعتبار سے اسلامی ضرور تھی کہ اس میں کسی زاہد یا ناصح کا مذاق نہیں اُڑایا گیا تھا اور بظاہر خلاف اسلام کوئی بات نہ تھی۔ ان کی غزل کے بعد میں نے اعلان کر دیا کہ "ابھی جاوید اقبال صاحب کو اقبال صاحب اپنا کلام سنا رہے تھے" اس واقعاتی اعلان پر بھی بعض لوگ دُور کی کوڑی لا کر ہنس دیئے، پھر جناب محشر بدایونی برپا ہوئے۔ جناب منظر صدیقی نے غزل سرائی فرمائی۔ حضرت تابش دہلوی نے مسعود تابش کی زبانی اردو کی ایک غزل سُنائی یہاں تک کہ بشیر فاروقی صاحب نے دو چار قطعات کی آڑلی میں نے ایک پیروڈی میں پناہ حاصل کی اور جناب دہیب سہار نپوری نے نعت شریف پڑھ کر مولانا ماہر القادری کی پوزیشن نازک کر دی کہ اب وہ کون سی اسلامی شاعری پیش کریں گے مولانا ماہر کے بعد جناب اسد ملتانی نے دو شعر سُنائے جن میں سے ایک ادبی تھا اور ایک اسلامی اور آخر میں میری درخواست پر ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے والد محترم علامہ اقبال کا ایک شعر سنا کر اس ناگہانی مشاعرے کو ختم کر دیا۔

تقریریں ہوئیں۔ مشاعرہ ہوا۔ اسلامی ادب پر زور دیا گیا۔ ثابت یہ کیا گیا کہ ناول بھی اسلامی ہو سکتے ہیں۔ غزلیں اور نظمیں بھی اسلامی ہو سکتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اگر کوشش کی جائے تو شعر و ادب کے ہر گوشے میں اسلامیات کے لیے جگہ پیدا کی جا سکتی ہے۔ وہاں میں تو خاموش بیٹھا رہا۔ مگر واپسی میں جب ایک صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیوں جناب مزاح کو آپ کیونکر مشرف بہ اسلام کر سکتے ہیں تو میں نے اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے اپنے کو دانستہ سنجیدہ بنا کر یہ عرض کیا کہ :-

"جناب والا ہر وہ چیز اسلامی ہے جو خلاف اسلام نہ ہو۔ اگر مزاح کا ہدف خود اسلام کو نہ بنایا جائے۔ اور غیر اسلامی عناصر کی تائید نہ کی جائے تو آپ مزاح کو بھی مزاح المومنین ہی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے آج تک بحمد اللہ خدا اور رسول اور بزرگان دین یا عقائد کا مذاق نہیں اڑایا ہے۔"

یہ سنتے ہی ایک صاحب واقعی اس طرح چیخ اٹھے گویا پولیس کو آواز دے رہے ہیں کہ :-

"پکڑا گیا۔ پکڑا گیا۔ مسلمان ہے اندر سے۔"

اور میں واقعی انکار نہ کر سکا اس لئے کہ جہاں تک اس جرم کا تعلق ہے میں اقبالی مجرم ہوں

اکبر الہ آبادی نے اب سے بہت پہلے کہا تھا کہ :۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مگر اب جو زمانہ ہے اس میں یہ جرم اکبر کے زمانے سے بھی زیادہ سنگین بن چکا ہے۔ اسلامی ادب کے نام پر ہنسنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یہ نام لے کر خواہ مخواہ بھی آدمی نکو بن کر رہ جاتا ہے ہم تو اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ خلاف اسلام ادب ہی پیش نہ کیا جائے اس کوشش کو بھی اس دور میں معمولی جہاد نہ سمجھیے بلکہ یقین رکھیے کہ اگر اس کوشش میں آپ کامیاب ہو گئے تو اسلامی ادب کے لیے پذیرائی کا میدان اسی سے ہموار ہو سکے گا

پہلے عورت اُسکے بعد مرد

یہ جو مہذب دنیا کے مردوں نے "لیڈیز فرسٹ" والی تہذیب رائج کی ہو اس میں خواتین کی عزت افزائی یا خواتین کو بے وقوف بنانا ہی مقصود نہیں ہو بلکہ بڑی بڑی مصلحتیں ہیں۔ مثلاً یہی کہ ہر جگہ عورتوں کو پہلے بھیجا جائے تاکہ اگر کوئی مصیبت راہ میں حائل ہو تو پہلے وہ اس سے دوچار ہولیں اور جو کچھ گذرتا ہو وہ اُن پر گذر جائے مرد اس مصیبت سے محفوظ رہ سکیں۔ چنانچہ اب بڑی چالاکی کے ساتھ یہ کہا جا رہا ہو کہ ستاروں کا جو سفر درپیش ہو اس کے لیے مردوں سے زیادہ عورتیں موزوں ہیں اور لیڈیز فرسٹ کے اصول کو پیش نظر رکھ کر مرد یہ گستاخی کر بھی نہیں سکتے کہ عورتوں کو پیچھے چھوڑ کر خود پیش قدمی کر جائیں اس طرح وہ اس دنیا ہی میں نہیں بلکہ ساری کائنات میں بدنام ہو جائیں گے کہ عجیب جانگلو ہیں۔

اس دنیا کے لوگ بھی کہ ان کو تہذیب کا یہ بنیادی اصول بھی نہیں معلوم کہ لیڈیز کو آگے بڑھایا جاتا ہو اور مرد اُن کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ نیازمندی کے ساتھ فدوی بنے ہوئے۔

رائٹ فیلڈ (اوہیو) کے مرکز میں ایرومیڈیسن لیبارٹری نے بتایا تھا کہ کائنات میں سفر کرنے کے لیے مرد جتنا ناموزوں ہو عورتیں اتنی ہی موزوں ثابت ہوئی ہیں یہ تجربہ اس وقت ہوا جب سائنسدانوں نے تجربہ کے کیبن میں مردوں اور عورتوں دونوں کو رکھا۔ اس کیبن میں کائناتی سفر کا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا۔ اس ماحول میں بے صبر مرد تھوڑی ہی دیر کے بعد گھبرا گئے اور انھوں نے جھنجھلانا شروع کر دیا مگر عورتیں نہایت صبر و سکون کے ساتھ بیٹھی رہیں کیا مجال کہ ذرا بھی گھبراہٹ ان پر طاری ہوا اُن کی جبیں پر ایک بھی شکن پڑی ہو وہ حسب معمول تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنا پرس کھول کر آئینہ دیکھ لیتی تھیں اور اپنا میک اپ درست کر لیتی تھیں بالوں پر ہاتھ پھیر کر اُن کو درست کر لیتی تھیں اور چھوٹے سے ریشمی رومال سے لپ اسٹک پھیل گئی ہو تو وہ اس کو درست کر لیتی تھیں یہ مشق اسلیے جاری تھی کہ اگر وہ واقعی کسی نئی دنیا میں پہونچیں تو وہاں کے باشندے ان کو دیکھ کر بس دیکھتے ہی رہ جائیں اور پہلی ہی نظر میں اُن کے حسن کا

جادو اُن اجنبیوں کو مسحور کر دے

عورتوں کے اس اطمینان اور مردوں کی اس سراسیمگی کو دیکھ کر یہی نتیجہ نکالا گیا ہے کہ مردوں کو کائناتی سفر پر بھیجنا غلط ثابت ہوگا اس کی ابتدا عورتوں ہی سے کرائی جائے اور لیڈیز فرسٹ ہی سے کام لیا جائے اس کے بعد جب عورتیں اس سفر سے واپس آکر اپنے تجربات سے مردوں کو آگاہ کریں گی اور ان کو اس سفر کی تربیت دیں گی تو شاید مرد بھی ہمت کر گذریں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کی مردانہ ہمت آج کل کی عورتوں ہی میں نظر آتی ہے۔ مرد تو دو کوڑی کا بھی نہیں رہا ہے۔ خواہ مخواہ بھی مونچھوں پر تاؤ دیتا پھرتا ہے اور جب کوئی مہم درپیش ہوتی ہے تو لیڈیز فرسٹ کہہ کر عورتوں کو آگے بڑھا دیتا ہے اور خود اُن کی آڑ میں چھپ جاتا ہے۔ ان مردوں نے مہذب ہونے کے بعد ہر میدان میں عورتوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اور دیکھئے گا کہ اس قسم کے خطرناک تجربے کیا معنی مرد تو جہنم کے دروازے پر پہونچ کر بھی عورتوں سے کہے گا کہ "لیڈیز فرسٹ"

اس کائناتی سفر کے سلسلے میں یہ لیڈیز فرسٹ والی بات کوئی انتہا

نہیں ہے۔ روس نے سب سے پہلے لیڈی لائیکا ہی کو اس سفر پر روانہ کیا تھا۔ ورنہ کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ بجائے اس نازک اندام کتیا کے کسی قوی ہیکل کتے کو بھیجا جاتا مگر غالباً اس تجربے کے وقت بھی کتوں نے بھی یہی عذر پیش کیا تھا کہ آخر ہم ایک مہذب ملک کے کتے ہیں۔ ہم سے اس گنوار پن کی توقع کیوں کی جا رہی ہے کہ ہم اپنی لیڈیز یعنی کتیوں کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے بڑھ جائیں گے یہ اعزاز پہلے کسی کتیا کو دیا جائے گا چنانچہ لائیکا کو بھیجا گیا تھا جو آج تک واپس نہیں آئی ہیں اور روس کے کتے اپنی اس دانشمندی پر خوش ہیں کہ اگر انھوں نے لیڈیز فرسٹ کے اصول پر عمل نہ کیا ہوتا تو بجائے اس معزز کتیا کے نہ جانے کون سا کتا اس تجربہ کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ خیر وہ کتوں کو بھیجنے کا زمانہ تو گیا اب انسان کو بھیجنے کی باری آئی ہے تو مردوں نے ابھی سے یہ اڑا دی ہے کہ اس کائناتی سفر کے لئے عورتیں ہی موزوں سمجھی گئی ہیں مرد تو نہایت ناکارہ ثابت ہوا ہے اور بس اسی قابل ہے کہ لیڈیز فرسٹ کہہ کر عورتوں کو مقدم اور اپنے کو موخر بناتا رہے۔

مقصد صرف یہ ہے کہ یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ اس تجربہ میں صرف وہی حصہ لے سکتا ہے جو اپنی جان کو عزیز نہ رکھتا ہو۔ اس سیارے میں بیٹھ کر اڑنے کے بعد سب سے پہلے تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ ؎

پہلی منزل ہو فنائے رہروِ راہ بقا
آگے قسمت ہو تری اور ہمت مردانہ ہو

یعنی اُڑنے والا خود ہی یہ طے کرلیتا ہو کہ جو بھی اڑے ہم اس دنیا سے اور صرف روح ہی قفس عنصری سے پرواز نہیں کررہی ہو بلکہ قفس عنصر بھی پرواز کررہا ہو عالم بالا کی طرف اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ حضرت ایسے "لاالف انفیٹ پروف" ثابت ہوں کہ موت ان کو اس خودکشی کے باوجود نہ پوچھے بلکہ یہ موت کے پیچھے دوڑیں تو وہ سر پر پیر رکھ کر بھاگے ورنہ تناوے اعشاریہ نوفی صدی تو امید تو یہی ہوتی ہو کہ بس گئے کہ یہ حضرت لہٰذا مرد تو یہ چاہتے ہیں کہ جب تک یہ کائناتی سفر ہر طرح محفوظ نہ ہوجائے اور جب تک اس سفر سے واپسی یقینی نہ ہوجائے وہ دزا پیچھے ہی رہیں اور خواتین کو لیڈیز فرسٹ کہہ کر آگے بڑھاتے رہیں تاکہ تمام تجربے ان پر گزر جائیں اور مرد اس سفر کا آغاز اس وقت کریں جب یہ تجرباتی مرحلہ گذر جائے اور یہ سفر انگریزی کا SUFFER باقی نہ رہے۔

رہ گئیں عورتیں وہ بھی دراصل اتنی بیوقوف نہیں ہیں جتنی نظر آتی ہیں وہ ان خود غرض مطلب پرست اور کائیاں مردوں کی تمام چالاکیوں کو بخوبی سمجھتی ہیں کہ مرد ان کو کس کس طرح قربانی کی بکریاں بناتا رہتا ہو۔ بڑے محبت کے دعوے کرتا ہو۔ نازبردار بنتا ہو۔ نگاہِ ناز سے شہید ہوتا رہتا ہو روز ایک نئی ادا پر ایک تازہ

موت مرتا ہو اور کسی دن بھی اس کا جنازہ نہیں نکلتا۔ عورت کی چشم و ابرو کے اشارے پہ جان تک دینے کو تیار رہتا ہو مگر جب کوئی ایسا امتحان سامنے آجاتا ہو جس میں واقعی مرنے جینے کا سوال ہو تو عورت کو آگے بڑھا کر لیڈیز فرسٹ ڈھونگ رچانا شروع کر دیتا ہو ایسے خود مردوں کی اس دنیا میں وہ کہ جہاں جنس وفا راشن کارڈ پر بھی نہ مل سکے مسلسل بیوقوف بنے جانے سے تو اچھا یہی ہو کہ ع

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

اور کیوں نہ ان تجربوں کے لئے اپنے کو پیش کر دیں موت برحق تو ہو ہی کیوں نہ زندگی کی تلاش میں آئے۔ اگر تجربہ کامیاب ہو گیا تو کائنات کی ماں کہلائیں گی ورنہ مرحومہ و مغفورہ تو ہیں ہی

بنگال کا جادو

پاکستان رائٹرس کنونیشن کراچی میں آج ۲۹ جنوری سے شروع ہو گیا اس کنونیشن کا ادیبوں اور شاعروں کے مختلف حلقوں میں مختلف حیثیتوں سے خیر مقدم کیا گیا ہے۔ بات یہ ہو کہ مشرقی اور مغربی پاکستان سے جو ڈھائی سو کے قریب ادیب اور شاعر اس کنونیشن میں شرکت کے لئے یکجا ہوئے ہیں ان کے علاوہ بھی تو مشرقی اور مغربی پاکستان کی باقی آبادی کسی نہ کسی حیثیت سے ادیب تو ہو ہی اور اگر ادیب نہ ہی تو بھی بقیہ آبادی کے شاعر ہونے میں تو کسی کو کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا لہذا وہ سب کے سب اس کنونیشن سے سخت ناراض ہیں کہ آخر ان کو کیوں نظر انداز کیا گیا اور دعوت نامے کیوں نہ بھیجے گئے۔ کنونیشن منعقد کرنے والوں سے اگر پوچھا جائے تو وہ غالباً یہی کہیں گے کہ اس قسم کے

کنونیشن میں

کنونیشن میں اور میونسپل الیکشن میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ میونسپل الیکشن میں تو ووٹروں کی فہرست شائع کر کے سب کو مدعو کیا جا سکتا ہے مگر اس قسم کے کنونیشن میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی پوری آبادی کو سمیٹ لینا ممکن نہیں۔

یہ جواب اطمینان بخش ہو یا نہ ہو بہر صورت وہ تمام بے شمار ادیب اور شاعر جو نہ جانے کب سے ایک ایک تخلص لیئے بیٹھے ہیں اس کنونیشن مدعو نہیں کیئے گئے سخت ناراض ہیں اُن حضرات میں سے ایک آدھ سے تو شرف نیاز خود ہم کو بھی حاصل ہو چکا ہے جن سے اپنی عزت و آبرو بمشکل ہم بچا سکے حالانکہ ہم نہ داعیان کنونیشن میں سے ہیں نہ اس کنونیشن کے منتظمین میں ہمارا شمار ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک صاحب تخلص بزرگ تشریف لائے اور بغیر کسی تمہید کے آتے ہی برس پڑے کہ "کیوں جناب آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ جو ادیبوں اور شاعروں کی کانفرنس ہو رہی ہے اس میں آخر مجھ کو مدعو کیوں نہیں کیا گیا حالانکہ میں بارہ سال سے شعر کہہ رہا ہوں بڑے بڑے انڈو پاک مشاعروں میں شرکت کر چکا ہوں۔ تین بین المملکتی مشاعروں کے تمغے میرے پاس ہیں۔ دس شاگردوں کا استاد ہوں۔ رات بھی ایک مشاعرے میں میری ہی غزل حاصل مشاعرہ سمجھی گئی آپ کی سمع خراشی تو ہوگی

چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ عرض کیا ہے کہ ـــــــــــــ

وہ تو کہیے کہ ان حضرت نے غزل شروع کر دی اور میں نے داد دے کر ان کو رام کر لیا ورنہ اُن کے تیور تو یہ تھے کہ گویا مرنے مارنے کو تیار ہو کر آئے ہیں۔

ایک اور صاحب علین اس وقت تشریف لے آئے جب میں کنونیشن میں شرکت کے لیے جانے ہی والا تھا۔ تشریف لاتے ہی کہنے لگے "کنونیشن تشریف نہیں لیجائیں گے"، عرض کیا کہ جی ہاں بس اسی ارادہ سے نکلا تھا۔ بڑے تپاک سے بولے "تو بسم اللہ میں بھی چل رہا ہوں نہ جانے کس بھول چوک میں مجھے یہ دعوت نامہ بھیجنا یہ لوگ بھول گئے ہیں۔ مگر اتنے بڑے اہتمام میں اس قسم کی بھول چوک ہو ہی جاتی ہے اس پہ اگر میں خفا ہو کر بیٹھ رہوں تو یہ میری زیادتی ہے۔ یہ ادبی خدمت ہے اور ہم میں سے ہر ادب کے خادم کا فرض ہے کہ سب مل جل کر اس کنونیشن کو کامیاب بنائیں۔ لہذا تشریف لائیے"، اب میں سخت پریشان کہ کس طرح ان حضرت کے ساتھ جاؤں جن کو بلایا ہی نہیں گیا اور ان سے عذر کروں تو کیا کروں۔ بہر صورت مردہ بدست زندہ کے انداز سے جلسہ گاہ کے دروازہ تک تو اُن کے ساتھ گیا اس کے بعد مجمع میں اُن حضرت کو ایک ایسی جھکائی دی کہ میں ہال کے اندر تھا اور وہ ــــــ اللہ جانے ان کا کیا حشر ہوا۔

کے جی۔ اسے ہال میں پہنچے تو مشرقی اور مغربی پاکستان کا ایک سے ایک دانشور "مع حضرت احسان دانش کے نظر آیا اور ان میں جو سند یافتہ تھے وہ ایک ایک بلاّ لگائے ہوئے تھے۔ جس کی سبز زمین پر ایک پر والا قلم بنایا گیا ہو۔ اور اس پر کو اپنے کوٹ یا شیروانی پر لگا کر یہ سب دانشور درحصل "دانش پر" نظر آ رہے تھے۔ افتتاحی اجلاس شروع ہوا تو صدر مجلس استقبالیہ شاہد احمد صاحب دہلوی نے بھی اس عام شکایت کا ذکر کیا جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ:۔

"ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ کنونشن پاکستانی ادیبوں کا ایک نمائندہ اجتماع ہو اس لئے دعوت نامے جاری کرنے میں اس بات کا بہت خیال رکھا گیا ہے کہ کسی آبگینہ کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ عددی حساب سے پاکستانی ادیبوں کی تعداد ہزاروں بلکہ لاکھوں پر ہو۔ ظاہر ہو کہ ہم سب کو نہیں بلا سکتے تھے لہذا ایک خاصی تعداد کو شکوہ ہو کہ ہم نے اُن کو نظر انداز کر دیا"

اب کون شاہد احمد صاحب کو سمجھائے کہ اس معذرت میں بھی آپ صرف ادیبوں کا ذکر کر کے شاعروں کو نظر انداز کر گئے ہیں حالانکہ ادیب تو پھر بھی اقلیت میں ہیں مگر شاعروں کو تو وہ اکثریت حاصل ہو کہ گروہ اپنی فوج بنا لیں اور ع

مفعول و فاعلات و مفاعیل و فاعلن

کا رجز پڑھتے ہوئے دھاوا بول دیں تو یہ کنونیشن کیا معنی وہ چاہیں تو کنٹینر تک فتح کر کے رکھ دیں۔ وہ تو کہئے اُن کو فکر و سخن کے علاوہ اور کوئی فکر ہی نہیں ہو ورنہ اُن کو نظر انداز کرنا ہنسی ٹھٹھا نہیں ہو۔

کنونیشن کے افتتاحی اجلاس کے صدر بنگال کے جادو بیاں شاعر جسیم الدین تھے ان کے طویل خطبۂ صدارت کے بعد جو بنگالی میں تھا اس بات کی کوشش کی گئی کہ اس خطبہ کا ترجمہ حاضرین میں تقسیم ہو جانے کے باوجود اسٹیج سے سنایا بھی جائے مگر حاضرین نے متفقہ طور پر کہا کہ یہ خطبہ بنگالی میں سنکر اُردو پڑھ چکے ہیں لہٰذا اب اس زحمت کی ضرورت نہیں چنانچہ اسٹیج سکریٹری جمیل الدین صاحب عالی نے کچھ اعلانات سناتے ہوئے ایک عجیب بات یہ بھی بتائی کہ اس کنونیشن میں بہت سے حضرات جن کو مدعو کیا گیا تھا موجود نہیں ہیں اور نہ بہت سے حضرات جن کو مدعو نہیں کیا گیا تشریف رکھتے ہیں کچھ حضرات جو شرکت کے لئے آرہے ہیں اس وقت ریل میں بیٹھے آرہے ہوں گے اور کچھ حضرات ریل پیل سے فائدہ اُٹھا کر تشریف لے آئے ہیں لہٰذا دوسرے اجلاسوں کے وقت کڑی نگرانی کرنا پڑے گی کہ صرف مندوبین ہی ہال کے اندر داخل ہو سکیں یعنی صرف وہ دانشور جن کو بلاّ لگا کر "دانش بر" بنا دیا گیا ہو۔

اس افتتاحی اجلاس سے واپسی ایک ٹیکسی والے نے بڑی سادگی سے پوچھا کہ "کیوں سیٹھ یہ نمایش ابھی چالو رہے گی یا خلاص ہو گئی۔" اس کو تو خیر ہم نے واجبی سا جواب دیدیا۔ مگر اس نے ادیبوں کے کنوینشن کو "ادیبوں کی نمایش" کا نام اچھا دیا ہی اور یہ واقعہ بھی ہی کہ اس نمایش میں ایک سے ایک قابل دید ادیب اور شاعر نظر آیا اتنے ادیبوں اور شاعروں کو بیک وقت جمع کر دینا بجائے خود ایک کارنامہ ہی۔ خدا کرے یہ کارنامہ بس اسی حد تک نہ رہے بلکہ اہل قلم کو جو بقلم خود بنے ہوئے ہیں اُن کے حقوق دلوانے کا فرض یہ کنونشن ادا کرے

انڈا مُرغی اور مُرغا

اخبارات میں انڈا مُرغی کے متعلق بعض نہایت ہولناک اعداد شمار شائع ہوئے ہیں جن کو پڑھ کر چکر سا آنے لگتا ہے کہ خداوندا ہم اہلِ کراچی کا معدہ ہے یا پولٹری فارم بھلا غضب خدا کا ۳۱ دسمبر ۱۹۶۱ء کو ختم ہونے والے پچھلے سال ایک سال میں ہم اہلِ کراچی نے خدا ہم کو نظرِ بد سے بچائے بہتر کروڑ تو صرف انڈے کھائے ہیں اور ساڑھے آٹھ لاکھ مرغیاں چٹ کی ہیں۔ ابھی اس بلا نوشی کا اندازہ کرنے کے بعد جب غش کھا چکنے ہیں اور ہوش ٹھکانے آتے ہیں تو حساب لگانے کو جی چاہتا ہے کہ ان بے گنے اعداد شمار میں سے خود ہمارے حصہ میں کتنی مرغیاں اور کتنے انڈے آئے ہونگے اور جب یہ حساب لگاتے ہیں تو ان اعداد شمار کا پول کھل کر سامنے آجاتا ہے اور بے ساختہ ہنسی آتی ہے کہ یہ اخبار والے بھی رائی کو پربت بنانے میں اپنا

جواب نہیں رکھتے۔ یہ اعداد شمار غلط نہیں ہیں مگر سال میں تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں اور کراچی کی آبادی آپ کی دُعا سے پندرہ لاکھ کے لگ بھگ ہے اب ذرا حساب لگا کر دیکھ لیجیے کہ تقریباً ڈیڑھ انڈا فی کس یومیہ پڑتا ہے اور سال بھر میں نصف کے قریب مرغی ہر باشندۂ کراچی کے حصّہ میں آسکتی ہے۔ ایک سال میں ایک بھی نہیں بلکہ آدھی مرغی جس کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے اور اتنی سی بات کا ایسا بتنگڑ بنایا جا رہا ہے گویا ہم سوائے انڈا مُرغی کے اور کچھ کھاتے ہی نہیں حالانکہ اگر غور کیجیے اور حساب لگائیے تو پتہ چلے گا کہ ایک داڑھ بھی گرم نہیں ہوئی!

سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں سے ایک سو چار دن تو وہی ہوتے ہیں جو گوشت کے ناغہ کے دن کہلاتے ہیں اور یہی وہ دن ہوتے ہیں جن میں گوشت کا غم غلط کرنے کے لیے انڈا مرغی سے معدے کو بہلانا پڑتا ہے لہٰذا جو منتظم قسم کے لوگ ہیں وہ اپنا روز کا ڈیڑھ انڈا بچاتے رہتے ہیں تاکہ بدھ اور جمعرات چار وقت ان ہی ۱۰½ انڈوں کا سالن یا آملیٹ وغیرہ کھا کر خدا کا شکر ادا کر سکیں۔ رہ گئی مرغی وہ چونکہ ایک سال میں نصف مرغی فی کس بیٹھتی ہے لہٰذا ¼ مرغی عید کے لیے اور ¼ بقر عید کے لیے محفوظ رکھی جاتی ہے۔ مُرغی کی دو ٹانگوں میں سے جب ایک ہی ٹانگ ایک سال میں ایک

شخص کو میسّر آئے تو سوال یہ ہے کہ وہ کیا کھائے گا کیا خلال کرے گا اور مُرغی کی ایک ٹانگ کا کبھی قائل نہ ہو گا۔

خدا خیر کرے آج میں کچھ حساب کتاب سے زیادہ ہی کام لے رہا ہوں اور رہ رہ کر وہ بزرگ یاد آرہے ہیں جو اپنی روزمرہ کی زندگی کچھ اسی قسم کا حساب لگایا کرتے تھے کہ ان کے کانوں میں ایک چھناکے کی آواز آئی اور وہ چلّائے :-

"ارے بھئی یہ کیا توڑا؟"

"غلام نے دور ہی سے جواب دیا" حضور گلاس ٹوٹ گیا ہے گر کر"

یہ سنتے ہی وہ برس پڑے۔ "اس مہینہ کا یہ دوسرا گلاس ٹوٹا ہے گویا سال کے چوبیس ہوئے"

یہ حضرت اپنے گھر میں تو یہ حرکتیں نے ساختگی کے ساتھ کرتے ہی رہتے تھے مگر ایک دن ان کو پڑوس میں ایک جگہ تعزیت کرنے جانا پڑا۔ ان صاحب نے ان کو دیکھ کر اپنی غم نصیبی کی تفصیلات شروع کر دیں کہ "بندہ نواز کیا پوچھتے ہیں آپ ہماری حرماں نصیبی کا عالم بیس دن پہلے اسی بچے کی ماں فوت ہوئی تھی اور آج یہ بچہ چل بسا۔ اب تو آنسو بھی خشک ہو چکے ہیں ایک ہی مہینے

میں دو جنازے اُٹھائے ہیں"۔ ایک مہینے میں دو جنازے سنتے ہی وہ حسب عادت بول اُٹھے "یہ تو سال کے چوبیس ہو گئے۔

مسلمانوں کو یہ طعنہ ہمیشہ یاد رہے گا کہ ان کو حساب کتاب نہیں آتا اور وہ کچھ عجیب علی الحساب قسم کے لوگ ہوتے ہیں وہ علی الحساب کماتے ہیں اور علی الحساب ہی خرچ کرتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے تقسیم ملک سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرق یہ تھا کہ حساب داں تو دونوں ہی تھے مگر مگر ہندو جمع کرنا اور جوڑنا جانتے تھے اور مسلمان تفریق کرنے اور گھٹانے میں اس حد ماہر تھے کہ آمدنی کی امید پر خرچ شروع کر دیا کرتے تھے اور یہ بھی یاد نہ رکھتے تھے کہ جس آمدنی کی امید تھی وہ ہوئی بھی یا نہیں البتہ خرچ کی تفصیلات اُن کے سامنے ہوتی تھیں۔ بادل دیکھ کر گھڑے توڑ دینے کا فن آج بھی دنیا کی اگر کوئی قوم جانتی ہے تو وہ ہم ہی ہیں کہیں سے روپیہ آجانے کی امید پیدا ہو جانا شرط ہے خواہ وہ امید موہوم ہی کیوں نہ ہو پھر دیکھیے ہمارے شاہ خرچی کہ جب تک اس متوقع رقم کو پیشگی ہی ختم نہ کرلیں گے چین سے نہیں بیٹھ سکتے اور اگر وہ رقم نہ مل سکے تو اس کی تقدیر کا کھیل سمجھ کر قرض پاٹتے رہیں گے۔ مختصر یہ کہنا کہ ہم حساب جانتے ہی نہیں سراسر زیادتی ہے۔ اور یہ بات ہے کہ حساب کی کسی مد میں طاق ہیں اور کسی

میں بالائے طاق۔

کراچی میں انڈا مرغی کے سلسلے میں جو حساب لگایا گیا ہو اور اس کا جو تجزیہ ہم نے کیا ہے اس کے متعلق آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کراچی کی پندرہ لاکھ کے قریب جو آبادی ہے ان میں سے کتنے ایسے ہیں جن کو حصہ رسدی ۲/۱ انڈا یومیہ اور یہ نصف مرغی سالانہ بھی میسر آسکتی ہو اور کتنے ایسے جو دونوں وقت مرغ مسلم بھنبھوڑنے کی حیثیت رکھتے ہیں کہ مرغے کو چرغا تک بنا کر کھاتے رہتے ہیں یہ درست ہے اور اس اعتراض کو ہم تسلیم کرتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان پندرہ لاکھ میں سے لاکھوں ایسے بھی ہیں جو انڈا

مرغی تو درکنار دو وقت کی چٹنی روٹی کے لیے بھی ترستے رہتے ہیں اور نہ جانے کس طرح اپنا پیٹ پالتے ہیں وہ روکھی سوکھی کھا کر اپنے حصے کے انڈے اور مرغی سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ لہذا یہ ان ہی کے حصے کے انڈے ہوتے ہیں جو بڑے آدمیوں کے برک فاسٹ میں بڑے آدمیوں کی پڈنگ میں اُدُ بڑے آدمیوں کے انڈے کے حلوے میں نظر آتے ہیں اور یہ ان ہی کے حصے کی بچی ہوئی بے شمار مرغیاں ہوتی ہیں جو بڑے آدمیوں کے لیے ہر صورت میں حاضر رہتی ہیں کہ خواہ ان کو تنور میں سینک کر چرغے کی صورت میں کھایا جائے خواہ بھون کر مرغے کی صورت میں کھایا جائے خواہ ان کا سوپ

پیا جاے خواہ ان کا پلاؤ کھایا جاے

در اصل یہ ہمارے حساب کی غلطی نہیں بلکہ ہمارے علی الحساب معاشرے کے علی الحساب نشیب و فراز کی غلطی ہے کہ جو حساب ہم نے لگایا ہے وہ ٹھیک تو ہے مگر ٹھیک بیٹھتا نظر نہیں آتا جو اوسط ہم نے قائم کیا ہے وہ آبادی کے تناسب سے بالکل درست ہے۔ یعنی اگر آپ کراچی کی مردم شماری اور مرغ شماری کے اعداد کو آمنے سامنے رکھ کر منصفانہ تقسیم کریں تو حساب یہی بیٹھے گا کہ فی کس ڈیڑھ انڈہ یومیہ اور فی کس نصف مرغی سالانہ کے حساب سے تقسیم ہو اب اس کا تو کوئی علاج نہیں کہ کسی میں دوسروں کا حق خریدنے کی طاقت اور استطاعت ہو اور کسی میں اپنے حق کے تحفظ کا بھی بوتا نہیں اگر یہ تقسیم مساوی ہو جاے تو سب ہی ہمارے اس حساب کے قائل ہو سکتے ہیں مگر یہ حساب صحیح ہو یا غلط بہر صورت اخبارات نے چونکا دینے والے اعداد و شمار پیش کئے ہیں اُن کے مضحکہ خیز ہونے میں تو اب بھی کوئی شک نہیں

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

بعض لوگوں کو خواہ مخواہ بھی بھڑ لڑھکانے کی عادت ہوتی ہے اور عام گفتگو میں بھی وہ لٹریچر بگھارنے کے شوق میں کتابی زبان بولنا شروع کر دیتے ہیں اور اتنے بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں کہ سننے والا دل ہی دل میں ہجے اور معنی یاد کرتا رہ جاتا ہو مثلاً اسی قسم کے ایک کرم فرما غریب خانہ پر آکر مہمان ہو گئے تھے جانا تھا اُن کو بھارت کے سفر پہ مگر قیام فرما اس لیے تھے کہ ویزا بننے میں دیر ہو رہی تھی لہذا جب بھی ویزا آفس سے واپس آتے تھے اور ان سے پوچھا جاتا تھا کہ :۔

"کہیے جناب آج کیا ہوا۔"

وہ اس سیدھی سی بات کا جواب یہی دیتے تھے کہ :۔

" صاحب تحیر ہو گیا۔ حسب معمول تعجیل کے بجائے تعویق سے کام

لے رہے ہیں اربابِ حل و عقد"

دوسرے دن پھر پوچھا گیا کہ "آج کی خبر سنائیے بندہ نواز"

وہ پھر یہی جواب دیتے کہ "آج بھی تاخیر ہو گیا۔ بدستور تعجیل کے بجائے تعویق"

آخر ایک دن وہ نہایت شگفتہ سے تشریف لائے اور جب اُن سے پوچھا گیا تو ہنس کر بولے :-

"آج تو بفضلہ کامران واپس آیا ہوں"

یہ سُن کر ایک صاحب نے کہا "پھر تو معانقہ ہو گا آج"

اب مصیبت یہ کہ معانقہ وہ نہ جانتے تھے لہذا کچھ سنّاٹے میں آ کر رہ گئے کہ اللہ جانے یہ کس بات کی فرمائش ہوئی ہے۔ آخر بڑے پس و پیش کے بعد بولے :-

"جیسی آپ کی مرضی"

اسی قسم کا ایک حادثہ ابھی پنڈت جواہر لال نہرو پر گذرا ہی کہ ؤ ایک قصباتی کانگریس کمیٹی کے جلسہ میں شرکت کے لئے گئے تو کانگریس کمیٹی کے صدر نے ان کا سواگت کرتے ہوئے کہا کہ "اب میں جواہر جی سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ وہ اپنا بھاشن دیں تا کہ ہم سب لابھ نت ہوں"

پنڈت جی چکرا کر رہ گئے کہ وہ "لابھنجت" کرنا جانتے ہی نہیں تو کسی کو آخر کس طرح "لابھنجت" کر دیں۔ دیر تک بغلیں جھانکنے کے بعد آخر ان کو کانگریس کمیٹی کے ان ہی صدر صاحب سے پوچھنا پڑا کہ "آپ آخر کیا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ کیا کروں"، اُن صاحب نے پنڈت جی کو سمجھایا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ ہم سب کو لابھنجت ہونے کا موقع دیں۔ پنڈت جی نے یقین دلایا کہ اگر میرے امکان میں ہوا اور کوئی قانونی رکاوٹ نہ ہوئی تو میں موقع ضرور دوں گا مگر مجھے بتا تو دیجئے کہ آپ میرے ذریعہ لابھنجت کیونکر ہو سکتے ہیں یہ لابھنجت آخر ہے کیا۔ یہ سُن کر ان صاحب نے کہا "لابھنجت ہوں" سے میرا مطلب یہ تھا کہ "فائدہ اُٹھائیں"، پنڈت جی تعجب سے اُن کا مُنھ دیکھ کر ہنسے اور کہا "اتنی سی بات کے لئے آپ نے خواہ مخواہ پریشان کر دیا تھا میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے مجھ سے کیا کرنے کو کہا جا رہا ہے۔

خیر پنڈت جواہر لال نہرو پر تو اس قسم کے حادثات اکثر گذرا ہی کرتے کرتے ہیں کہ مثلاً ان کی خدمت میں کسی جماعت نے کوئی ایڈریس پیش کیا اور اس میں نہ جانے کیا کیا لکھا گیا جو پنڈت جی کے قطعاً پلے نہ پڑ سکا اب آپ اس کا جواب دینے کھڑے ہوئے تو زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکے

کہ آپ نے میرے متعلق جو کچھ کہا ہے میں اس قابل تو نہیں ہوں مگر آپ کے نظرِ حسن کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے اس ایڈریس میں جو مطالبات پیش کئے ہیں ان پر میں بیٹھنے کے بعد غور کروں گا۔ اور اسی قسم کی گول مول جوابی تقریر کر کے وہ اس قسم کے امتحانوں سے گزر جاتے ہیں مگر پریشانی اس وقت ہوتی ہے جب وہ خود تقریر میں رہ رہ کر اردو کے الفاظ بولتے ہیں اور پھر اُن کی ہندی بنانا پڑتی ہے مثلاً ایک مرتبہ ان کی ایک تقریر ریلے ہو رہی تھی اور وہ مسلسل ہکلا رہے تھے۔ دراصل وہ ہکلاتے نہیں ہیں مگر ہندی الفاظ یاد کر کے بولنے کے لئے ان کو ہکلانا ہی پڑتا ہے۔ کہنے لگے کہ:۔

"میرے والد ۔ والد نہیں بلکہ پتا جی ۔ میرا مطلب ہے کہ میرے پتا جی جو میرے والد تھے جب کبھی تقریر کرتے تھے۔ میرا مطلب ہے بھاشن دیتے تھے اس کو عوام ۔ عوام تو میں غلط کہہ گیا میں کہنا چاہتا تھا جنتا اس لئے پسند کرتی تھی کہ اس میں ملک کی خدمت۔ یعنی گویا ۔ میں کہنا چاہتا تھا دیس کی سیوا کی باتیں ہوتی تھیں۔"

اور اسی طرح وہ تقریر کے بجائے وہ ترجمہ کرتے رہے اور جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس میں سے بہت سی باتیں اس لیے دل کی دل ہی میں رہ گئیں کہ بروقت ان کی ہندی نہ بن سکی۔ اسی طرح جب اُن سے شُدھ ہندی میں بات کی جاتی ہے تو اکثر "نہیں" کی جگہ "ہاں" اور ہاں کی جگہ "نہیں"

کہہ جاتے ہیں ؎

وہ زمیں کی پوچھتے ہیں آسماں کہتا ہوں میں
جب سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو ہاں کہتا ہوں میں

بے محل نہ ہوگا اگر مولانا کا ذکر کر دیا جائے جو ایک مرتبہ اپنے ایک عقیدت مند مرید کے گھر دعوت میں گئے۔ مرید اُن کو دیکھ کر بارے عقیدت کے دوڑا ان کے قدم چھوئے۔ مولانے اس کو روکا اور بڑی شفقت سے سمجھایا کہ قدم بوسی غیر اسلامی طریقہ ہے۔ البتہ دست بوسی کر سکتے ہو" اور جب مرید کی سمجھ میں نہ آیا تو آپ نے بتایا کہ "دست" ہاتھ کو کہتے ہیں" دست بوسی" یعنی ہاتھ چومنا۔ مرید نے ہاتھ چومنے کے علاوہ گرہ میں یہ بات باندھ لی کہ ہاتھ کو دست کہتے ہیں تھوڑی دیر کے بعد مولانا نے فرمایا۔ "آب خنک منگاؤ۔ مرید مُنہ اٹھائے کھڑا رہا کہ اللہ جانے حضور کون سی روحانی چیز مانگ رہے ہیں۔ مولانا کو پھر سمجھانا پڑا کہ "آب یعنی پانی۔ خُنک یعنی ٹھنڈا۔ میں ٹھنڈا پانی مانگ رہا ہوں" مرید دوڑا پانی لانے کے لیئے اور یاد کرتا گیا کہ پانی کو آب کہتے ہیں اور ٹھنڈے کو خُنک تھوڑی دیر کے بعد اس نے دسترخوان چن دیا اور لوٹا لے کر کھڑا ہو گیا کہ ہاتھ دھلائے مگر یہی وقت تھا پڑھے ہوئے سبق کو دوہرانے کا لہٰذا اس نے عرض کیا کہ حضور

آپ دست لے لیں۔" ظاہر ہے کہ مولانا کو پھر سمجھانا پڑا ہو گا کہ "آپ دست ایک اور ہی چیز ہوتی ہے۔ مگر سب سے زیادہ مولانا اس وقت پریشان ہوئے جب کھانا کھانے کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا۔ "اب ذرا قیلولہ کا انتظام کر دو۔" مرید سخت پریشان ہوا کہ اب یہ انتظام کس طرح کرے آخر اس کی سمجھ میں آ گیا اور وہ سلفچی اور لوٹا لے کر حاضر ہو گیا کہ اسی سلفچی میں قیلولہ کر لیجئے۔

قابلیت بگھارنے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ وہ کسی جاننے والے سے بگھاری جائے مگر مصیبت یہ ہے کہ عام طور پر لوگ ان ہی کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں جو بات سن کر مفہوم ٹاپتے رہ جائیں اور بغلیں جھانکنے کے علاوہ جن کے پاس کوئی چارہ نہ ہو اور خدا نہ کرے کہ کسی جاہل کے ذہن میں ایک آدھ موٹا سا لفظ اٹکا رہ جائے تو اس کا مصرف ایسا نکالتا ہے کہ آپ چکرا کر رہ جائیں مثلاً ایک دن ایک صاحب اپنی بیوی کو ڈانٹ رہے تھے کہ "پان میں اتنی تماخو جھونک دی کہ پان کھاتے ہی دوران گفتگو شروع ہو گیا۔" بیوی تو اپنے شوہر نامدار کی قابلیت سے سہم کر رہ گئی ہوں گی مگر آپ کر لیجئے ان کا جو کچھ کر سکتے ہوں کہ دوران سر کو "دوران گفتگو" کہہ رہے تھے۔

ستاروں کے آگے

روس کے شمسی راکٹ کی کامیاب فلک پیمائیوں کے بعد سے چونکہ یہ تقریباً طے ہو چکا ہے کہ اب انسانوں کی پہونچ سیاروں اور ستاروں میں ہو کر رہے گی لہٰذا ہر طبقہ میں یہ سوال بڑی سنجیدگی کے ساتھ زیر غور آ رہا ہے کہ ان سیاروں اور ستاروں میں جب ہم پہنچیں گے تو ہم کو وہاں کس قسم کی زندگی ملے گی۔ ایک عیسائی مشنری نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جو لوگ ستاروں اور سیاروں کی طرف جائیں اُن کے پہلے ہی گروہ میں عیسائی مشنریوں کو ضرور جانا چاہیئے تاکہ ان سیاروں کی مخلوق پر تبلیغ کر کے ان کو راہ راست دکھائی جا سکے ایسا نہ ہو کہ بے راہ رو انسانوں سے مل جل خدا کی راہ سے ہٹ جائیں اور چونکہ یہ روسی راکٹ ہو گا لہٰذا اس کا بھی امکان ہے کہ جس جس ستارے یا سیارے میں یہ پہونچے وہاں بے دینی

اور دہریت کا زور ہو جائے۔ اب عیسائی مشنریوں کے دیکھا دیکھی بہت سے دوسرے مذاہب کے مبلغ بھی یہ چاہیں گے کہ وہ پہلے پہونچ جائیں تاکہ عیسائی مشنری پہلے ہی اسے سب کو عیسائی بنا کر نہ رکھ دیں۔ صورت اب یہ نظر آ رہی ہے کہ ان سیاروں پر مختلف مذاہب کے مبلّغ جمع ہو کر مناظرے اور مباحثے شروع کر دیں گے اور وہاں انسانی جھیل ہیل کی ابتدا سر کھیٹول سے ہوگی۔

مذہبی مبلغین کی اس پیش قدمی سے سب سے زیادہ نقصان ہوگا۔ ان ممالک کے سیاست دانوں کا جہاں سیاسی ہنگامہ آرائیاں ممنوع قرار دے دی گئی ہیں۔ مثلاً ہمارے پاکستان ہی میں تمام سیاست داں بیکار بیٹھے ہوئے ہیں۔ تقریریں کرنے کو ترس رہے ہیں۔ جلوس نکلوانا اب خواب وخیال ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی ان کے ساتھ زندہ باد کا نعرہ تک بلند نہیں کرتا۔ نہ اخباری بیان دے سکتے ہیں نہ پوسٹر بازی کر سکتے ہیں۔ اس سنّاٹے سے گھبرا کر کسی نے شعر و شاعری شروع کر رکھی ہے۔ کوئی تاش کھیل کھیل جی بہلا رہا ہے۔ کسی نے کوئی کاروبار شروع کر دیا ہے۔ کسی نے اپنی پارٹی کے سائن بورڈ پر سفیدہ پھروا کر اپنا سائن بورڈ تیار کرا لیا ہے جس پر نام نامی اسم گرامی کے بعد صدر آل پاکستان انجمن وغیرہ وغیرہ کے بجائے اب لکھا

ہوا ہی بی۔ اے۔ ایل۔ بی۔ ہو کیوں۔ کسی جماعت کا سائن بورڈ کسی کباڑیے کی دوکان پر ملتا ہی۔ تو کسی جماعت کے لیٹر پیپر پر دھوبی کا حساب یا رمی کے نمبر لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ ان حالات میں اگر سچ پوچھیے تو حق ان ہی حضرات کا تھا کہ یہ کسی اور سیارے میں جا کر اپنی سیاسی پریکٹس شروع کرتے مختلف سیاسی جماعتوں کے لوگ ہوتے سب اپنے اپنے مورچے قائم کرتے۔ ایک دوسرے سے تو تو میں میں کرتے ایک دوسرے کو غدار اور اپنے کو مخلص کہتے۔ کچھ الکشن بازیاں ہوتیں۔ کچھ حصول اقتدار کی کشمکش ہوتی تو لطف بھی آتا۔

ایک فائدہ ان حضرات کے دوسرے سیاروں کی طرف جانے سے یہ بھی ہوتا کہ ان کو وہاں جانے سے کوئی روکتا بھی نہیں یعنی سب ہی کہتے کہ ع

بسفر رفتنت مبارکباد

بلکہ دوسرا مصرعہ بھی آدھا کہہ دیتے کہ "بسلامت روی" البتہ یہ کہتے کہ "باز آئی" بلکہ ان کو اسی شرط پر نئی دنیا بسانے کی اجازت دی جاتی کہ وہ پھر اس طرف کا رخ نہ کریں گے اور یہ حضرات خود بھی اس طرف رخ کرنا آخر کیوں چاہتے یہاں ان کے کشش ہی کیا باقی رہ گئی ہی کہ وہ یہاں آتا

یا یہاں سے جا کر واپس آنا چاہیں تو وہ خدا سے چاہتے ہیں کہ ان کو خدا کی اس کائنات میں کوئی گوشہ ایسا مل جائے جس میں وہ اپنے جلوس نکلوا سکیں، جس میں جلسے منعقد کر کے دھواں دھار تقریر کر سکیں اور جہاں اپنی لیڈری کے جھنڈے گاڑ سکیں، یہاں تو اُن مفلوج سیاست دانوں کا یہ عالم ہے کہ گویا ؎

پَر کتر کر مرے صیاد نے چھوڑا ہے مجھے
نام اس قید کا رکھا ہے رہا ہو جانا

اس زمین کا شاعر اقبال اب سے بہت پہلے کہہ گیا ہے کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

چنانچہ اقبال کی اسی زمین سے جستجو کرنے والے ستاروں سے آگے کے جہاں ڈھونڈھتے ہوئے چاند سے آگے نکل چکے ہیں اور اب یہ طے ہو چکا ہے کہ کائنات کی تسخیر انسانی اختیارات سے باہر کی چیز نہیں ہے عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے کہ ہمارے بچے مریخ یونیورسٹی میں پڑھیں گے ہم اُن کو اپنی خیریت کے خط کبھی زہرہ سے لکھا کریں گے اور کبھی مشتری سے کہ الحمد للہ میں بخیریت ہوں اور تمھاری خیریت نیک مطلوب ہے، لیکن

سرکاری کام سے ایک ہفتہ کے لیے مشتری آیا ہوا ہوں والدہ تمھاری چاند ہی میں اپنی کچھ سہیلیوں سے ملنے اتر گئیں۔ واپسی میں ان کو لیتا ہوا دنیا کی طرف چلا جاؤں گا تم اپنی خیریت کا خط دنیا ہی کے پتہ پر بھیج دینا سُنا ہے کہ آئندہ ماہ مریخ میں ایک کل کائناتی مشاعرہ ہو رہا ہے اور مجھ کو بلایا جا رہا ہے اگر یہ درست ہے تو اس مشاعرے کے موقع پر تم سے بھی ملاقات ہو جائے گی

جی ہاں اس قسم کے مشاعرے اب عام طور پر ہوا کریں گے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ اردو۔ فارسی یا عربی کے بجائے کسی کائناتی زبان میں ہوں اور مصرع طرح کچھ اس قسم کا آیا کرے کہ۔ ع

$\frac{2}{4}$ × چو غ ف ÷ ½ + آخ آخ آخ

آپ کہیں گے کہ اس قسم کے مصرعہ طرح پر غزل کیونکر ہو سکے گی۔ یہ تو ہم کو بھی فی الحال نہیں معلوم مگر یہ طے ہے کہ ہوگی شاعری کچھ اسی قسم کی اور دیے جائیں گے طبع آزمائی کے لئے اسی قسم کے مصرعے۔ اگر ہمارے شعرائے کرام یہ چاہتے ہیں کہ ان کی شاعری یہ شکل اختیار نہ کرے تو اُن کو بھی چاہیے کہ وہ بھی ان ستاروں کی طرف جانے میں کسی سے پیچھے نہ رہیں تاکہ وہاں جا کر

شعر و ادب کے وہی چرچے شروع کرائیں جو وہ چاہتے ہیں مگر سنا ہو گا بعض ستارے ایسے ہیں جنھیں تخلص کے بجائے دُم رکھنا پڑتی ہے۔ شروع شروع میں تو شرم آئے گی اُس دُم پر مگر جب سب ہی دمدار نظر آئیں گے تو یہ حجاب اُٹھ جائے گا۔ غرض مدعا یہ کہ شعراء کو بھی تکلف سے کام نہ لینا چاہیے ورنہ ان ستاروں کی ادبی فضائیں ان کے قابو سے باہر ہو جائیں گی۔

شاعرے تو مشاعرے بہت سی ایسی شادیوں میں شرکت کرنا پڑے گی کہ ہم اپنی دنیا میں ہیں برات جا رہی ہے زحل سے اور دُلھن کا گھر ہے عطارد میں مگر تعلقات کچھ اسی قسم کے ہیں کہ تقریب میں شریک ہونا بیحد ضروری ہے لہذا بیٹھیں گے راکٹ پر اور روانہ ہو جائینگے اور یہ سب سفر بس اسی قسم کے ہوا کریں گے جیسے آج کل ہم لوگ کراچی سے جیجا وطنی یا میاں چنوں کی طرف جاتے ہیں۔ اس وقت تو آپ اس کو مذاق سمجھ رہے ہوں گے مگر چاند تک راکٹ کے پہونچنے پر بھی تو آپ ہنسا کرتے تھے اور بڑے تمسخر سے کہتے تھے

ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

آخر انسانی تخلیق نے اس وہم کو واقعہ کر دکھایا یا نہیں۔ اگر یہ ہو سکتا
آخر انسانی تخلیق نے اس وہم کو واقعہ کر دکھایا یا نہیں۔ اگر یہ ہو سکتا
ہے تو باقی باتوں پر آپ کو تعجب کیوں ہے۔

ایک شکاری اور شکار

اللہ جانے ڈیوک آف ایڈنبرا کو وہ بریانی زیادہ پسند آئی ہے جو بیچ لکژری ہوٹل میں اُنھوں نے تناول فرمائی تھی یا وہ لوک نامی زیادہ پسند آیا جو وزیر تجارت مسٹر بھٹو نے ان کو لاڑکانہ میں دکھایا مگر ان دونوں سے زیادہ وہ ایک بیالیس مرغابیوں کے اخلاق سے متاثر نظر آتے تھے جو مارے تواضع کے ان پر سچ قربان ہو گئیں اور پروانہ وار ان کی بندوق کی نال کے سامنے آ آکر نثار ہو گئیں۔ یہ اخلاق ان کو یورپین مرغابیوں میں مشکل ہی سے نظر آیا ہوگا اور وہ یقیناً پاکستانی مرغابیوں کے اس مہمان نوازی کو ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ انھوں نے بندوق اُٹھائی اور مرغابیاں کھنچ کھنچ کر نشانہ پر آنے لگیں کہ

اے مہمان عزیز۔ ع

رکھے گا کون تجھ سے عزیز اپنی جان کو

وہ تو کہیئے کہ شاہزادہ فلپ نے آزاد پاکستان کا دورہ کیا ہے ورنہ سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے تو یہاں یہ حال تھا کہ حکمراں قوم کا اگر کوئی شکاری شکار کے لئے نکلا تو اس کو یہ زحمت نہ ہوتی تھی کہ وہ شکار ڈھونڈھتا پھرے بلکہ شکار خود اس کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا تھا اور جہاں صاحب کو دیکھا سر جھکا کر کھڑا ہو گیا کہ لیجئے حضور میں حاضر ہوں جی چاہے خود گولی چلا دیجئے ورنہ مجھے بندوق دیجیے میں خود کشی کر لوں۔ صاحب لوگوں کے لئے ان کے دیسی ماتحت شکار کا ایسا انتظام کرتے تھے کہ جنگل میں منادی کر دی جاتی تھی کہ ؎

سینہ خالی کنید از دل ہا — یار بہر شکار می آید

چنانچہ ایک مرتبہ ایک صاحب بہادر نے ریچھ کے شکار کا شوق ظاہر فرمایا اب مصیبت یہ تھی کہ جس علاقہ میں وہ شکار کھیلنا چاہتے تھے وہاں ریچھ ہوتا ہی نہ تھا مگر شعار اور اطاعت گذار ماتحتوں نے ریچھ کے شکار کا انتظام کر دیا اور صاحب بہادر شکار کھیلنے پہونچ گئے۔ جنگل میں تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک جھاڑی سے ریچھ نکل کر سامنے آ گیا اور صاحب نے جو اس پر بندوق اٹھائی تو وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر دونوں پیروں پر

کھڑا ہو گیا اور لگا چھما چھم ناچنے۔ غلطی ہو گئی تھی کہ صاحب کے ماتحت افسروں نے ریچھ والے سے ریچھ تو خرید لیا مگر اس کے پیروں سے گھنگرو اور گردن سے کوڑیاں اتارنا بھول لئے۔ لہذا یہ بھانڈا پھوٹ گیا۔

خیر یہ تو دور غلامی کا ذکر ہے مگر پاکستان بنجانے کے بعد بھی اس حد تک تو ہوا ہو کہ الحاج خواجہ ناظم الدین صاحب بحیثیت گورنر جنرل کے جب لاہور تشریف لے گئے تو ان کو نیشنل گارڈ کی ریلی کی سلامی لینے قصور بھی جانا تھا لہذا پروگرام یہ بنایا گیا کہ وہ بٹیروں کا شکار بھی قصور میں کھیلیں اس کے بعد سلامی میں چنانچہ کچھ نہ پوچھیے کہاں کہاں سے بٹیریں لا لا کر اس جگہ چھوڑی گئیں جہاں گورنر جنرل کو شکار کھیلنا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بٹیریں بلٹیر بازوں سے حاصل نہ کی گئی ہوں گی اور نہ چڑیا بازار سے خریدی گئی ہوں گی مگر ہفتوں پہلے سے چڑی ماروں کو مصروف رہنا پڑا ہو گا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں بٹیریں پکڑ پکڑ کر جمع کریں اور اس رات اس علاقہ میں چھوڑ دیں جہاں صبح کے دھندلکے میں گورنر جنرل شکار کھیلنے آنے والے تھے۔

ہمارا مطلب یہ نہیں ہو کہ شاہزادہ فلپ نے جو ایک سو بیالیس مرغابیاں

شکار کی ہیں وہ بھی اسی طرح خرید کر اور پکڑوا کر وہاں اچھالی گئی ہوں گی، اگر یہ صورت ہوتی تو ان کی تعداد صرف ایک سو بیالیس نہ ہوتی بلکہ ایک ہزار ایک سو بیالیس ہوتی۔ شاہزادہ فلپ کے لئے اب اس اہتمام کی کیا ضرورت ہو وہ نہ حکمراں کی حیثیت سے آئے ہیں نہ لارڈ کانہ کے مقامی حکام کو اس کی ضرورت تھی کہ مرغابیوں کا پہلے سے انتظام کر رکھیں ورنہ ممکن ہو کہ صاحب ناراض ہو کر ان کا ریکارڈ خراب کر دیں۔ یہ شکار تو صحیح معنوں میں شکار ہی کی حیثیت رکھتا ہو اور اس میں صرف وہی مرغابیاں شکار کی گئی ہیں جن کی قسمت میں یہ اعزاز لکھا تھا کہ وہ ایک عظیم سلطنت کی ملکہ کے شوہر کے نشانہ پر آکر ماری جائیں اور مرغابیوں کی تاریخ میں زندہ جاوید بن جائیں۔ البتہ اس شکار کا اہتمام کرنے والے خوش ضرور ہوئے ہوں گے کہ ان مرغابیوں نے ان کو شرمندہ نہ ہونے دیا اور بحیثیت مجموعی یہ شکار کامیاب ضرور رہا۔

اس شکار کے بعد ہمارے وزیر تجارت مسٹر بھٹو نے ڈیوک آف اڈنبرا کو جو ڈنر دیا ہو وہ تو ظاہر ہو کہ پر تکلف ہوگا اور اس میں وہ بریانی بھی ہوگی جو ڈیوک کو بے حد مرغوب ہو مگر اس ڈنر کے بعد ان کو جو لوک ناچ دکھایا گیا ہو وہ اللہ جانے ڈیوک کس حد تک سمجھے اور اس کو کتنا پسند کیا۔

موقع پر ہم کو ڈیوک کے "دیا خسر شاہ جارج پنجم کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے کہ جب وہ دلی دربار کے موقع پر ہندوستان تشریف لائے تو علاوہ دوسری تقریبات کے اُن کے لئے دس منٹ کا ایک پروگرام ہندوستانی موسیقی کا بھی رکھا گیا تھا چنانچہ وقت مقررہ پر بادشاہ سلامت کو اس جگہ لایا گیا جہاں یہ پروگرام ہونے والا تھا اور اس پروگرام کو پیش کرنے کے لئے سازندوں نے ساز ملانا شروع کیے۔ سارنگی نواز نے سارنگی کو ٹنٹنا ٹنٹنا کر کھونٹیاں اینٹھنا شروع کیں طبلہ نواز نے ہتھوڑی سنبھالی اور طبلہ پر اُنگلیاں اور ہاتھ مار مار کر اس کو درست کرنا شروع کیا۔ ایک استاد نے سارنگی اپنے زانو پر لٹا کر اس طرح ملانا شروع کی جیسے کوئی شفیق ماں اپنے شیر خوار بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ اسی "ٹن ٹن"، کھٹ کھٹ اور دھب دھب" میں دس منٹ گذر گئے اور بادشاہ سلامت اسی کو ہندوستانی موسیقی سمجھ کر سر دُھنتے ہوئے اور "ونڈرفل۔ ایکسیلنٹ" وغیرہ کہتے ہوئے وہاں سے اُٹھ گئے۔ اُن کو کیا پتہ کہ یہ تو صرف ہندوستانی موسیقی کا دیباچہ تھا اور تان پلٹے تو اس کے بعد شروع ہونے والے تھے۔ خدا کرے اسی قسم کا لوک ناچ ڈیوک نے لاڑکانہ میں نہ دیکھا ہو۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ اس قسم کے مہمانوں کی تواضع کا طریقہ بدلنے کی اشد ضرورت ہے وہ یہاں اس لئے نہیں آتے کہ ہم ان کو ان ہی نقالی کر کے دکھائیں وہی انگریزی کھانے کھلائیں جن سے بہتر وہ خود کھاتے رہتے ہیں وہی فیشن اسیل تماشے دکھائیں جو وہ دیکھ دیکھ کر تھک چکے ہیں ہم کو چاہیے کہ ہم ان کو اپنے کھانے کھلا کر اور اپنے باورچیوں اور کاریگروں کے کمالات دکھا کر اپنے کلچر کا ان سے اعتراف کرائیں اعتراف کرائیں۔ اپنے فنون لطیفہ کے نمونے ان کے سامنے پیش کریں مثلاً ان کو ایک خالص فرشی محفل میں لا کر مسند پر گاؤ تکیے کے سہارے بٹھایا جاتا، پیچوان اور خاصدان پیش کیا جاتا اور پھر باقاعدہ مجرا دکھایا جاتا۔ ان کو کسی مشاعرے میں شرکت کا موقع دیا جاتا۔ ان کو بٹیروں یا مرغوں کی پالی کی سیر کرائی جاتی ان کو کبڈی کا موقع دیا جاتا۔ ان کو بٹیروں یا مرغوں کی پالی کی سیر کرائی جاتی۔ ان کو کبڈی کا میچ دکھایا جاتا۔ ان کو قوالی سنائی جاتی، ان کو پٹے بازی کے کمالات دکھائے جاتے۔ ان کو ہیر سنوائی جاتی ان کو بولیاں سنوائی جاتیں۔ ان کو نرت دکھا کر اسکی فنی باریکیاں سمجھائی جاتیں اور اسی طرح کی بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو ان کے لئے نئی ہوتیں۔ اب مثلاً وہ بریانی کھا کر جھوم اٹھتے کاش ان کو رساول اور بالائی پیش کی جاتی تاکہ بھول جاتے وہ ہر قسم کی انگریزی پوڈنگ سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی چکھائی جاتی

تو ملکہ سے جا کر تعریف کرتے۔ خیر آئندہ سہی۔

ہم تو کام سے ہٹ گئے

کتنی سچی بات کہی ہے حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم نے کہ ؎

اکبر ڈرے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

یہ واقعہ ہے کہ بڑے بڑے شیر افگن اور کوہ شکن مردوں کو جو توپوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے رہے گولیوں کی بارش سے نہاتے رہے اور گھمسان کی لڑائی میں موت سے کھیلتے رہے عورت کے ایک خنجر ابرو سے ہلاک ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ جن کو ملک الموت بھی مارنے سے عاجز رہا اس وقت مر سکے جب خود ملک الموت کو کسی قتالۂ عالم کے روپ میں آنا پڑا اور تیر نظر سے ان سخت جانوں کو ہلاک کرنا پڑا۔ بڑے بڑے شمشیر زنوں کے بازو شل ہو گئے ایک سے ایک تیر انداز کا نشانہ غلط ثابت ہوا۔

جو وار کیا وہ اوچھا پڑا اگر ایک نگاہ غلط انداز نے اسی جاں باز کو ایک ہی وار میں ایسا مارا کہ پھر اس نے پانی نہ مانگا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے میدان میں علاوہ توپ بندوق اور دوسرے اسلحہ کے دشمن کی طرف سے خوبصورت عورتیں بھی اسلحہ کے طور پر اپنے حریف کو رام کرنے کے لیئے بروئے کار لائی گئی ہیں اور تجربہ یہ ہوا ہے کہ ناز و ادا کی مار زیادہ کارگر ثابت ہوئی ہے توپ، اور بندوق کی مار کے مقابلہ میں۔

یوں دیکھیئے تو یہ دھان۔ پان۔ نازک اندام عورت کسی کھیت کی مولی ثابت نہیں ہوتی۔ ایک قدم تو کمر سو بل کھا جاتی ہے۔ ہوا کا جھونکا آجائے تو لال ڈوپٹہ ململ کا ہی نہیں اڑتا وہ خود بھی اڑنے کے لیئے پر تولنے لگتی ہے۔ خاک کی اس چٹکی کو اگر کوئی سورما پھونک بھی مار دے تو وہ اڑ جائے مگر یہ واقعہ ہے کہ ایک کا ایک تبسم ہزار ایٹم بموں سے زیادہ مہلک ثابت ہوتا ہے اس کی ایک نگاہ غلط انداز بڑے سے بڑے مرد میدان کو پسپا کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس کی تیغ ابرو کا ایک ہی وار بڑے بڑے شمشیر زن جنگجوں کو سپر انداختہ کر کے رکھ دیتا ہے اور یہ بات سمجھ دار اقوام نے تسلیم کر لی ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت وہی نزاکت اور لطافت ہے جو نسائیت کو حاصل ہے توپوں کی گرج اور کسی آواز سے سہمتی نظر آتی ہے تو وہ پازیب

کی جھنکار ہی ہے۔ یہ کمزوری دراصل وہ شہ زوری ہے جو بڑے بڑے سورماؤں اور جرّاروں سے پانی بھروا تی نظر آتی ہے خدا محفوظ ہی رکھے حسن کے حربوں سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ عورت اپنے کس داؤں سے شکست دے گی اور اس کا نقشۂ جنگ کیا ہے وہ مسکرا کر اپنا کام نکال لیتی ہے۔ تیوریوں پر بل ڈال کر بھی فاتح بن جاتی ہے۔ ٹھنک کر بھی خط غلامی لکھوا لیتی ہے اور اگر کوئی حربہ کارگر نہ ہو تو آنسو بہا کر تو ایسا ڈبوتی ہے مدمقابل کو کہ وہ لاکھ شناوری دکھائے مگر غرق ہو کر ہی رہتا ہے۔

عورت کی اسی "اشک آور گیس" سے اپنے کو بچانے کے لیے بھارت کی حکومت بمبئی نے سرکاری ملازمین کے لیے ایک قانون نافذ العمل کیا ہے کہ وہ اپنے مطالبات منوانے کے لئے کسی قسم کا کوئی مظاہرہ نہ کریں اور کوئی احتجاجی شکل اختیار نہ کریں۔ مثلاً بھوک ہڑتال، پیاس ہڑتال، قلم چھوڑ ہڑتال، پنسل توڑ ہڑتال وغیرہ اسی لیے کہ وہاں اس قسم کی ہڑتالیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں مگر حکومت نے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا ہے کہ وہ عورتیں جو سرکاری ملازم ہیں وہ "آنسو نچوڑ" ہڑتال تو ہرگز نہ کریں اس لیے کہ وہ اپنے مطالبات ے گراتی ہیں خواہ

وہ جائز ہوں یا ناجائز۔ اور جب کچھ بس نہیں چلتا تو بٹوے کھلانا شروع کر دیتی ہیں ظاہر ہے کہ عورت کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر اپنے اصول پر آہنی عزم کے ساتھ قائم رہنے والے بھی موم کی صورت میں گھلنا شروع شروع کر دیتے ہیں اور ان آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ کر چلانا شروع کر دیتے ہیں کہ :۔

"ماں جی بس کرو۔ بہن جی بس کرو۔ بس بہتر ہے بس۔ روک لے اپنے آنسو جو تو کہتی ہے وہی ہو جائے گا مگر پرماتما کے لیے یہ رونا دھونا ختم کر دے۔"

اب آپ ہی بتائیے کہ ان حالات میں کسی قانون کا اپنی جگہ قائم رہنا کس قدر دشوار ہے۔ کیسے ہی اصول وضع کیے جائیں مگر وہ ان زنانہ آنسوؤں کے مقابلہ میں ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں اور مرد ملازموں پر خواہ کیسا ہی رعب جما لیا جائے مگر جب کسی مرد آہن قسم کے افسر بالا کی خدمت میں کوئی دیوی جی اپنی ساڑھی کا آنچل درست کرتی ہوئی پہونچتی ہیں تو لاکھ یہ طے کر لے کہ یہ میرے امتحان کا پرچہ آرہا ہے اور میں اس میں کامیاب ہو کر رہوں گا چنانچہ وہ دیوی جی کے تبسم کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دیوی جی کی بیچارگی کو خاطر میں نہیں لاتے جب

وہ اپنا انگوٹھا چباتی ہیں یا پیمائش داماں میں مصروف ہوتی ہیں اس وقت بھی وہ اپنے دھڑکنے والے دل پر پیپر ویٹ ہی رکھ لیتے ہیں مگر جب وہ دیوی جی اپنے ترکش کا آخری تیر آزماتی ہیں یعنی چشم فسوں ساز سے ایک موتی نکل کر مژگاں پر تھرتھراتا ہوا اور پھر رخساروں پر یہ موتی ڈھلکنا شروع ہوتے ہیں تو حاکم بالا نہایت تیزی سے "حکم کے غلام" بننا شروع کر دیتے ہیں۔ کسمساتے ہیں۔ پہلو بدلتے ہیں۔ اور آخر گھبرا کر اعترافِ شکست ہی کرتے بن پڑتی ہے کہ تم جیتیں ہم ہارے جو تم کہہ رہی ہو وہی ہوگا مگر اب یہ آنسو کسی طرح خشک کرو اور ہمارے حال زار پر رحم کھاؤ۔

عورت کی اس شہ زوری سے سب ہی واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ سخت سے سخت معرکہ میں عورت نے اپنی آنکھ کے ایک آنسو میں نہ جانے کتنے ضابطے اور کتنے قانون ڈبو کر رکھ دیئے ہیں لہذا حکومت بمبئی نے خاص طور پر عورتوں کو منع کیا ہے کہ وہ اپنی بات منوانے کے لیے اپنے آنسو ہرگز استعمال نہ کریں۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ حکم امتناعی بھی اگر ان ہی آنسوؤں کی زد پر آگیا تو کیا ہوگا۔ اس حکم کے خلاف اگر کچھ دیویاں قطار باندھ کر حاکم بالا کے حضور جا پہنچیں اور ان سے کہیں کہ اس حکم کو واپس لو ورنہ ہم

روتے ہیں تو وہ حاکم بالا صاحب اپنے کو کس طرح اس دھمکی سے محفوظ رکھیں گے اور اگر سچ مچ وہ عورتیں رو دیں تو سوائے اس کے کہ خود بھی وہ رو دیں اور کیا کر سکیں گے؟

شادی - حماقت ہے

شادی کے بعد سے اس بات پر غور کرنے کی کچھ عادت سی ہو گئی ہے کہ شادی کرنا کوئی دانشمندانہ فعل ہے یا حماقت! یعنی اگر یہ دانشمندی ہے تو پھر بعض اوقات، اپنے بے وقوف ہونے کا بے ساختہ احساس کیوں ہونے لگتا ہے۔ اور اگر یہ حماقت ہے تو اس حماقت میں دنیا کیوں مبتلا نظر آتی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ کوئی غور کرنے کی بات تھی تو شادی سے پہلے غور کیا ہوتا۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ غور کرنے کا شعور عام طور پر شادی کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ اس دنیا سے شادی کی رسم کب فنا ہو چکی ہوتی۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ شادی ہو چکنے کے بعد اس پر غور کرنے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا فائدہ ایک شادی شدہ انسان

کو تو خیر نہیں پہونچ سکتا۔ لیکن خلق اللہ کو فائدہ پہونچنے کا قوی امکان موجود ہے۔ جس طرح دنیا کے تمام تجربے حاصل کرنے والے بنی نوع انسان کے محسن ہیں۔ اسی طرح ہم شادی شدہ لوگ بھی آئندہ نسلوں کے محسن ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ نسلیں۔ ع

دیکھیں ہمیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

یقیناً وہ عظیم المرتبت شخص ہم سب کا محسن تھا۔ جس نے سب سے پہلے زہر کھا کر مرنے کا تجربہ کیا اور دنیا کو زہر کے متعلق یہ شعور عطا کیا کہ اس کے کھانے سے آدمی مرجاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی شادی اس لیے کی ہے کہ غیر شادی شدہ ہم کو دیکھیں کہ شادی کرنے کے بعد انسان وہ ہو جاتا ہے جو ہم ہو گئے ہیں۔

شادی تو خیر ایک مستقل مبحث بلکہ ایک فن مکمل ہے۔ اس صحرا کا صرف ایک ذرّہ اور اس قلزم کا صرف قطرہ اس وقت موضوع بحث ہے۔ یعنی بیوی بھی نہیں بلکہ بیوی کے رشتہ دار، اب اگر آپ اس ذرے کی وسعتوں اور اسی قطرہ کی گہرائیوں پر غور کریں تو چیخ اُٹھیں گے۔

اسی قطرے میں دریا ہے اسی ذرے میں صحرا ہے۔ بیوی کے رشتہ دار ایک شادی شدہ انسان کے لئے عام طور پر سانپ کے مُنھ والی چھچھوندر ثابت ہوتے ہیں جن کو نہ اُگلا جائے نہ نگلا جا سکتا کہ وہ بیوی کے

رشتہ دار ہیں۔ اور ننگا اس لیے نہیں جا سکتا کہ اپنے رشتہ دار نہیں ہیں
اپنے رشتہ داروں کے متعلق ایک آدمی کو ہر وقت اُگلنے یا نگلنے کا اختیار
حاصل رہتا ہے۔ اُن سے دل خوش ہے، طبیعت میل کھا رہی ہے۔ دل قبول
کر رہا ہے تو تعلقات قائم ہیں' ورنہ بہانہ ڈھونڈ کر لڑ لیے۔ وہ اپنے گھر خوش
ہم اپنے گھر خوش، لیکن بیوی کے رشتہ داروں کے متعلق تو یہ گویا ایک طے
شدہ بات ہے کہ اُن سے ہر حال میں تعلقات رکھنا ہیں۔ اُن سے خلوص کا
اظہار کرنا ہے، ان کی مدارات میں دل، جگر اور آنکھوں کے فرش بچھا کر اُن پہ
جذبات کے گاؤ تکیے لگانا ہیں۔ اگر وہ بڑے ہیں تو سعادت مندی کے
ان کو وہ جوہر دکھانا ہیں جو خود اُن کی ذاتی اولاد سے ممکن نہ ہوں۔ اگر برابر
کے ہیں تو محبت کا وہ اظہار کرنا ہے کہ کبھی منافقت کے قائل ہو جائیں اگر
چھوٹے ہیں تو اس قسم کی شفقت کرنا ہے۔ جس میں گستاخی کا کوئی امکان
نہ ہو۔ البتہ اگر ادب کا پہلو نمایاں ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں ہے۔ آپ کو
معلوم ہے کہ اس قسم کی زبردستی اور نفس کشی سے ایک انسان کس حد تک
جرائم پیشہ ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کی اخلاقی جرأت فوت ہو جاتی ہے، ضمیر کی
زبان پر فالج گر جاتا ہے، سچائی کے عالم میں آ جاتی ہے۔ ایمانداری اختلاج
میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور بحیثیت مجموعی وہ انسان اگر کچھ باقی رہ جاتا ہے تو
صرف منافق، دروغ باف، اور ایک حد تک ڈرپوک بھی۔ لیکن کچھ بھی ہو

اگر اس کو بیوی پیاری ہے تو بیوی کے رشتہ داروں سے اچھے تعلقات رکھنا ہی پڑتے ہیں۔ خواہ دل ہی دل میں وہ خودکشی یا فرار کے امکانات پر کتنا ہی غور کیوں نہ کرے۔

بیوی کے رشتہ داروں کی بھی عجیب عجیب قسموں سے ایک بیوی والے کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان میں سے موت کا درجہ تو کم و بیش سب ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن بعض ہوتے ہیں محض موت، بعض ناگہانی موت، بعض غریب الوطنی کی موت اور بعض ہر حال میں ملک الموت۔ محض موت تو خاص خاص لوگ ہوتے ہیں جن کا ایک انسان تقریباً عادی ہو جاتا ہے مثلاً بیوی کے والد، بھائی، ماں، خالہ، چچا، چچی، ماموں اور ممانی وغیرہ ناگہانی موت وہ رشتہ دار ہوتے ہیں جن کا کوئی علم ہی نہیں ہوتا۔ بس دفتر سے آکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ باورچی خانہ میں مرغ مسلّم پک رہا ہے۔ نعمت خانہ میں فیرینی کے پیالے چنے ہوئے ہیں۔ اور گھر کے تمام نوکر پلاؤ سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ خسر صاحب کے کوئی پھوپھی زاد بھائی جنوبی افریقہ سے تشریف لائے ہیں چنانچہ صحن میں قالین بچھے ہوئے، تخت پر گاؤ تکیہ سے لگے ہوئے حقہ پیتے اور پان چباتے ایک سندباد جہازی نظر آتے ہیں۔ جن کے سامنے بیوی صاحبہ پان پر پان اور الائچیوں پہ الائچیاں رکھتی نظر آتی ہیں۔ مجبوراً نہایت ادب سے آداب عرض کرنا پڑتا

ہے۔ جس کے جواب میں یہ فرعون مصر فرماتے ہیں۔

"سلامت رہو میاں، آؤ بیٹھو، بڑی طبیعت خوش ہوئی تمھیں دیکھ کر برخوردار من یہ عجیب طریقہ ہے تمھارے یہاں کا کہ صبح سے غائب اب آرہے ہو شام کو۔"

عرض کیا کہ "دفتر کے اوقات کچھ ایسے ہی ہیں۔"

نہایت رعونت سے فرمایا "دراصل ملازمت غلامی کا دوسرا نام ہے۔ ہمارے خاندان میں سب تجارت پیشہ ہیں۔ اب یہ ان لڑکیوں کی قسمت تھی" کہ ان کو ملازمت پیشہ بر ملے۔ اور دراصل تجارت کا کہنا ہی کیا۔ انسان بادشاہی کی حد تک ترقی کرسکتا ہے۔ جنوبی افریقہ میں تمھاری دعا سے پہلے ایک چائے اسٹال تھا میرا، اب دو ہوٹل ہیں اور خوب چل رہے ہیں۔ بھائی صاحب کو دیکھو، یعنی اپنے خسر کو لیس بیل فیتہ وغیرہ بیچتے تھے مگر اب خدا کے فضل سے محض دو دکان کا کرایہ دیتے ہیں۔ آٹھ روپیہ ماہوار تو مطلب یہ کہ تجارت کچھ اور ہی چیز ہے۔ بہر حال کیا تنخواہ ملتی ہے۔

عرض کیا "پچاسی روپے!"

نہایت حقارت سے ان بساطی کے بھائی ہوٹل والے صاحب نے فرمایا۔

"اس قدر آمدنی تو ایک تانگہ رکھ کر اور کرایہ پہ چلا کر بھی ہوسکتی ہے" اب بیوی کو جو رحم طلب نظروں سے دیکھا تو وہ گویا اپنے افریقین چچا جان

کی تائید میں تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ زہر، گھونٹ پی کر اور ران کے ساتھ مرغ پلاؤ اور فیرینی کھا کر رہ گئے

ایک تو آئے دن کی مصیبت یہ ہے کہ سوسائٹی میں ہر وقت کے طعنے ہیں، کہ سنیئے جناب آپ کے خسر تو بڑے گراں فروش ہو گئے ہیں۔ سیپ کے بٹن تمام دنیا میں چار آنے درجن مل رہے ہیں، اور وہ دیتے ہیں پانچ آنہ درجن، اب کون ان پڑھے لکھے دوستوں کو سمجھائے کہ بھائی ان کو گھما پھرا کر بساطی نہ کہو۔ ملک التجار کہو، بہرحال اس قسم کی باتوں کی تو خیر عادت پڑ جاتی ہے۔ مگر یہ بھانت بھانت کے ناگہانی رشتہ دار جو ٹپکتے رہتے ہیں ان کا آخر کیا علاج۔ اور ان سے بھی زیادہ لاعلاج وہ قسم ہے جس کو غریب الوطنی کی موت عرض کیا ہے۔ بیوی کے یہ رشتہ دار غربت میں بہت ستاتے ہیں۔ فرض کر لیجیے کہ آپ بسلسلۂ ملازمت یا بسلسلۂ شامت کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ بڑے لئے دیئے بیٹھے ہیں۔ دل مطمئن ہے کہ یہاں کسی کو خبر نہیں کہ ہم بساطی کے داماد ہیں۔ کہ یکایک ایک صاحب داڑھی چڑھائے لٹھ ہاتھ میں لیے چوروں کی سی وضع قطع تشریف لے آئیں گے اور اتنی زور سے السلام علیکم کریں گے کہ آپ اچھل پڑیں۔ اب وہ گل افشانی شروع کر دیں گے۔ کہ ارے بھائی یہاں آئے اور خبر تک نہ کی۔ ہم لاکھ غریب ہیں۔ مگر پھر بھی تم ہمارے دل و جگر ہو۔

میں تمہارے خسر صاحب کی حقیقی خالہ کا داماد ہوں۔ اس قدر قریب کے عزیز اور یہ بیگانگی اور جو یہ کہو کہ میرا پتہ نہ تھا تو میاں یہ بات میں ماننے کا نہیں، اسٹیشن پر جس تانگہ والے سے پوچھ لیتے کہ بھائی تمہارے چودھری کہاں رہتے ہیں وہ پتہ بتا دیتا" اب بتائیے کہ ان چودھری صاحب کے پردیسی داماد کا سارا وقار اس غریب الوطنی میں کس کی بغلیں جھانکتا پھرے اور جو سکہ یہاں جمانا چاہتے تھے اس کی کھوٹ معلوم ہو جانے کے بعد اپنی قیمت کیونکر قائم رکھی جائے۔

خیر یہ صورتیں تو ایسی حالت میں پیدا ہوتی ہیں کہ آدمی ضعف بصر کے ماتحت یا تو اپنے سے پست درجہ کے لوگوں سے سسرالی تعلقات پیدا کرلے یا دماغ کی خرابی کے ماتحت بلا وجہ خود اپنی اصلیت چھپا رہا ہو۔ اور وہ اس طرح بے نقاب ہوتی ہو۔ لیکن ایسی صورتیں اگر نہ بھی ہوں تو سسرالی رشتہ دار کچھ عجیب خدائی فوجدار قسم کے لوگ تو ضرور ہی ثابت ہوتے ہیں ہمدردی وہ اس لیے نہیں کر سکتے کہ اپنے نہیں ہوتے اور نکتہ چینی اس لیے اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی ایک عزیزہ کے نہایت خاص قسم کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ یعنی وہ اچھی طرح ٹھونک بجا کر اس قابل تو سمجھ لیتے ہیں کہ اپنی عزیزہ کی شوہری کے اعزاز سے ہم کو سرفراز کر دیں۔ مگر یہ اندیشہ ان کو قدم قدم پر رہتا ہے کہ ممکن ہے ان کی نظر انتخاب نے دھوکا کھایا ہو۔ بہرحال پہلے تو وہ

رسمی طور پر اپنی عزیزہ کا شوہر بنا دیتے ہیں۔ اس کے بعد عملی طور پر گویا شوہر بننے کی ٹریننگ دیتے رہتے ہیں۔ شوہر غریب، نسبت سے لیکر شادی تک اور شادی سے لے کر موت تک یہی سمجھتا رہتا ہے کہ اس نے اپنے کو صرف ایک ہستی سے وابستہ کیا ہے۔ لیکن اُس کی یہ غلط فہمی طرح طرح سے دور کی جاتی ہے اور اس کو بتایا جاتا ہے کہ نکاح تو صرف ایک سے ہوا۔ مگر نباہ اُن سب سے کرنا ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے بیوی کے رشتہ دار ہیں یا ہو سکتے ہیں یا سمجھے جا سکتے ہیں۔ یا سمجھے جانے کا کوئی بھی امکان موجود ہے۔ ان رشتہ داروں سے نباہ بھی مر کھپ کر گوارا کر لیا جائے۔ مگر ہوتا عام طور پر یہ ہے کہ نباہ اخلاقی، تمدنی، معاشرتی، اقتصادی اور معاشی ہر حیثیت سے اول تو ناممکن ہوتا ہے۔ اور اگر ممکن بنا بھی لیا جائے تو بہت گراں رہتا ہے۔ مثلاً اخلاقی حیثیت سے یوں گراں ثابت ہوتا ہے کہ ان کی ہر بداخلاقی کو سراہنا آخر کیوں کر ممکن ہے۔ تمدنی اور معاشرتی حیثیت سے یہ نباہ اس لیے گراں بیٹھتا ہے کہ اپنا تمدن اور اپنی معاشرت چھوڑ کر ان کے رنگ میں رنگ جانا اول تو ایک قسم کی زن مریدی ہے۔ دوسرے یہ بھی کوئی ضروری بات نہیں کہ وہ تمدن اور وہ معاشرت قابل قبول بھی ہو۔ فرض کر لیجیے کہ وہ لوگ پہلوان ہیں۔ اب بتائیے کہ ہم اپنی معاشرت میں ڈنٹر اور مگدر کیوں کر شامل کر سکتے ہیں۔ اقتصادی حیثیت کا پوچھنا ہی کیا جتنی تقریبیں، شادیاں۔ کن چھیدن، دودھ بڑھائی۔ سو مجھو...

کونڈے، منگنیاں اور حدیہ ہے کہ موتیں ان سسرالی رشتہ داروں میں ہوتی ہیں۔ اتنی اپنے رشتہ داروں میں کبھی نہیں ہوتیں اس لیے کہ اپنے رشتہ دار تو گنے گنائے محدود ہوتے ہیں۔ مگر ان سسرالی رشتہ داروں کا تو کوئی شمار نہیں ہوتا۔ پھر یہ کہ ہر تقریب میں بیوی کا جانا اور شوہر کا اس سلسلہ میں مقروض ہونا برحق ہوتا ہے۔ تاکہ سسرال میں بات بنی رہے۔ خواہ مہاجن بات کا بتنگڑ بنائے۔ معاشی حیثیت کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ بہت سے داماد قسم کے میتیم لوگ یا تو سسرالی پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ یا کم سے کم سسرالی بزرگوں کے مشورے سے کسی ملازمت سے مستعفی ہونے یا کسی ملازمت کی امیدواری کرنے کا فیصلہ ضرور کرتے ہیں۔ ان تمام امور کے علاوہ ایک سب سے بڑی بات یہ بھی ہوتی ہے کہ سسرالی رشتہ داروں کی بتلیغ سے اپنے رشتہ داروں سے آدمی دور ہو جاتا ہے۔ خیریت اسی کو سمجھئے کہ امن و سکون سے تعلق ختم اور وہ استوار ہوتا ہے۔ ورنہ اس سلسلہ میں فوجداری تک دیکھی اور سنی ہیں اور کیا عجب ہے کہ کبھی ان ہی فوجداریوں کی ذاتی طور پر نوبت آجائے اس لئے کہ لاکھ سمجھدار سہی مگر پھر بھی آخر شادی شدہ تو ہم ہیں ہی۔!

دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

اچھا خاصا شعر ہے۔ مگر دنیا اس حد تک کیا سے کیا ہو چکی ہے کہ اب یہ شعر بھی آثار قدیمہ کی حیثیت سے اچھا معلوم ہو سکتا ہے۔ ورنہ آج کل محو حیرت ہونے کی فرصت کسے ہے اور نہ دراصل حیرت کی کوئی بات ہے۔ ہاں جسوقت کا یہ شعر ہے۔ اس وقت حیرت ضرور ہوتی ہوگی۔ اور لوگوں کے پاس حیرت کرنے۔ تصور جاناں میں بیٹھے رہنے یا محض اونگھنے کے لیے بھی وقت کافی تھا۔ اب تو زمانہ کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اس قسم کے تفصیلی مشاغل کے لئے وقت ہی نہیں ملتا۔ ہمارے بزرگ آنکھ سے جو کچھ دیکھتے تھے اسپر پہلے تو اطمینان سے محو حیرت ہو جایا کرتے تھے۔ پھر ٹھنڈے دل سے غور

کرتے تھے۔ کہ جو کچھ دیکھا ہے وہ لب پر لائیں یا نہ لائیں اس کے بعد اپنے ہمعصروں سے مشورہ کرتے تھے کہ بھئی پیرن صاحب کیا عرض کیا جائے۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مگر سوچ رہا ہوں کہ کہوں یا نہ کہوں یعنی کہوں تو کس زبان سے اور نہ کہوں تو کیونکر۔ پیرن صاحب کے پاس بھی وقت کافی ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ جھوم کر جواب دیتے تھے کہ:۔
سبحان اللہ کیا بات فرمائی ہے۔ آپ نے اس کے متعلق ایک فارسی کی ضرب المثل یاد آگئی۔ "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ مگر جناب بندہ تو اسی کا قائل ہے کہ ؎

ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات
پر ہم سے تو کبھی نہ کہی نہ آئی بات

پیرن صاحب کے اس تفصیلی جواب پر یہ بزرگ پھر غور و فکر میں مبتلا ہو جاتا کرتے تھے اور حُقّے سے بہت دیر تک شغل فرمانے کے بعد نہایت آہستگی سے فرماتے تھے کہ "کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور بھئی پیرن صاحب بن کہے بھی رہا نہیں جاتا۔ میں تو دنیا کے یہ رنگ دیکھ کر دم بخود ہوں اپنے ہی گھر میں وہ نقشہ دیکھ رہا ہوں کہ آنکھوں کا اعتبار اُٹھ گیا ہے عینک لگا کر دیکھتا ہوں تو اور بھی آنکھیں پھوڑ لینے کو دل چاہتا ہے جو کچھ آنکھیں دکھا رہی ہیں۔ یقین جانیئے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ پیرن صاحب

فوراً از انو سپیٹ کر فرماتے تھے "ذرا ٹھہریئے گا حضور والا۔ آپ نے آمد ہی آمد میں ایک شعر کہہ دیا دیکھیئے۔ ہوں۔ ہوں۔ آنکھ جو کچھ۔ ہوں۔ لب۔ ہاں ٹھیک ہے۔ ملاحظہ فرمائیے حضور مصرعہ ہوا ہے۔ ہئے ہئے ہئے۔ سنیئے

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر آسکتا نہیں

مصرعہ سنتے ہی یہ بزرگ محترم آپے سے باہر ہو جایا کرتے تھے۔ بھئی کیا بولتا ہوا مصرعہ موزوں کیا ہے۔ کیا کہنا ہے۔ میرن صاحب اس کو کہتے ہیں حاضر دماغی، اور بھئی مصرعہ دیتا ہوں اس پر۔ تمہیں میری قسم منو کیا برابر کا مصرعہ ہوا ہے۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر آسکتا نہیں — اور بھئی

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

باتوں ہی باتوں میں دونوں بزرگوں نے شعر کہہ لیا۔ رہ گئی کام کی بات وہ حیرت میں گم ہو کر لب پر آ ہی نہ سکی۔ مگر ان بزرگوں کی حیرت کے احترام میں دنیا اپنی جگہ قائم نہ رہ سکی اور وہ کیا سے کیا ہو ہی گئی اور اس حد تک کیا سے کیا ہو گئی کہ اب ان ہی بزرگوں کے خردوں کو محوِ حیرت ہونے کے لئے ذرا سا بھی وقت نہیں ملتا۔ پہلے حیرت اور محویت کے جو ذرایع ہمارے بزرگوں کو حاصل تھے۔ اب وہی نہیں ہیں تو حیرت اور محویت کہاں سے نصیب ہوا۔ آپ ہی غور فرمایئے کہ موڈ

یا بائیسکل پر بیٹھ کر یا موٹریں اور بائیسکلیں چلنے والی سڑکوں پر چل کر کوئی کیوں کر محویت یا حیرت کے شوق کو پورا کر سکتا ہو۔ ذرا سی محویت طاری کیجیے تو فوراً حادثہ ہو جائے۔ خود کچل جائیے یا کسی کو کچل دیجیے درا صل اسی قسم کی محویت اور حیرت کے سدباب کے لیے بڑے بڑے شہروں میں ٹریفک پولیس کا انتظام سرکار کی طرف سے کیا گیا ہو۔ ہمارے بزرگوں کے وقت میں نہ یہ پابندیاں تھیں نہ یہ فراٹے بھرتی ہوئی موٹریں۔ وہ نہایت اطمینان سے بیل گاڑی پر بیٹھ کر جتنا دل چاہتا تھا محو رہتے تھے۔ جس قدر جی چاہتا تھا اپنے اوپر حیرت طاری کر لیتے تھے۔ گنگناتے تھے۔ شعر کہتے تھے۔ اونگھتے تھے اور سفر بھی طے ہوتا رہتا۔ بلکہ ان کی گاڑیوں میں جتتے ہوئے بیل تک اعلیٰ درجہ کے مفکر اور شاعر نظر آتے تھے لوگ کہتے ہیں کہ میر سا شاعر پھر نہ پیدا ہوا۔ غالب پر کوئی غالب نہ آسکا اب کون سمجھائے ان حضرات کو کہ جناب والا میر نے ریلوں اور موٹروں پر بیٹھ کر شعر نہیں کہے ہیں۔ غالب کسی دفتر میں کلرک یا کسی رسالہ کے ایڈیٹر نہیں تھے۔ وہ شاعر تھے اور محض شاعر، شاعر گھروں میں بیٹھ کر شعر کہتے تھے بیل گاڑیوں پر بیٹھ کر شعر کہتے تھے۔ راتیں اپنی تھیں۔ دن اپنے تھے وقت اپنا تھا۔ فرصتیں اپنی تھیں، گاڑی اپنی تھی، اور بیل اپنے تھے کجا وہ فرصتوں میں ڈھلے ہوئے اشعار کجا یہ شعر کہ بائیسکل پر بیٹھے گھڑی

دیکھتے دفتر کی طرف جا رہے ہیں۔ نظریں ہیں ٹریفک پولیس کے اشاروں پر کان لگے ہیں موٹروں کے ہارن پر، دل دھڑک رہا ہو اس خیال سے کہ کسی موٹر کی جھپیٹ میں نہ آجائیں یا بائیسکل کی لپیٹ میں کوئی راہگیر آجائے۔ اور زبان کی نوک پر مصرعہ طرح بھی موجود ہو، شام کے مشاعرے کا، دفتر میں پہونچے تو سامنے فائیلوں کے ڈھیر اردگرد اہل غرض حضرات کا ہجوم اور سب کا الگ الگ مقصد، مصرعے دل و دماغ میں آنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ منظر دیکھ کر بھڑک جاتے ہیں۔ بمشکل تمام جو مصرعے پھنس گئے اُن کو بلاٹنگ پیپر پر لکھ لیا۔ دن بھر اسی طرح مصرعے پھانسے، شام کو سب مصرعے جمع کر کے دو سے تقسیم کر دیئے۔ حاصل تقسیم ہوئی اشعار کی تعداد اور یہی اشعار جاکر مشاعرے میں سُنا دیئے۔ اب بتائیے کہ یہ اشعار کیونکر میر اور غالب کا جواب ہو سکتے ہیں۔ میر اور غالب کو ان ہی حالات میں مبتلا کر کے کچھ کہلوائیے تو پتہ چلے کہ وہ خود بھی اپنے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ یا نہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہو کہ ہر زمانہ اپنی ضروریات کو خود سمجھتا ہو۔ اور خود ساختہ لاتا ہو۔ فرصتیں تھیں تو طلسم ہوشربا لکھنے اور پڑھنے کا ذوق لایا فرصتیں محدود دیکھیں تو یہ ذوق ناول میں محدود ہو گیا فرصت اور محدود ہوئی تو ناول افسانہ بن گئی۔ فرصت اور ہوئی تو افسانہ بھی مختصر ہو گیا اسی طرح شاعری نے زمانے کے ساتھ چولے بدلے

فرصتیں مثنویاں کہلواتی تھیں۔ مصروفیتیں غزلیں کہلوانے لگیں۔
مصروفیت اور بڑھی تو غزلیں بھی ختم آزاد شاعری سہی۔ جس وقت جتنی
فرصت ملے اتنا بڑا مصرعہ کہہ لیجیے یہ نہیں کہ سب مصرعے برابر کے ہوں
بعد میں سب کو یکجا کر لیجیے۔ ایک نظم ہو جائے گی۔ مثلاً آپ کو پانچ منٹ کی
فرصت ہو تو آپ پانچ منٹ والا مصرعہ کہہ لیجیے۔

ع ہائے آغاز محبت کی وہ پہلی دھڑکن

پھر کسی وقت ایک منٹ کی فرصت ملی تو ایک منٹ والا مصرع کہہ لیا۔

ع جو ترے سینہ میں تھی۔

اسی طرح کبھی تین منٹ کی فرصت ملی۔ کبھی ڈھائی منٹ کی اور کبھی
پونے چار منٹ کی، اسی مناسبت سے مصرعے ہوتے چلے گئے اور آخر میں
جا کر اچھی خاصی نظم کچھ اس طرح کی تیار ہو گئی ؎

ہائے آغازِ محبت کی وہ پہلی دھڑکن
جو ترے سینہ میں تھی
وہ دھڑکتا ہوا دل
کچھ مچلتے ہوئے ارمان بھی تھے مہر بلب
یعنی خموش
اور آنکھوں کے دریچوں میں وہ جب بیٹھتی تھی۔

سیر کرنے کے لئے

گنبدِ عرش پہ بھتے چاند ستارے لرزاں

خطِ سرطاں کی قسم

میں نے دیکھا ہے کہ خود کانپ رہی تھی تو بھی

ہائے آغازِ محبت کی وہ پہلی دھڑکن

اس نظم سے یہ بات ہر ایک کو معلوم ہو جائے گی کہ شاعری کوئی بیکار آدمی نہیں ہے۔ اس کو شاعری کے علاوہ دنیا میں اور کام بھی ہیں اور اس کے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ ہر مصرعہ کے لئے برابر کا وقت مہیا کرتا پھرے۔ مطلب ہے کہ نظم سے وہ مختلف قسم کے مصرعوں سے بھی مرتب ہو سکتی ہے۔ فی الحال اس قسم کی نظمیں کہنے کے لئے وقت مل رہا ہے۔ لیکن جب اتنا بھی وقت نہ ملے گا تو آج کل جو عنوان ہوا کرتا ہے وہی نظم کا درجہ حاصل کرے گا۔ مشاعرے میں اعلان ہو گا کہ اب شوکت تھانوی صاحب سے اُن کی نظم سنیئے، شوکت تھانوی صاحب وائس پر آ کر فرمائیں گے۔ عرض کیا ہے۔ "اے بہار" مشاعرہ تالیوں کی گونج سے اُڑ جائے گا۔ اور شوکت صاحب سلام کرتے ہوئے اپنی جگہ پر آ جایا کریں گے۔

بہر حال آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ آپ دیکھ لیجیے کہ اب لب پر بھی آ رہا ہے رہ گیا محوِ حیرت ہونا وہ اس لئے بیکار ہے کہ حیرت عادت بن کر رہ جائے تو

حیرت ہے کہ اس پر حیرت کی جائے۔ دنیا کے کیا سے کیا ہونے کا جہاں تک سوال ہے وہ اپنی مصروفیت سے باز نہیں آسکتی۔ ہمیشہ اس نے یہی کیا ہے۔ آئندہ بھی اُس کا یہی پروگرام ہے۔ پھر بڑی بوڑھیوں کی طرح ٹھنڈی سانس لے کر ہم یہ شعر کیوں پڑھیں۔ اور سوال تو یہ ہے کہ اس نئی شاعری کے زمانہ میں یہ پرانا شعر پڑھنا ہے بھی تو بے وقت کی راگنی سوائے اس کے کہ آپ پڑھیں اور سننے والے ہنسیں، آپ اس ہنسی پر حیرت زدہ ہوں اور وہ آپ کی حیرت کا تماشہ دیکھیں اور تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، کا سوال دراصل درپردہ شکایت ہے اس بات کی کہ آنکھ جو کچھ دیکھا کرتی تھی وہ نہیں دیکھ رہی ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جو کچھ ہمارے بزرگ دیکھا کرتے تھے۔ وہ اب ہم کو نظر نہیں آ رہا ہے۔ اور جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ ہمارے بچے شاید ہی دیکھ سکیں۔ مثلاً ہماری آنکھ آج کل چشمہ دیکھ رہی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے یہ چیز بہت کم دیکھی تھی اور ہمارے بچے شاید اس بات پر تعجب کریں کہ پہلے اس قسم کے انسان پیدا ہوتے تھے جن کی آنکھوں پر چشمہ نہیں ہوتا تھا۔ صرف آنکھیں ہوا کرتی تھیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی آنکھوں کے علاوہ دوسروں کی آنکھوں پر اس کثرت سے چشمے نظر آنے لگے ہیں کہ واقعی حیرت ہوتی ہے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا

کہ کسی کی آنکھ پر یہ چشمہ دیکھ کر لوگ اس سے عیادت کیا کرتے تھے۔ آنکھوں کا حال پوچھتے تھے ایک آدھ آزمودہ سُرمے کا نسخہ بتا دیتے تھے اور پھر گھبرا کر سب سے کہتے تھے کہ خدا رحم کرے قسمت کا لکھا پورا ہو رہا ہے۔ بیچارے کے چشمہ تک لگ گیا ہے۔ مگر اب تو صرف دو ہی قسم کے چشمہ نہیں لگاتے ایک تو اندھے دوسرے وہ بے فکرے جن کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں ہوتا۔ ورنہ وہ چشمہ جو ضعیفی کی علامت سمجھی جاتی تھی آج کل چھٹانک بھر کے لڑکے لگائے پھرتے ہیں یعنی ہوش بعد میں سنبھالتے ہیں اور چشمہ پہلے ہی لگا لیتے ہیں۔ مرد تو مرد بیچاری عورتیں بھی اس مصیبت میں مبتلا ہیں۔ پہلے استانیاں اور مغلانیاں دو قسم کی خواتین چشمہ آلود نظر آتی تھیں۔ مگر اب تو حال ہے کہ ع

مردانے سے زیادہ زنانے میں دھوم ہے

بچے کھچے بڑے بوڑھے تعجب سے ان چشموں کو دیکھتے ہیں اور اپنی آنکھوں کا حال نہایت فخر سے بیان کرتے ہیں کہ میں روپیہ کا پانچ سیر گھی کھاتے تھے۔ جو براہ راست نور بن کر آنکھوں میں پہنچ جایا کرتا تھا۔ گویا آنکھیں گھی سے روشن ہونے والے چراغ ہیں۔ اور چونکہ آج کل خالص گھی مشکل سے ملتا ہے۔ لہذا خالص بینائی بھی نہیں ملتی۔ اور عام طور پر بناسپتی آنکھیں لگائے پھرتے ہیں۔ اس گھی والی وجہ کے علاوہ چشمے کے رواج کے متعلق ہر بڑی بوڑھی اور ہر بڑے میاں کی رائے الگ بھی ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی کہتا

کہ یہ سب بجلی کی روشنی کے اندھے ہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ انگریزی کتابیں آنکھیں پھوڑ دیتی ہیں۔ کسی کا فیصلہ ہے کہ سینما نے سب کو اندھا کر رکھا ہے۔ ایک جل ککڑی بڑی بی یہ کہا کرتی ہیں کہ یہ فیشن ہے۔ مگر ایک بزرگ جو چشمہ والوں پر اعتراضات کے سلسلہ میں کچھ ریسرچ بھی کر چکے ہیں مختلف حیثیتوں سے چشمہ کے اس عام رواج پر روشنی ڈالا کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا خیال یہ ہے کہ لوگوں نے آنکھوں کی ورزش چھوڑ دی ہے جس کی وجہ سے بینائی کمزور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ان سے پوچھا کہ جناب والا یہ آنکھوں کی ورزش کیا چیز ہے تو فرمایا کہ ہمارے زمانے میں بینائی کو قوت پہنچانے کے لئے مختلف قسم کی ورزشیں کی جاتی تھیں۔ مثلاً پتنگ بازی۔

پتنگ بازی میں صرف اڑانے والا ہی اپنی نظر کی ورزشیں نہیں کرتا۔ بلکہ تمام وہ لوگ جو پیچ دیکھتے ہیں اور کنکووں کے کاٹ پیچ پر نظر رکھتے ہیں۔ یہ ورزش کر لیا کرتے ہیں۔ اس ورزش کا دوسرا طریقہ تھا کبوتر بازی، کبوتروں کو اڑا کر انتہائی بلندی پر گھنٹوں ان کا تعاقب کرنے والی نظر کبھی کمزور نہ ہو سکتی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ خود انھوں نے چشمہ تو درکنار کتاب پڑھنے کے لئے چراغ تک کی ضرورت چاندنی راتوں میں کبھی محسوس نہ کی۔ البتہ سرمے سے اپنی نظر ضرور نجایا کرتے تھے۔ مگر اب جہاں بڑھاپے کی دوسری کمزوریاں ہیں ان ہی میں نظر کی کمزوری بھی ہے۔ رعشہ کے لئے کہاں سے

چشمہ لائیں۔ دمہ کے لیئے کون سی عینک استعمال کریں۔ ان کا قول تو یہ ہے کہ جب کسی اور کمزوری کے لیے چشمہ نہیں ہے تو محض آنکھوں کی شہ زوری لے کر کیا کریں گے۔

چشموں کے اس طوفان کی اور وجہیں تو خیر ہیں ہی، مگر ایک وجہ ہماری سمجھ میں اور بھی آتی ہے کہ ہمارے بزرگوں کے زمانے میں عینک کو لباس یا زیور کا درجہ حاصل نہ تھا۔ اور اب تو اس صنعت میں ایسے تکلف برتے جاتے ہیں اور ایسے ایسے نظر فریب چشمے بننے لگے ہیں کہ خواہ مخواہ آنکھیں پھوڑ کر عینک لگا لینے کو دل چاہتا ہے۔ کوئی ناک پکڑنے والی عینک ہے۔ تو کوئی کان پکڑنے والی عینک ہے۔ کسی کا شیشہ گول ہے، کسی کا بیضاوی، کسی کا نیم گول اور نیم بیضاوی، کسی کی سونے کی کمانی ہے کسی میں محض شیشے کی تراش کا کمال ہے۔ کوئی ایک آنکھ کی ہے اور کوئی دونوں آنکھوں کی، پھر یہ کہ ان چشموں کو لگا کر چہرے میں عجیب عجیب تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ کوئی چشمہ لگا کر حسن بڑھاتا ہے۔ کسی عینک سے چہرہ پر رعب برسنے لگتا ہے کسی چشمے میں یہ صفت ہے کہ چھوٹی آنکھ دیکھنے والے کو بڑی نظر آتی ہے۔ اور کسی چشمے کے بدولت ترچھی نظر بیا ایک آدھ زاویہ سے سیدھی نظر آنے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک عام خصوصیت ہر چشمہ کی یہ ہے کہ چشمہ لگانے والا خواہ مخواہ مہذب، تعلیم یافتہ

معزز اور کچھ بڑا آدمی نظر آنے لگتا ہے۔ ان تمام خصوصیات کا نتیجہ یہ ہے کہ نمبری چشموں کے علاوہ صفر نمبر کے تالوں کی بھی بازار میں کافی مانگ بڑھ گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ کس کا دل نہیں چاہتا کہ وہ عالم و فاضل مہذب اور معزز، تعلیم یافتہ اور بڑا آدمی نظر آئے مختصر یہ کہ پہلے چشمہ دوا کے طور پر استعمال ہوا کرتا تھا اور اب اس کو لباس یا زیور کی حیثیت حاصل ہے گویا عورتوں کو ایک اور صفت کا زیور ہاتھ آیا۔ اور مرد جو زیور پہن ہی نہیں سکتے تھے اپنی محرومی کی تلافی چشمے سے کر سکتے ہیں اور کسی قسم کا چشمہ نہ سہی دھوپ ہی کا چشمہ سہی۔

ہاں صاحب خوب یاد آیا۔ یہ دھوپ کا بھی عجیب حاجت روا چیز ہے۔ اس کا رواج ہمارے ہی زمانہ کی بات ہے اور اب تو اس کثرت سے دھوپ کے چشمے نظر آنے لگے ہیں کہ شاید آنکھوں سے زیادہ ہی ان کی تعداد ہو گی۔ اس چشمے کو دھوپ کا چشمہ کہا جاتا ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ اب سے پہلے کیوں نہ تھا۔ اس لیے کہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دھوپ ہمیشہ نکلا کرتی تھی اور دھوپ کی عمر آفتاب کی عمر کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے مگر دھوپ کے چشمے اب سے پہلے کبھی استعمال نہ ہوئے۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد آخر اسی نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ دھوپ بھی چشمہ لگانے کا دراصل ایک بہانہ ہے۔ دھوپ نہ ہوتی تو چشمہ لگانے کا دراصل ایک بہانہ

ہو۔ دھوپ نہ ہوتی تو چشمہ لگانے والے سایہ کا چشمہ ایجاد کر لیتے۔ مگر ایک بات ہو کہ چشمے کی یہ قسم ہو بہت مفید، اس سے بہت سے مقصد پورے ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک تو یہ کہ یہ چشمہ ہو۔ دوسرے یہ چھتری کا کام بھی دیتا ہو۔ پھر یہ کہ یہ ایسا چشم پوش ہو کہ آنکھ کا کوئی عیب کسی پہ ظاہر نہیں ہوتا۔ آنکھ کسی وضع کی ہو۔ بلکہ اگر نہ بھی ہو تو بھی اس چشمہ کی بدولت کسی کو پتہ نہیں چل سکتا کہ واقعہ دراصل ہو کیا، لاکھوں فائدوں میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہو کہ بہت سے نظر باز محض آنکھوں کو دیکھ کر دل کا راز بھانپ لیا کرتے ہیں۔ لیکن جن کو اپنے راز عزیز ہیں وہ یہ چشمہ لگا کر اپنی آنکھوں کی غمازی کا موقع ہی نہیں دیتے کہ کوئی دوسرا دل کی بات ٹٹول سکے۔ مختصر یہ کہ یہ چشمہ صرف چشمے اور چھتری ہی کا کام نہیں دیتا بلکہ آنکھوں کے لئے خس کی ٹٹی، شملہ اور مسوری بھی ثابت ہوتا ہو پھر یہ کہ اس چشمہ سے عام چشموں کے مقابلہ میں رعب بھی کچھ زیادہ رہتا ہو۔ اور اپنے ہم چشموں میں اگر انسان کو کبھی خفت بھی اٹھانا پڑتی ہو تو چشمہ بھرم قائم رکھتا ہو اور نگہ انفعال کا پتہ نہیں چلتا۔

اس میں شک نہیں کہ چشمہ محض دل کی ایک امنگ ہی نہیں بلکہ آنکھوں کی طلب بھی ہو اسی زمانہ میں جبکہ صفر بمبر کے جگمگاتے اور چھپاتے

حسن افروز چشمے استعمال ہو رہے ہیں۔ موٹے موٹے نالوں کے نہایت ہیبت ناک چشمے بھی نظر آتے ہیں کہ اگر ان کو نہ لگایا جائے تو کسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلا جائے یا لاٹھی کے سہارے راستہ طے کیا جائے مگر ایک خیال یہ بھی ہے کہ چشمے کا رواج جس قدر بڑھ رہا ہے اسی قدر بینائی اپنشن لیتی چلی جا رہی ہے۔ پہلے بینائی کے کمزوری کے مریض اس کثرت سے نہ تھے۔ یعنی یہ مرض موجود تو ضرور تھا مگر وبا کی شکل اختیار نہ کی تھی لیکن چشمے کا اثر رفتہ رفتہ نظروں سے ہوتا ہوا نسلوں تک جا پہنچا ہے اور اب تو پیدائشی طور پر بچے کچھ نابینا سے پیدا ہونے لگے ہیں۔ آخر ان پر کیوں نہ اثر ہو، دادا جان کا انتقال عینک لگائے ہوتا ہے۔ والد محترم ماں کا دودھ چھوڑنے کے بعد عینک لگائے ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ خاندان بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ بچپن میں تو پتہ نہیں چلتا کہ بچہ نظر نزدیک کی خراب ہے یا دور کی یا دونوں کی۔ لڑکپن میں دردِ سر کی شکایت شروع ہو جاتی ہے یا سب کے چشمے دیکھ دیکھ اس کی نظر پھر انے لگتی ہے اور وہ یہ سوچتا ہے کہ آخر وہ اس حق سے کیوں محروم ہے۔ پھر وہ ایک خوبصورت سی بازار میں دیکھتا یا دھوپ کا چشمہ خرید لیتا ہے۔ یہاں تک کہ سر کا درد یا جماعت کا بلیک بورڈ یا دھوپ کا چشمہ اس کے بھی چشمہ لگوا ہی دیتا ہے۔

ماہرین امراض چشم کا تو خیر یہ خیال نہیں ہے لیکن معترضین ذوق چشمہ کی رائے یہ ضرور ہے کہ اسی طرح رفتہ رفتہ بینائی اور پھر چند صدیوں میں آنکھ غائب ہو جائے گی اور انسان کی آنکھ کی جگہ پر چشمہ ہوا کرے گا جو قدرتی طور پر عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہے گا گویا عینک لباس اور زیور کی حد سے ترقی کر کے عضو بن جائے گی مگر انسان کی ترقیوں سے بھی خدا بچائے وہ اُس وقت عینک پر لگانے والی آنکھیں ایجاد کرے گا۔ معاف کیجیے گا یہ تو ہم وہ باتیں بیان کرنے لگے جن کو آنکھ فی الحال نہیں دیکھ رہی ہے مگر سوال یہ ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھ رہی اس کو چشم خود دیکھیں یا چشمہ خود۔ دوسرا قانونی نکتہ یہ ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ تو ہے چشمہ۔ اب چشمہ کیا کچھ دیکھ رہا ہے یہ ہمارا موضوع بحث نہیں۔ لہذا با بخیر شما بسلامت۔ چشم ما کور، چشم ما روشن۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ دوسروں کو دکھانے کی کوشش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ چاہے کہ اس کا چشمہ دوسرے کی آنکھ پر بھی لگ جائے حالانکہ قدرتی طور پر یہ ناممکن ہے۔ نظر اپنی اپنی چشمہ اپنا اپنا پھر سوال یہ ہے کہ منظر بھی اپنا اپنا کیوں نہ ہو۔ اور کیا یہ مصیبت ہے کہ آپ جو کچھ اپنی آنکھ سے دیکھیں وہی دوسروں کو بھی دکھانا چاہیں۔ صرف چاہیں نہیں

بلکہ اس عجیب بات پر اس حد تک مصر ہوں کہ کوئی اگر آپ کے نقطۂ نظر سے متفق نہ ہو تو آپ اس سے لڑ جائیں۔ دشمنی مول لے لیں اور اس کے خون کے پیاسے ہو جائیں۔ اگر غور کیجئے اور ہماری آنکھوں سے نہیں بلکہ آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کیجئے تو دنیا کے تمام ہنگامے خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، سماجی ہوں یا ازدواجی، گھریلو ہوں۔ یا بازاری سب اسی زبردستی کے ماتحت ظہور میں آئے ہیں کہ دوسرے کی آنکھ پھوڑ کر اپنی آنکھ سے اس کو کچھ نہ کچھ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ کبھی نہیں سمجھا گیا کہ جس طرح ہم کچھ دیکھ رہے ہیں دوسرا بھی کچھ دیکھ رہا ہوگا۔ اگر انسان فطرتاً اپنی آنکھ سے دوسروں کو سمجھانے کا شوقین نہ ہوتا اور اپنی عینک ہر آنکھ پر لگاتا نہ پھرتا تو دنیا میں کبھی کوئی ہنگامہ سر اٹھا سکتا تھا۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ بغیر ان ہنگاموں کے دنیا بے معنی ہو جاتی ہے لہذا ان ہنگاموں کو ظہور میں لانے کے لیے بہت سے سامان کیے گئے۔ مثلاً آنکھوں کے ساتھ ہی ساتھ ایک ایک دل اور دماغ بھی ہر ایک کو دیا گیا تاکہ صرف دیکھو نہیں بلکہ سمجھو اور محسوس بھی کرو خیر یہاں تک ہی غنیمت تھا مگر ایک قباحت اور بھی ہر ایک کے حصہ میں آئی جس کو زبان کہتے ہیں تاکہ جو کچھ دیکھو۔ جو کچھ محسوس کرو اور سمجھو وہ سب اس زبان سے کہہ بھی دو۔ اگر آنکھ دیکھتی اور نہ کہہ سکتی تو بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ مگر لطف تو یہ ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ

زبان پر بھی آجاتا ہو اور زبان پر اس لیے آتا ہے کہ دوسرے کے کانوں میں کانوں میں ہوتا ہوا دل اور دماغ سے گذر کر آنکھوں تک پہنچ جائے اور اگر نہ پہونچے تو بس یہیں سے فوجداری شروع۔

دنیا نے ہر قسم کی ترقی کی۔ جملہ اقسام کی بیداریاں پیدا ہوئیں طرح طرح کے انقلاب آئے۔ آزادی کا احساس اِس حد تک جاگا کہ عورتوں کی آزادی مردوں کی آزادی یہاں تک کہ ادب و شاعری تک کی آزادی انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھی۔ مگر نظروں کی آزادی کا کوسوں پتہ نہیں ہو اور نہ اس آزادی کا کسی کو ہوش ہو۔ لیڈر اب بھی یہ چاہتا ہو کہ اس کے پیرو اس کی آنکھ سے دیکھیں۔ باپ اب بھی مصر ہو کہ بیٹا وہی دیکھے جو جو والد صاحب کو نظر آرہا ہو۔ ساس اور بہو کے تمام اختلافات کی جڑ یہی ہو کہ دونوں کا نقطۂ نظر ایک نہیں ہوتا۔ میرا خیال تو یہ ہو کہ ساس اور بہو دونوں میں سے ایک اندھی ہو تو شاید لازمی قسم کی لڑائی ختم ہو جائے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہو کہ وہی شادی کامیاب سمجھی جاتی ہو جس میں دُلہن یا دولھا دونوں میں سے ایک نابینا ہو۔ نابینا سے مراد یہ نہیں کہ آنکھیں ہی نہ ہوں یا آنکھیں تو ہوں مگر دیکھتی نہ ہوں، جی نہیں مطلب مطلب یہ ہو کہ ان دونوں میں سے ایک اپنی آنکھوں کے جملہ حقوق سے دست بردار ہو جائے۔ مثلاً بیوی اپنی آنکھوں کے حق سے دست بردار ہو گئی

اور اس نے میاں کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھنے کا کام شروع کیا اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی آنکھوں سے صرف میاں کو دیکھے گی اور میاں کی آنکھیں ساری دنیا کو گویا وہ بھی ساری دنیا کو دیکھ سکے گی مگر معرفت اپنی شوہر کے۔ شوہر کا ہر پسندیدہ منظر بیوی کا بھی پسندیدہ منظر ہوگا۔ شوہر کی ہر نگاہ تنفر بیوی کی بھی نگاہِ تنفر ہوگی۔ گویا آنکھیں تو بظاہر چار ہوں مگر انہیں سے دو آنکھوں کا اور دو چشم خانوں کا کام دیں گی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ دو دل بھی ایک رہیں گے، اور بیوی محض آنکھوں کی نعمت سے محروم ہو کر اپنی ازدواجی زندگی کو اپنے لیے نعمت بنالے گی یا اگر صورتِ حال اسکے برعکس ہوئی یعنی شوہر صاحب نے اپنی آنکھوں کو بیوی کی آنکھوں کے ہاتھ بیچ دیا تو ان کا گھر ان کی جنت ہی بن جائے گا۔ لیکن ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ میاں اور بیوی دونوں کے اتفاق سے آنکھیں ہیں اور دونوں اپنی بینائی کے حق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ ان دونوں کی کبھی بنتھ نہیں سکتی۔ شوہر اپنی آنکھ سے بیوی کو دکھائے گا کہ میرے تمام عزیز تمھارے تمام عزیزوں سے بہتر ہیں۔ بیوی اپنی آنکھوں سے اس کے تمام عزیزوں کے عیب دیکھ کر اپنی آنکھ سے اپنے تمام عزیزوں کے ہنر اس کو دکھانا چاہے گی۔ وہ کہے گا کہ تم مجھ کو اندھا

بتاتی ہو۔ وہ کہے گی کہ تم مجھ کو اندھا بتاتے ہو۔ یہی تُو تُو میں میں یا تو طلاق کی حد پہونچ جائے گی ورنہ دونوں کی زندگی تلخ بن جائیگی کاش ان دونوں میں سے کوئی اندھا ہوتا سو باتوں کی ایک بات تو یہ ہو کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ دوسرے کو دکھانے کی کوشش کرتی ہو یہ تو انسان کا مقدر بن چکی ہو لہذا شادی کے وقت بجائے یہ تحقیقات کرنے کے کہ لڑکا کیا لکھا پڑھا ہو۔ لڑکی کی صورت شکل کیسی ہو لڑکا کتنے کا نوکر ہو۔ لڑکی کے نام کچھ جائداد ہو یا نہیں۔ لڑکا کس خاندان سے ہے۔ لڑکی سگھڑ ہے یا نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ لڑکا اندھا ہو یا نہیں اور لڑکی میں کہیں بینائی کا مرض تو نہیں۔ اگر ان دونوں میں سے ایک بھی اندھا ہو تو بس آنکھیں بند کرکے شادی کر دینا چاہیے اور اگر دونوں کے آنکھیں ہوں تو یہ بات گرہ میں باندھ لیجیئے کہ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا تو ممکن ہو لیکن اس قسم کی شادی کا خوشگوار ہونا قطعاً نا ممکن ہو۔

خیر شادی بیاہ کے معاملات میں تو اس قسم کی جانچ پڑتال سے کام چل سکتا ہو مگر اس کے علاوہ دوسرے تعلقات کو ان آنکھوں کی موجودگی میں کیونکر خوشگوار بنایا جا سکتا ہو۔ ایک باپ کو آخر یہ کیوں خواہش پیدا ہوتی ہو کہ چونکہ وہ ہر چیز کو اچھی نظر سے دیکھتا لہذا اس کا بیٹا بھی

اس کو اچھی نظر سے نہ دیکھے حالانکہ بیٹا اپنی آنکھ سے برج کو اچھی سوسائٹی کی تفریح دیکھتا ہے۔ مہذب لوگوں کو برج کھیلتا ہوا اس نے دیکھا ہے اور وہ جانتا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کھیل کو اچھی طرح سے دیکھا جاتا ہے۔ اب یا تو وہ اپنی آنکھیں پھوڑ لے یا والد صاحب کو خوش کرنے کے لیے جھوٹ بولے اور چوری چوری برج کھیلے ورنہ والد صاحب برابر یہی کہے جائیں گے کہ لڑکا نالائق نکل گیا۔ برج کھیلتا ہے یعنی قمار باز ہے۔ حالانکہ وہ غریب نالائق ہے نہ قمار باز ہے بلکہ قصور اس کا صرف یہ ہے کہ اس کو بھی خدا نے اپنے باپ کی آنکھوں کے علاوہ ذاتی آنکھیں بھی دی ہیں۔ ہونا دراصل یہ چاہیے تھا کہ باپ کی زندگی میں لڑکے نابینا ہوا کرتے اور باپ کے مرنے کے بعد تمام مال و متاع کے ساتھ ہی ساتھ آنکھیں بھی لوگوں کو ورثہ میں ملا کرتیں یا یہ ہوتا کہ لڑکا پیدا ہونے کے بعد باپ اندھا ہو جایا کرتا مگر ان دونوں میں سے ایک بات بھی نہ ہو سکی لہٰذا یہ ہو رہا ہے کہ باپ چاہتا ہے کہ میری نظر سے لڑکا دنیا کو دیکھے اور لڑکا یہ سمجھتا ہے کہ والد صاحب کی نظریں ہیں پرانی وہ میری نظروں سے دنیا کو دیکھیں تو زیادہ اچھا ہے۔ اسی اختلاف کا نتیجہ یہ لڑکے کے عاق ہوتے رہتے ہیں، گھروں سے نکال دیئے جاتے ہیں۔ باپ صورت تک دیکھنے کا

روا دار نہیں رہتا۔ ورنہ لڑکے نے بہت سعادت مندی سے کام لیا تو والد بزرگوار کی آنکھوں میں دھول جھونکنا شروع کر دیا اور چھپ چھپ کے وہ سب کچھ کرنے لگا جو اُس کی آنکھیں اچھّا دیکھتی ہیں اور اس کے والد کی آنکھیں بُرا۔

یہ تو خیر معمولی گھریلو باتیں ہیں، مگر آپ موجودہ زمانے یا کسی تاریخی زمانے کے کسی بڑے سے بڑے جھگڑے کو دیکھ لیجئے۔ بنیاد آپ کو یہ ہمیشہ نظر آئے گی کہ اپنی آنکھوں کا منظر دوسرے کی آنکھوں میں ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ تاریخی معرکہ ہوا۔ مذہبی لڑائیاں اسی لئے لڑی گئیں، سیاسی سر پھٹّول ہمیشہ اسی کی بدولت ہوئی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہر قسم کی جنگ کی ابتدا اسی وجہ سے ہوئی کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ دوسرے کو ضرور دکھایا جائے۔ اور یہ بھی کیا جائے کہ دوسرے کی آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ نہ دیکھے اور اُس کے بجائے وہ بھی وہی دیکھے جو ہماری آنکھ دیکھ رہی ہے۔ اس وقت ہمارا موضوع گفتگو بھی یہی ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ ہم دوسروں کو دکھانے کی کوشش کرکے ایک نیا فتنہ بیدار کریں مگر ہم جانتے ہیں کہ ہماری آنکھ کے علاوہ دوسروں کی آنکھیں ہیں اور ان سب آنکھوں کا کام بھی دیکھنا ہے۔ لہٰذا ہم اپنی آنکھ کو ساری دنیا کا چشمہ ثابت

کرنے کی کوشش ہی کیوں کریں۔ البتہ اس موضوع کی وجہ سے یہ پورا
شعر کچھ مشکوک سا ہو گیا ہے؎

آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں لب پر آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

ہماری رائے میں یہ شعر اصل میں یوں ہے؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر آ سکتا ہے سب
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

اب اس شعر کی شرح اس طرح ہو گی کہ ہماری آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ دوسروں کو دکھانے کے لیے سب کچھ لب پر لے آتی ہے اور ہم زبردستی کوشش کرتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے دیکھا ہے وہی سب دیکھیں اس سلسلہ میں ظاہر ہے کہ تو تو میں میں کے بعد ہاتھا پائی اور دھینگا مشتی تک کی نوبت آتی ہو گی۔ لہٰذا یا تو اس لپاڈگی میں کسی کی بھی آنکھ باقی نہ رہیگی اور دوسروں کی آنکھ پھوڑنے کی یہ عالمگیر کوشش عالمگیر کامیابی حاصل کرلے گی ورنہ سب کے نقطہ ہائے نظر اس حد تک ایک ہو جائیں گے کہ سب کی آنکھیں مل کر ایک بہت بڑی آنکھ بن جائے گی اور یہ گول گول دنیا کا کرہ آخر کار ایک عظیم دیدہ بن کر رہ جائے گا۔ بہرحال شاعر کہتا ہے کہ محوِ حیرت ہوں کہ دنیا بالکل اندھی ہو جائے گی یا سراسر آنکھ بن کر رہے گی۔

گویا یہ طے ہو کہ یہ درمیانی صورت اور یہ دیکھنے دکھانے کی کشمکش تو یقیناً باقی نہیں رہ سکتی۔

خیر یہ تو شاعری ہو مگر واقعی غور کیجیئے کہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ دوسرے کو دیکھنے پر مجبور کیوں کرتے ہیں بلکہ یہ بھی غور کیجیئے کہ اس ساری پابندی کے بعد کسی قسم کی کوئی آزادی بھی صحیح معنوں میں آزادی کہی جا سکتی ہو۔ مگر نہیں ہم کو تو دراصل یہ بھی نہ کہنا چاہیئے اسلیئے کہ یہ تو ہم نے بھی وہی کوشش شروع کر دی جس کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ بہر حال ہم نے یہ دیکھا ہو مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ بھی یہی ضرور دیکھیں ممکن ہے اسی سلسلہ میں آپ کے پیش نظر کچھ اور ہی مناظر ہوں اور ہمارے اس کہنے کے بعد آپ وہ مناظر اپنی آنکھوں سے ہم کو دکھانا چاہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بات بڑھ جائے گی اور اچھے دل بڑے ہوں گے یا تو ہم آپ کی آنکھ سے کچھ دیکھنے کو تیار ہو جائیں ورنہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ لب پر ہی نہ لائیں اور ایک چپ سے ہزار بلائیں ٹالیں۔

ہماری بڑی بوڑھیاں کہانی اس طرح شروع کرتی ہیں کہ آنکھوں کی دیکھی کہتے نہیں کانوں کی سنی کہتے ہیں کہ ایک تھا بادشاہ ہمارا تمہارا

خدا بادشاہ اس بادشاہ کے تھے سات بیٹے وغیرہ وغیرہ۔ گویا کانوں کی سنی کہہ دینا اتنی ذمہ داری کی بات نہیں ہے جتنی آنکھوں کی دیکھی کہنا ہی۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ لب پر نہیں آ سکتا بلکہ اگر غور کیجیے تو عافیت بھی اسی میں ہو کہ وہ لب پر نہ آئے۔ اس میں شک نہیں کہ کانوں کی سنی لب پر لانا اس قدر آسان نہ ہونا چاہیے جسقدر آنکھوں کی دیکھی کہہ دینا۔

اگر یہ تصویر ہے ــــــ تو

میرے ایک نہایت مشہور و معروف آرٹسٹ دوست ایک دن میری جہالت کے قائل ہو کر مجھ سے سخت مایوس ہوئے۔ وہ بڑے چاؤ کے ساتھ اپنے کمالات فن دکھانے مجھے اپنے اسٹڈیو میں لے گئے اور بڑے فخر کے ساتھ اپنی ایک تصویر دکھا کر مجھ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے اس تصویر کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور سے دیکھا اور جب بخوبی اس گورکھ دھندے کو سمجھ لیا تو عرض کیا۔

"یہ آرام کرسی ہے۔"

آرام کرسی کا نام سنکر وہ ایک دم اچھل پڑے اور دیر تک مجھ کو حیرت سے دیکھتے رہے کہ میں کہہ کیا رہا ہوں اس کے بعد بغیر کوئی اور تصویر دکھائے مجھے اسٹڈیو سے باہر لے آئے اور جب میں نے ان کی اس مایوسی کو سمجھنے کی کوشش کی تو وہ برس پڑے مجھ پر کہ :۔

عجیب واہیات قسم کے جہل مرکب ہیں آپ بھی کہنے لگے آرام کرسی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ

یعنی تجریدی فن کی ابجد سے بھی آپ واقف نہیں ہیں۔ میں نے خواہ مخواہ بھینس کے آگے بین بجائی۔"

میں نے تجریدی آرٹ سے اپنی نافہمی کا اعتراف کرتے ہوئے پوچھا۔ "جس کو میں نے آرام کرسی کہا ہے وہ آخر ہے کیا۔" وہ غصہ کرنے کے بجائے میری حماقت پر کُڑھ کر بولے۔

"بھائی وہ مایوس عورت ہے۔"

مجھے اپنے اس جہل کا اعتراف ہے کہ میں تجریدی آرٹ کی ان بھول بھلیوں کو سمجھنے سے قاصر ہوں اور آج بھی "مایوس عورت" کو میں سوائے "آرام کرسی" کے اور کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ قصور میرا صرف یہ ہے کہ میں سچائی کے ساتھ اعتراف کر رہا ہوں اپنی جہالت کا ورنہ ایک سے ایک اجہل کو میں نے خود ہمہ تصاویر کی نمائش میں دیکھا ہے منہ میں پائپ دبائے چہرے کو تجریدی آرٹ بنائے اقلیدس کی کوئی بیہودہ سی شکل دینے کھڑے ہیں یہ حضرت اور داد دے رہے ہیں اس عجیب الخلقت تخلیق کی کہ مصور خود دوڑا ہوا آیا اور اس نے کہا کہ "معاف کیجئے گا یہ تصویر الٹی ٹانگ دی گئی تھی۔" اور یہ سُنکر یہ حضرت خود ہی اُلٹے ٹنگے ہوئے نظر آنے لگے۔ اس قسم کی ایک نمائش میں ایک چوکھٹے میں سادہ کینوس دیوار پر آویزاں تھی اور عنوان تھا تصویر کا "چڑیا اور دانا" لوگ اس کو دیکھتے تھے اور دیکھتے ہی رہ جاتے تھے کہ اس میں چڑیا

کہاں ہے اور دانہ کس طرف ہے۔ آخر ایک صاحب نے مصور سے پوچھا کہ "دانہ کہاں ہے" وہ بولا "چڑیا کھا گئی" اس نے پوچھا "اور وہ چڑیا کہاں ہے۔" اس نے کہا "اڑ گئی" تو جناب عرض مدعا یہ کہ اپنے بس کا روگ تو ہے نہیں اس تجریدی آرٹ کو سمجھنا اب خواہ کوئی ہم کو احمق سمجھے یا افسوسناک قسم کا جاہل مطلق۔

اس موضوع کی طرف متوجہ یوں ہونا پڑا کہ آرٹ کونسل آف پاکستان کے صدر این۔ ایم۔ خاں صاحب نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ہمارے چابک دست صناعوں اور ماہر فن مصوروں کے آرٹ کی قدردانی کرنے کے بجائے فلمی ستاروں کی تصاویر سے دلچسپی لینے والوں کی تعداد ہمارے یہاں بہت زیادہ ہے۔ اگر سچ پوچھئے تو یہ بات غلط نہیں ہے مگر اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ فلمی ستاروں کی تصاویر دیکھنے کے لئے نہ آنکھوں پر زور دینا پڑتا ہے نہ دماغ پر ایک نظر دیکھتے ہی سمجھ میں آجاتا ہے یہ مدھو بالا ہیں یہ نور جہاں ہیں یہ شیاما ہیں اور یہ نیلو ہیں اگر ان فلمی ستاروں کی تصاویر بھی تجریدی آرٹ والے بنانا شروع کر دیں تو یقین جانئے کہ ان فلمی ستاروں کی صورت سے بھی نفرت ہو کر رہ جائے کہ ایک تصویر سامنے لا کر پوچھا جائے کہ یہ کیا ہے۔!

ہم جواب دیں کہ "شہتیر ہے۔"

مصور صاحب ہنس کر کہیں کہ "غور سے دیکھئے یہ مسرت نذیر ہے۔"

پھر دوسری دکھا کر پوچھا جائے یہ کیا ہے۔

ہم بوجھیں کہ " یہ توپ ہے۔"

مصور صاحب پھر سمجھائیں۔" توپ نہیں اس کے خطوط اور دائرے غور سے دیکھئے یہ گوپ ہے۔"

رہ گئی فلمی ستاروں کی تصاویر کی مقبولیت وہ تو واقعی دبائی حیثیت رکھتی ہے اور ایک تصاویر پر کیا منحصر ہے عالم تو یہ ہے کہ اب اگر حوالے کے طور پر اشعار بھی استعمال ہوتے ہیں تو میر اور غالب، حافظ اور سعدی وغیرہ کے نہیں بلکہ فلمی گانوں کے بول استعمال ہوتے ہیں مثلاً ہمارے بزرگ اپنے احباب کو خط اس طرح لکھتے تھے۔

"اب تو دیکھنے کو بھی آنکھیں ترس گئیں ہیں کاش کبھی تم اس طرف کا رخ کرتے۔"

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

اور اب ہمارے نوجوان اپنے احباب کو یہی بات یوں لکھتے ہیں کہ

اب تو دیکھنے کو بھی آنکھیں ترس گئیں کاش کبھی تم اس طرف کا رخ کرتے۔

تو ان سی بدلی میں مرے چاند ہے آجا

تارے ہیں مرے زخم جگر ان میں سما جا

مقرر اپنی تقاریر میں فلمی گانوں کے بول استعمال کرتے ہیں کہ :۔

"حضرات! ہم کو صرف جھوٹے وعدوں پر ٹرخایا جاتا ہے

اور ہمارے ساتھ طفل تسلیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ہمارے افسران

بالا تو ہمارے ساتھ ہمیشہ اس طرح پیش آتے ہیں کہ :۔

لارے لپا لارے لپا لائی رکھدا

روزمرہ کی گفتگو ہو یا خط و کتابت، مضمون نگاری ہو یا خطابت آپ کو کیا

معلوم کہ کس کس جگہ یہ فلمی گانے استعمال ہوتے ہیں۔

فلمی گانوں پر کیا منحصر ہے حال تو یہ ہے کہ بال کٹوانے بیٹھے ہیں اور ہیر ڈریسر

سے کہہ رہے ہیں کہ بس ویسے ہی بال بنا دو جیسے دلیپ کمار کے ہیں۔ کپڑا

لے کر صاحبزادیاں درزی کے یہاں گئی ہیں اور اس سے فرمائش کر رہی ہیں

کہ اسی ڈزائن کی قمیص بنا دو جیسی شکیلہ فلم ٹیکسی ڈرائیور میں پہنے ہوئے ہے اور

بلاؤز اسی فیشن کا ہو جیسا نرگس کا تھا فلم بابل میں۔ عالم تو یہ ہے کہ پہلے

نوجوان اسیات کی کوشش کرتے تھے کہ ابّا جان یا چچا جان یا ماموں جان کا انداز

گفتگو اختیار کریں۔ مگر اب انکی کوشش یہ ہوتی ہے کہ راجکپور کی طرح بات کریں سنتوش کمار

کی چال چلیں۔ دلیپ کمار کیطرح ہنسیں، پریم ناتھ کی طرح جست لگائیں تاکہ دیکھنے والے انکو

بھی ہیرو سمجھیں اور انکو دیکھنے والیاں گنگنانا شروع کر دیں کہ :۔

ہاتھ میں ہاتھ ہو چاندنی رات ہو کیسی یہ بات ہو

تقریر ایک مکھی کی

لاہور کارپوریشن کے پچھلے سال کے اس کارنامے کی اخبارات میں دھوم مچی ہے کہ اس نے ۱۹۵۸ء میں کتّے بلیاں چوہے اور مکھیاں مارنے پر تقریباً ساڑھے تین لاکھ روپیہ صرف کیا ہے۔ اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر لاہور کارپوریشن کے حدود میں رہنے والے کتّے بے ساختہ بھونک پڑے اور علم الحیوانات کے ماہروں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ دراصل بھونک نہیں رہے ہیں بلکہ قہقہے بلند کر رہے ہیں۔ یہ خبر جب لاہور کی بلیوں نے سُنی تو وہ میاؤں میاؤں کرتی ہوئی مارے ہنسی کے لوٹ گئیں۔ چوہوں کی نظر سے جب یہ خبر گذری تو وہ اپنے بلوں سے نکل نکل کر مونچھوں پر تاؤ دے دے کر ہنسے اور مکھیوں نے تو ہنس ہنس کر وہ بھنکار پیدا کی اور یہ خبر پڑھنے کے لئے اخبارات کے صفحوں پر اس کثرت سے آکر بیٹھیں کہ سوائے ان کے اور کوئی اخبار پڑھ ہی نہ سکتا تھا معلوم ہوا ہے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کہ کتوں۔ بلیوں۔ مکھیوں اور چوہوں کو اس شدت سے ہنسی اس بات پر آئی کہ اتنا روپیہ ہم کو مارنے پر صرف کیا گیا مگر ہم بدستور موجود ہیں اور ہمارا آج بھی یہی ترانہ ہے کہ ع

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔

اعداد و شمار یہ پیش کئے گئے ہیں کہ پچھلے سال چودہ ہزار نو سو باون (۱۴۹۵۲) تو صرف کتے پکڑے گئے ہیں جن کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا۔ بلیوں کی تعداد ظاہر نہیں کی گئی اور نہ یہ بتایا گیا کہ ان بلیوں نے خودکشی کی یا ان کو پھانسی دی گئی۔ چوہوں کے متعلق کہہ دیا گیا ہے کہ وہ علی الحساب پکڑے اور مارے گئے۔ مکھیوں کا شمار اس لئے نہ ہو سکا کہ کارپوریشن کے پاس کافی عملہ نہ تھا جو مگس شماری کرتا اور صحیح اعداد پیش کر دیتا۔ بہر صورت یہ مہم اس سال بھی جاری رہے گی اور اگلی بجٹ میں اس مہم کے لئے پچھلے بجٹ سے ایک لاکھ روپیہ زیادہ رکھا گیا ہے ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ پچھلے سال کی اس کامیاب مہم کے بعد آوارہ کتوں۔ جنگلی بلیوں۔ گھریلو چوہوں اور ہرجائی مکھیوں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ تعداد بڑھی نہ ہوتی تو اس بجٹ میں یہ اضافہ کیوں ہوتا اور اگر تعداد بڑھ گئی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جب اس تعداد کو گھٹانے کی کوشش کی جاتی ہے یہ بڑھ جایا کرتی ہے ان حالات

میں کوشش یہ کرنا چاہیئے کہ کارپوریشن والے اس مہم کو ختم کردیں ورنہ آئندہ سال یہ تعداد اتنی اور بڑھ جائے گی کہ پھر بجٹ میں ایک لاکھ کا اضافہ کیا جائے اور رفتہ رفتہ کارپوریشن کا پورا بجٹ کتوں۔ بلیوں۔ چوہوں اور مکھیوں کے نذر ہو جایا کرے گا۔

بات دراصل یہ ہے کہ ایک طرف تو ان جانوروں کو مارنے کی مہم چلائی جاتی ہے۔ دوسری طرف ان ہی جانوروں کی افزائش نسل کی مہم بھی چلتی رہتی ہے کہ شہر میں ہر طرف گندگی کا بھی اہتمام رکھا جاتا ہے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر بھی رہتے ہیں نالیوں کو بھی اسی لئے صاف کرنے سے محفوظ رکھا جاتا ہے کہ آخر یہ بھی تو جاندار ہیں ان کو بھی تو زندگی کا حق ہے چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مکھیوں کے ایک جلسۂ عام میں ایک پُرجوش مقرر مکھی نے نہایت دھواں دھار تقریر کی کہ:۔

معزز مکھیو! آج ہم سب اس لئے یہاں یکجا ہوے ہیں کہ انسان کی ان چیرہ دستیوں کے خلاف پُر زور احتجاج کریں کہ اس نے ہماری نسل کو ختم کردینے کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے۔ اس نے ہم کو مارنے کے لئے محکمے قائم کر رکھے ہیں۔ ہم کو مارنے کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہا کر طرح طرح کی زہریلی دوائیں بنائی ہیں۔ وہ اشرف

المخلوقات ضرور ہے مگر اے مکھیو! اب یہ تمہارا فرض ہے کہ اس انسان کو یہ بتادو کہ خدا کی اس دنیا پر صرف اسی کا حق نہیں ہے۔ ہم بھی آخر اسی خدا کی مخلوق ہیں اور اس دنیا میں زندہ رہنے کا ہم کو بھی حق ہے۔ آخر ہم اپنے فرائض سے کیوں غافل ہیں اگر یہ انسان ہمارے لیئے فلٹ اور ڈی۔ ڈی۔ ٹی وغیرہ استعمال کر رہا ہے تو ہم اس کے خلاف ہیضہ ٹائیفائڈ اور دوسرے امراض پھیلانے کی مہم میں غفلت سے کیوں کام لے رہے ہیں۔ میں مبارکباد دیتی ہوں ان فرض شناس مکھیوں کو جن کی فرض شناسی نے سوزش امعاء جیسی بیماری پھیلائی۔

اس تقریر پر مکھیوں نے داد اور تحسین کی بھنبھناہٹ پیدا کی اور خوب خوب تالیاں بجائیں۔

اس پرجوش تقریر کے بعد ایک بزرگ مکھی اٹھی اور بھنبھناہٹ کے مقویں اسٹیج پر آکر نہایت وقار سے اس نے اپنی تقریر شروع کی کہ :-

عزیز مکھیو! مجھ سے پہلے آپ نے ایک پرجوش خطیبہ کی تقریر سنی ہے۔ میں بھی اس تقریر ــــــــ اور اس جوش پر اپنی عزیز بہن کو مبارکباد دیتی ہوں مگر ساتھ ہی ساتھ مجھ کو یہ عرض کرنے کی اجازت

دیکھئے کہ آپ نے صرف چند روزہ حالات سے متاثر ہو کر تاریخ کو بالکل بھلا دیا ہے اور نوجوانی کے جوش میں آ کر ایسی تقریر کی ہے ورنہ اگر آپ تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو اسی اشرف المخلوقات کے احسانات بھی نظر آ جائیں گے جس سے آج آپ نالاں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مارشل لا کے نفاذ کے بعد سے ہمارا قلع قمع کرنے کی جدوجہد میں سرگرمیاں دکھائی گئی ہیں ورنہ اس سے پہلے ہیں پوچھتی ہوں کہ یہ غلاظتوں کے انبار ہمارے لئے کس نے لگائے تھے۔ یہ جابجا کوڑے کے ڈھیر ہمارے لئے کس نے سجائے تھے۔ یہ نالیوں اور نالیوں کا پانی ہمارے لئے کس نے سڑایا تھا گندگی کو محفوظ رکھنے کے لئے صفائی سے گریز کس نے کیا اسی انسان نے میری پیاری بہنوں اسی انسان نے۔ وہ ہمارے لئے جابجا گنے کھا کھا کر ان کے چھلکوں کے ڈھیر لگاتا پھرتا تھا۔ وہ خود اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو ہمارے لئے کھلا رکھتا تھا وہ اپنے گھروں کی صفائی بھی اس لئے نہ کرتا تھا کہ ہم کو تکلیف ہوگی۔ ہم اس کے باورچی خانوں میں اپنی چھاؤنی بناتے تھے۔ ہم اس کے دسترخوان پر یلغار بولتے تھے ہم اس کے کھانے کی میز پر چھاپہ مارتے تھے ہم اس کی چائے کی پیالیوں میں پیراکی کی مشق کرتے تھے۔ اس کے سالن کے پیالوں میں خودکشی

کا شوق پورا کرتے تھے۔ اس کے پینے کے دودھ میں دودھوں نہاتے تھے۔ کیا اتنی جلدی آپ یہ سب کچھ بھول گئیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ ہیضہ نہ پھیلائیں۔ ٹائیفائڈ اور چیچک۔ سوزش امعاء اور دوسرے وبائی امراض کو نہ پھیلائیں یہ سب تو آپ کے فرائض میں داخل ہے مگر ان دونوں مگس کشی پر جو زور دیا جا رہا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ انسان کے پچھلے احسانات کو بھول جائیں ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔ ہم شکوہ اور شکر کا توازن برقرار رکھتے ہیں۔"

شکر کو بعض مکھیاں شکر سمجھیں اور بیتاب ہو ہو کر اڑیں لہٰذا جلسہ درہم برہم ہو گیا ورنہ اس جلسہ کی قرار دادیں اللہ جانے کیا ہوتیں۔

لاہور کارپوریشن کے حدود میں رہنے والے کتے بلیاں چوہے اور مکھیاں دراصل اس بات پر تو ہنس ہی رہی ہیں کہ ہم کو مٹانے کی جتنی کوششیں ہو رہی ہیں اتنے ہی ہم لہلہا رہے ہیں مگر ان کو اس بات پر بھی رہ رہ کر ہنسی آتی رہی کہ جتنا روپیہ ہم کو مارنے پر صرف ہو رہا ہے اگر اتنا ہی روپیہ انسان خود اپنے ہم جنسوں کو فاقہ مرگی سے نجات دلانے کے لئے دیدیتا یا ان کے پھٹے حال کی اصلاح پر صرف کرتا تو ایک بات بھی تھی۔ رہ گیا ہم کو مارنا تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم ان تدابیر

سے اس وقت تک نہ مر سکیں گے جب تک خود انسان کو رسوں فلٹ اور ڈی ڈی ٹی پلا کر اندرونی طور پر نفاست پسند نہ بنا دیا جائے یا انسان غیر ارادی طور پر نگس پرور واقع ہوا ہے اور نمائشی طور پر اس سے مکھیاں مارنے کا کام لیا جاتا ہے لہٰذا ہم مرنے کو تو مر جاتے ہیں مگر اس سے زیادہ پیدا بھی ہو جاتے ہیں۔ اور ہماری نمائندگی کم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھ رہی ہے سچ تو یہ ہے کہ جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ۔ ع

مری تخریب میں مضمر ہے اک تعمیر کی صورت

خدا کی شان دیکھو

تعمیری دور کا مطلب ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ جدھر دیکھئے دھڑا دھڑ مکانات بن رہے تھے ایک سے ایک نئے ڈیزائن کی کوٹھیاں تعمیر ہو رہی تھیں۔ تعمیرات کا ایسا جال پھیلا ہوا تھا۔ کہ دیکھتے ہی دیکھتے کراچی کے نہ جانے کتنے سپاٹ میدان کوٹھیوں ایوانوں اور محلوں سے پٹے ہوئے نظر آنے لگے۔ ہر ایرے غیرے کو تو عمارتی سامان تک میسر نہ آتا تھا سیمنٹ لوہا اور لکڑی صرف ان لوگوں کو حاصل ہو سکتی تھی جو یا تو ان چیزوں کے وزن کے برابر روپیہ تول دیں یا اپنے اختیارات سے کام لے کر ڈنڈے کے زور پر یہ چیزیں حاصل کر سکیں ورنہ جو لوگ نہ کوئی مالی حیثیت رکھتے تھے نہ اثر اور اقتدار ان کو حاصل تھا وہ تو گھر بنانے کے لئے نیو کھود کر اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ غالباً اپنی قبر کھود والی ہے جس میں اپنی بے زری اور بے دست و پائی کے ساتھ دفن ہونے کا ارادہ ہے۔ اور جب ان سے کوئی پوچھتا تھا کہ کیوں جناب کس منزل پر ہے آپ کا زیر تعمیر مکان تو وہ یہی کہتے تھے کہ ع۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

مگر اب یہ تعمیری سلسلہ ایسا ختم ہوا ہے کہ اگر مہاجرین کے لئے مکانات کی تعمیر کا سلسلہ شروع نہ ہو جاتا تو یہ تمام راج مزدور معماری کا پیشہ چھوڑ کر اللہ جانے مونگ پھلی بیچنا شروع کر دیتے یا چاٹ کے خوانچے لگائے پھرتے اس لئے کہ ان عظیم الشان تعمیرات کا کام تو ایک دم سے ایسا ختم ہوا ہے کہ جیسے فالج گر جائے اگر کسی کوٹھی کے کسی کمرے کی چھت باقی تھی تو بجنسہ باقی ہے اگر کوئی دیوار دس فٹ اٹھ چکی تھی تو ساڑھے دس فٹ اٹھنا اس کو نصیب نہ ہو سکا اگر سیمنٹ کی کچھ بوریاں آچکی تھیں تو وہ اسی طرح پڑی ہوئی ہیں مختصر یہ کہ جہاں تعمیری سرگرمیوں کا ایک شور محشر بپا رہتا تھا وہاں اب ایسا سناٹا ہے کہ گور غریباں کو بھی اس ویرانی پر عبرت ہوتی ہے۔ اور اب وہاں عالم یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کو آواز دیتا ہے تو خود اپنی ہی آواز اسکے کانوں میں واپس آجاتی ہے۔

اس ویرانی اور سناٹے کے متعلق جب لوگوں سے پوچھا تو بمشکل تمام صرف یہ معلوم ہو سکا کہ یہ زیر تعمیر قصر اور ایوان در اصل زمین میں بوئی ہوئی دولت کے پھل تھے کہ لوگ ناجائز ذرائع سے روپیہ کماتے تھے اور اس کو چھپانے کے لئے زمینیں خرید لیتے تھے اور مکانات بنانا شروع کر دیتے تھے۔ روپیہ کی تخم ریزی

کی اور وہ مکانوں کی صورت میں اگنا شروع ہو گیا مگر اب وہ آمدنی کے ذرائع ہی ختم کر دیئے گئے جبھی ہوئی دولت ہی سب کو اگل دینا پڑی تو اب یہ کوٹھیاں کہاں سے بنیں۔ ع۔

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

ورنہ ہوتا یہ تھا کہ اس بے پناہ دولت کو جب ہضم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی تو ہاضمہ کی خرابی یہ کوٹھیاں اگلنی شروع کر دیتی تھی۔ دنیا حیران تھی کہ اتنا تعمیری کام ہو رہا ہے راج مزدوروں کو سر کھجانے کی مہلت نہیں۔ عمارتی سامان عنقا ہو چکا ہے اور اس کے باوجود اسی کراچی میں جھگیاں بدستور موجود ہیں بے خانماں عوام اب تک بے خانماں ہیں فٹ پاتھ پر سونے والے بدستور فٹ پاتھ ہی پر سوتے ہیں آخر یہ قصہ کیا ہے مگر یہ قصہ کوئی ایسا پیچیدہ معمہ نہ تھا جو حل نہ ہوتا ان تعمیرات کا کوئی تعلق بے خانماں افراد کی آبادکاری سے نہ تھا بلکہ یہ تو دراصل اس دولت کی آبادکاری تھی جو چھپائے نہ چھپتی تھی اور سنبھالے نہ سنبھلتی تھی بینکوں میں رکھی نہیں جا سکتی تھی خود اپنے پاس محفوظ نہ رہ سکتی تھی۔ لہٰذا صرف یہی صورت تھی کہ سونے اور چاندی کو اینٹ چونے اور گارے میں ملا کر کوٹھیوں۔ محلوں اور ایوانوں کی شکل دیدی جائے اور پھر اس شکل میں بھی دولت پکار پکار کر سراغ لگانے والوں سے کہے۔ ع۔

پہچان پہ ہے ناز تو پہچان جائیے۔

مگر اب یہی عالیشان - پرشکوہ اور سر بفلک عمارتیں بے شمار صاحبان جائداد کو اپنا مقبرہ نظر آ رہی ہیں اس لئے کہ اب یہ بھی تحقیقات شروع ہو رہی ہے کہ جس نے یہ عمارت بنائی ہے وہ اپنی جائز آمدنی کے اعتبار سے واقعی "راجہ بھوج" تھا کہ ایسا محل تعمیر کرا لے یا "گنگو اتیلی" تھا جس کو چاہیئے تھا کہ جھونپڑی میں ہم محلوں کے خواب تو جتنے چاہے دیکھ لے مگر اس خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکے لیکن اس کے باوجود اگر اس نے ایسی عمارت بنا کر کھڑی کر دی ہے تو اس کے پاس کونسا "اسم اعظم" تھا اور اس کو الہ دین کا کونسا چراغ مل گیا تھا کہ اس کو گھسا اور دیو سے کہا کہ ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک محل بنا کر کھڑا کر دو گلبرگ کالونی میں ایک قصر تعمیر کر دو۔ یہ تحقیقات ایسے ایسے عقدے وا کریگی کہ دنیا انگشت بدنداں رہ جائے خیر دنیا تو اب بھی انگشت بدنداں ہے کہ جن صاحب کی تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہوار ہے ماشاء اللہ کثیر العیال بھی ہیں وہ لاکھوں کی کوٹھی آخر کہاں سے بنا کر کھڑی کر چکے ہیں - جن صاحب کو از روئے قاعدہ سفید پوش بھی مشکل رہنا چاہیئے وہ ایسے چھپے رستم کہاں سے نکل آئے کہ ایک بھول بھلیاں بنائے بیٹھے ہیں اور بظاہر کوئی ذریعہ نہیں مگر نواب صاحب شیش محل بنے نظر آ رہے ہیں -

---

لاہور میں جب گلبرگ کالونی کی تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا تو پہلے تو سب دم بخود رہ گئے کہ الہ العالمین اتنے دولت مند آخر کہاں سے آ گئے جو ایسی ایسی

شاندار کوٹھیاں بناتے ہی چلے جا رہے ہیں مگر جب یہ پُر فضا کوٹھیاں بن گئیں اور ان کو قیمتی سامانِ آرائش سے عروسانہ سجاوٹ کے ساتھ مکمل کر دیا گیا تو کسی نے گلبرگ کالونی کا نام "گول مال پورہ" رکھ دیا اور کسی نے رشوت کالونی۔ اس میں شک نہیں کہ اسی میں بہت سے ایسے لوگ بھی کوٹھیاں بنا چکے تھے جن کی مالی حیثیت ظاہر تھی اور جو اس قسم کی کوٹھیاں بنا سکتے تھے مگر زیادہ تعداد ان حضرات کی تھی جن کی حیثیت میں اور اس کوٹھی میں جو انھوں نے تعمیر کی تھی کوئی مناسبت نظر نہ آتی تھی اور مکان اور مالک مکان دونوں کو دیکھنے والے یہی کہہ سکتے تھے کہ "یہ مُنھ اور مسور کی دال" یعنی۔ ع۔

دیکھیے آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

اسی طرح کراچی اور دوسرے شہروں میں بھی ایسے ایسے لوگوں نے ایسی ایسی کوٹھیاں بنا کر کھڑی کر دی ہیں کہ خدا کی شان ہی نظر آتی ہے مگر اب تک تو یہ خدا کی شان ہم کو نظر آتی ہے اب اس تحقیقات کی روشنی میں یہ خدا کی شان خود ان کو نظر آئے گی اور وہ بھی قائل ہو کر رہیں گے کہ اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں چنانچہ اب وہ پریشان ہیں کہ وہ ذرائع کہاں سے بتائیں گے جن سے اس قسم کی عمارتیں تعمیر کر سکے ہیں۔ اب کوئی صاحب تو کسی لکھ پتی کے پاؤں پر گرے نظر آ رہے کہ آپ صرف اتنی اجازت دیدیجیے کہ میں ولدیت کے خانہ میں آپ کا نام نامی

اسم گرامی دیدوں اگر آپ چاہیں تو اس عارضی ولدیت کا کرایہ بھی حسب حیثیت پیش کر سکتا ہوں۔ جو لوگ کرایہ کے متمول والدین حاصل کرنے سے قاصر ہیں وہ اپنے بھارتی عزیزوں اور دوستوں کو لکھ رہے کہ خدا کے لئے تم مجھ کو اب سے چند سال پہلے کی تاریخ کا ایک خط ہی لکھ دو کہ اتنا روپیہ سرحد پار کرا رہا ہوں اس سے ایک آدھ کوٹھی اپنے نام سے بنوا لو۔ اور اسی طرح کی تگڑموں میں یہ حضرات شب و روز مصروف ہیں۔ راتوں کی نیند اڑی ہوئی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عالی شان گھر میں رہنا میسر آئے گا یا اس سے بھی بڑی سرکاری عمارت میں رہنا پڑے گا۔ کاٹنے کو دوڑ رہے ہیں آج کل ان کو اپنے یہ مکان اور واقعی ان کا جی یہ چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور اس میں یہ مکان سما جائیں۔

صرف گوشت کھائیے

"سستی کنک کا آٹا دو - ورنہ گدی چھوڑ دو۔"

یہ وہ نعرہ ہے جس کی گونج آج بھارتی پنجاب میں ہر طرف موجود ہے مشرقی پنجاب کی راجدھانی چنڈی گڑھ میں تو یہ حال ہے کہ دو دو اور تین تین ہزار افراد کے جلوس برابر نکلتے رہتے ہیں اور یہی نعرے بلند کرتے رہتے ہیں پچھلے جمعہ سے وہاں پانچ افراد ڈسٹرکٹ کورٹ کے سامنے بھوک ہڑتال کئے بیٹھے ہیں انھیں اسمبلی کے ایک ممبر بھی ہیں اسی جگہ پانچ سو ہڑتالی پچھلے چوبیس گھنٹہ سے اسی طرح بیٹھے بھوک میں سوکھ رہے ہیں اور ذمہ دار افسروں کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کیونکر پاکستان کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ چشم پوشی سے کام لیتا رہے اور اسمگلنگ کو جاری رہنے دے اس لئے کہ جب سے یہ اسمگلنگ بند ہوئی ہے گویا ان کی روزی کے دروازے ہی بند ہو گئے ہیں اور اس سرے سے اُس سرے تک سخت ہائے واویلا

بچی ہوئی ہے اُدھر مشرقی پنجاب میں یہ عالم ہے اُدھر مغربی بنگال میں جیسے ۱۹۴۳ء والا قحط واپس آ گیا ہے لوگ بھوک سے تڑپ ہی نہیں رہے ہیں بلکہ مر بھی رہے ہیں خدا کی پناہ چاول کا بھاؤ ۴۷ روپئے من ہو گیا ہے۔

یہ دردناک حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہم ان کا مذاق اڑائیں اور نہ ہم ایسے سنگ دل ہیں کہ ان حالات کو لطیفہ کے طور پر بیان کریں البتہ ان دردناک حالات کا مضحک پہلو یہ ضرور ہے کہ بھارت کے اس صوبہ کی سرکار ہو یا اُس صوبہ کی یا بھارت کی مرکزی حکومت ہو ان سب نے غالباً یہ طے کر رکھا تھا کہ ہمارے لئے روٹی پانی کا انتظام تو پاکستان کرتا ہی رہے گا لہٰذا ہم کو کیا ضرورت ہے کہ زراعت وغیرہ پر روپیہ اور وقت برباد کریں سب سے اچھا یہی ہے کہ ساری دولت گولہ بارود اور توپ بندوق پر صرف کی جائے اور یہ گیہوں پیدا ہو یا نہ ہو کشمیر کی زعفران کے کھیت ضرور لہلہاتے رہیں خواہ ان کھیتوں کی کھاد میں کشمیریوں کا خون ہی کیوں نہ وہاں کی زمین میں پیوست کرنا پڑے چنانچہ سارا خزانہ فوجی اخراجات اور کشمیر کے تحفظ پر ہمیشہ خرچ ہوتا رہا اور سرحدوں پر اسمگلنگ کا ایسا بول بولا رہا کہ بویا نہ جوتا اللہ نے دیا پوتا والی مثل صادق آتی رہی مگر جب پاکستان کو بھی خدا نے ہوش میں آنے کی توفیق دی تو اب اس طرف ہوش اڑتے ہوئے نظر آ رہے ہیں اور کچھ بنائے نہیں بنتی کہ پاکستان نے تو ہاتھ روک لیا اب نوالہ کون کھلائے

پیٹ کون بھرے جمع کی ہوئی بارود پھانک نہیں سکتے۔ توپوں کے گولے اور کارتوس کھا نہیں سکتے۔ ویسے اللہ کا دیا سب کچھ ہے مگر کھانے پینے کی تنگی نے حال پتلا کر رکھا ہے۔

جس طرح ہم اور آپ ہفتہ میں دو دن گوشت کا ناغہ کرتے ہیں اسی طرح اب مشرقی پنجاب میں طے ہو رہا ہے کہ ہفتہ میں ایک دن سب فاقہ کیا کریں اگر اس کے باوجود غذائی حالات کی اصلاح نہ ہوئی تو ممکن ہے دو دن کا فاقہ طے ہو جائے اور اس فاقہ سے سوائے بیماروں اور معصوم بچوں کے کوئی چھوٹا یا بڑا آدمی قانوناً بخشا نہیں جا سکتا۔ ہمارے یہاں تو گوشت کا ناغہ در اصل ان کے لئے ہوتا ہے جو فریجیڈیر میں گوشت محفوظ نہیں کر سکتے ورنہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے فریجیڈیر دے رکھا ہے وہ ناغہ سے ایک دن پہلے ہی دو دن کا زائد گوشت منگا کر رکھ دیتے ہیں اور حسب معمول ناغہ کے دن بھی کباب اور قورمہ اڑاتے ہیں یا مرغیوں پر ہزن بول دیتے ہیں اور اس طرح ناغہ کا اصل مقصد فوت ہو کر رہ جاتا ہے مگر مشرقی پنجاب میں یہ طے ہو رہا ہے کہ غلّے کا ناغہ ہوگا اور غلّہ کھاتا ہوا جو شخص بھی نظر آئے گا اس کے دونوں کانوں سے بیچ میں سر کر دیا جائے گا البتہ اس کو یہ اجازت ہوگی کہ وہ جتنا چاہے دودھ پی لے جتنے چاہے پھل کھا لے اور جتنا چاہے گوشت اڑا جائے اب آپ

یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس کو پھل، دودھ بالائی مکھن، گوشت اور مرغ مسلّم وغیرہ میسّر ہوں اس کو کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ اناج کھاتا پھرے مگر جن کو اناج میسر نہیں ہے یہ بات ان کے دل سے پوچھیے کہ اناج کیا حیثیت رکھتا ہے اور جن کو اناج نہیں ملتا ان کو یہ چیزیں کن داموں اور کس بھاؤ ملتی ہیں۔

غلّہ کی کمی نے اس دیوتاؤں کے ملک کا یہ حال کر دیا ہے کہ پیٹ کی آگ بجھانے کو مجبوراً یہ بھی کہنا پڑا کہ کہاں کا دھرم اور کہاں کی پوتر تا تم زیادہ سے زیادہ گوشت کھاؤ۔ انڈے اڑاؤ مچھلی پکاؤ بس اتنی کر پاکرو کہ اناج کو بخش دو گوشت کھانے اور زیادہ سے زیادہ کھانے کی ترغیب دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے ایسی ہی جان پر بنی ہے کہ اس ہتھیا تک کو جائز کرنا پڑا اس لئے کہ ان کو معلوم ہے کہ محض مولیاں چبا چبا کر اور گاجریں کھا کھا کر وہ تو زندہ رہ نہیں سکتے آلو کے کچالو آخر کتنے کھائیں گے اور ان چیزوں میں غذائیت آخر کہاں سے اتنی آجائے گی کہ وہ اناج سے بے نیاز ہو جائیں اگر اناج کا تھوڑا بہت بدل ہو سکتا ہے تو وہی گوشت ہے جس کو دیکھ کر یہ لوگ "رام رام" کرنا شروع کر دیتے ہیں مگر جب بھوک کے مارے پیٹ کی آنتیں بھی رام نام کا جپنا جپ رہی ہوں تو یہ گوشت بھی ان کے لئے جائز ہو جاتا ہے چنانچہ چھپ چھپ کر گوشت کھانے والوں سے اب خوشامدیں کی جا رہی ہیں کہ چھوڑو یہ ڈھکوسلے گوشت کھانے

میں کوئی باپ نہیں ہے مچھلی کھانے سے دھرم کا کچھ نہیں بگڑتا ساانڈا تو ایک قسم کی ترکاری سمجھو اور ان سب چیزوں سے پرہیز چھوڑ دو رہ گیا اناج وہ چونکہ کھیت کے بجائے چور دروازوں سے اُگ رہا تھا اور چور دروازے اب بند ہو گئے ہیں لہٰذا اس تھوڑے بہت اناج کو جو تم کو نظر آرہا ہے غریبوں کے لئے چھوڑ کر خود انڈا مرغی کباب اڑاؤ۔

مشرقی پنجاب میں تو یہ تحریک چلائی گئی ہے مگر مغربی بنگال کا حال اس سے مختلف ہے وہاں اناج کے علاوہ انڈا مرغی وغیرہ بھی غائب ہے اس لئے کہ کلکتہ کے بازاروں میں جو انڈوں کی ریل پیل تھی اور مرغیوں سے یہ بازار مرغزار نظر آتے تھے ساری بہار بھی سچ پوچھئے تو اسمگلنگ کی تھی اب تو وہاں انڈے کی قیمت بھی اتنی بڑھ گئی ہے جتنے کی مرغی ملا کرتی تھی اب اتنے ہی کے نصف درجن انڈے ملتے ہیں رہ گئی مرغی اس کا خریدنا تو چھوٹی موٹی بکری خریدنے کے برابر ہے لہٰذا وہاں تو گوشت کھا کر بھی بھوک کی آگ کو مشکل بجھایا جا سکتا ہے لے دے کر ایک مچھلی رہ گئی ہے اس کیلئے اب جال ڈالنا پڑیں گے ورنہ اب تک تو مچھلیاں بھی خود ہی مشرقی پاکستان سے ٹہلتی ہوئی آجایا کرتی تھیں مختصر یہ کہ ان حالات کو دیکھ دیکھ کر اور سُن سُن کر دل ہمارا بھی کڑھتا ہے مگر یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم مارے محبت کے اسمگلنگ شروع کر دیں اور مارے مروت کے چور دروازے پھر کھول دیں۔

خواتین و حضرات

یکم فروری کی سہ پہر کو ایک نہایت بارونق اور بھرپور مشاعرہ سید گرلس کالج کے زیرِ اہتمام منعقد کیا گیا جس میں علاوہ شعرائے کراچی کے لاہور پشاور وغیرہ کئی مقامات کے سربرآوردہ شعرا نے حصہ لیا۔ اس بزم مشاعرہ میں جو خطبہ صدارت میں نے پیش کیا ہے وہ ناظرین وغیرہ کی امانت کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا ایک دیانتدار امین کی طرح وہ خطبہ من و عن پیش کر رہا ہوں :

پرنسپل صاحبہ شعرائے کرام۔ خواتین و حضرات!

ایک زنانہ کالج کے مردانہ مشاعرہ کی صدارت کا منصب عطا فرما کر اللہ جانے آپ نے میری عزت افزائی فرمائی ہے یا مزاح لطیف سے کام لیا ہے بہرحال میں بکمال سنجیدگی آپ کا شکر گذار ہوں اور اس شکر گذاری کے اظہار کو اس لئے مختصر سے مختصر تر بنانا چاہتا ہوں کہ کہیں یہ سنجیدگی بھی کسی تمسخر کی شکل

اختیار نہ کرے۔

خواتین وحضرات! میں نے آج ہی نہیں بلکہ اکثر اس مسئلہ پر غور کیا ہے کہ شاعری کے عہد حاضر کو الخطاطی دور کہنا منجملہ دوسری وجوہ کے اس وجہ سے بھی کس قدر غلط ہے کہ شاید اس دور سے زیادہ کسی اور دور نے اتنی شاعرات پیدا نہیں کیں جتنی آج نظر آتی ہیں۔ اللہ جانے مبصرین شعروادب اس کو شاعری کا ارتقاء سمجھتے ہیں یا تنزل کہ خواتین بھی بال بچوں کی فکر کے علاوہ فکر سخن میں مبتلا نظر آتی ہیں مگر میں اس کو ارتقا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے۔ ع

مردانہ سے زیادہ زنانہ میں دھوم ہے

شروع شروع میں یہ بات مجھے بھی عجیب وغریب نظر آئی تھی کہ مشاعروں میں خواتین نے بھی پہلے سامع کی حیثیت سے حصہ لینا شروع کیا۔ پھر وہ صف شعراء پر بھی چھاپہ مارتی نظر آئیں اور رفتہ رفتہ مخلوط تعلیم نے جس رفتار سے فروغ حاصل کیا مخلوط مشاعرے بھی ترقی کرتے نظر آنے لگے یہاں تک کہ خدا نے یہ دن بھی دکھادیا کہ خواتین کے مشاعرے میں مرد شعراء آٹے میں نمک کی مناسبت سے شریک نظر آرہے ہیں۔ اس مشاعرے میں آٹے اور نمک والی بات ہر چند کہ بیباکی کے ساتھ آگئی ہے مگر جب آہی گئی ہے تو اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔ میں آج یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اب تو میں چشم بد دور بڑا

روشن خیال بن چکا ہوں ورنہ جب شروع شروع میں مجھ کو خواتین سر مشاعرہ غزل سرائی کرتی ہوئی نظر آئیں تو میں نے خود اپنے لئے ہنڈ کلھیا پکانے کے امکان پر غور کیا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ادب اردو کی کسی تاریخ میں مجھ کو کہیں ایسے مشاعرے کا پتہ نہیں چلا جس میں غالب کے علاوہ کسی غالبا نے بھی شرکت کی ہو اور مومن کے علاوہ کسی مومنہ نے بھی شعر سنا کر داد حاصل کی ہو۔ بلکہ میری نظر میں تو وہ مشاعرے تھے جن میں مردوں کے علاوہ عورتوں کا دور دور پتہ نہ ہوتا تھا۔ پھر وہ مشاعرے شروع ہوئے جن کے اشتہاروں میں لکھا جانے لگا کہ خواتین کے لئے پردے کا خاص انتظام ہے اور رفتہ رفتہ اسی کراچی میں ایک ایسا مشاعرہ بھی منعقد ہوگیا جس میں مردوں کے لئے پردے کا خاص اہتمام تھا۔ میں اپنے دوست حضرت ظریف جبلپوری سے آپ کو وہ نظم سنوانے کی کوشش کروں گا جس نے اس زنانہ مشاعرے کو جس میں مرد شعراء کو پردہ نشین بنایا گیا تھا تاریخی حیثیت دی گئی ہے مگر اب اس قسم کے مخلوط مشاعرے ہمارا معمول بن چکے ہیں۔ خدا نظر بد سے بچائے شاعرات کی اب کوئی کمی نہیں ہے اور ان میں ایسی ایسی باکمال شاعرات بھی موجود ہیں جو شاعروں میں حاصل مشاعرہ نتائج فکر پیش کر کے مردوں سے خراج تحسین حاصل کر ہی لیتی ہیں۔

یہ بات ان بزرگوں کے نزدیک تعجب انگیز ضرور ہے جو فن کو بھی جنس وار تقسیم کرتے ہیں اور شاعری کو بھی پہلوانی کی طرح خالص مردانہ فن گردانتے ہیں۔

حالانکہ زمانہ وہ آگیا ہے کہ پہلوانی بھی خالص مردانہ فن باقی نہیں رہا ہے۔ آپ نے مشہور خاتون پہلوان حمیدہ بانو کا نام سنا ہوگا جس سے بڑے بڑے پہلوان پناہ مانگتے تھے آپ نے تارا بائی کا نام سنا ہوگا جس نے رام مورتی کو اس طرح آئینہ دکھایا تھا کہ وہ ایک موٹر کو روک لینا اور اپنی گرفت میں لیکر جنبش میں نہ آنے دینا اپنا کمال سمجھتے تھے تو ان محترمہ نے دو موٹروں کو بیک وقت روک کر ثابت کر دیا کہ یہ کمال صرف دہنے ہاتھ کا نہیں بلکہ ایک عورت کے بائیں ہاتھ کا بھی کھیل ہے۔ آپ ان محترمہ بزرگوں سے کہہ سکتی ہیں کہ عورت کے شاعر ہونے پر اعتراض کرنے سے پہلے ذرا دوسرے شعبوں میں بھی عورتوں کی رسائی دیکھ لیں۔ اگر زنانہ پولیس ممکن ہے تو خواتین کی شاعری پر تعجب کیوں ہے۔ خواتین اگر رائفل کلب میں نشانہ بازی کر سکتی ہیں تو مشاعروں کی شرکت سے ان کو کون روک سکتا ہے۔ فوجی محکموں میں اگر خواتین آسکتی ہیں تو ہمارے بزرگ ان کو مشاعروں میں دیکھ کر کلجگ کیوں یاد کرنے لگتے ہیں۔ عورت اگر لیڈری کر سکتی ہے تو شاعری کیوں نہیں کر سکتی یہ اور بات ہے کہ میرے ایک نہایت ہی شفیق بزرگ۔ ڈاکٹر اینی بسنت کو زندگی بھر مرد سمجھتے رہے اور جب ان کو بتایا گیا کہ وہ خاتون تھیں تو احمق سمجھ کر بولے کہ جناب والا وہ خاتون ہوتے تو لیڈی ڈاکٹر اینی بسنٹ ہوتے۔ اس واقعے کو جسے آپ نے لطیفہ سمجھا ہوگا یہاں دوہرانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ میں خواتین

کی شاعری کا اول تو مخالف نہیں ہوں اور اگر مخالف ہوتا بھی تو ایک زنانہ کالج میں اس کی مخالفت کا اظہار نہ کرتا۔ البتہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ خواتین کے اسمِ مبارک یا تخلص کے علاوہ لیڈی ڈاکٹر قسم کی کوئی چیز ضرور رہونا چاہیئے تاکہ ادب کا مورخ تاریخ میں مردوں کو عورت اور عورتوں کو مرد نہ بنا دے مثلاً شمیم ایک مرد کا بھی تخلص ہو سکتا ہے اور ایک عورت کا بھی خود شوکت اللہ جانے کس دن کسی خاتون کا تخلص واقع ہو جائے اور ان کا ذکر تاریخ میں اس طرح آئے کہ یہ شوکت نہایت صاحب اولاد بزرگ تھے مزاح نگار کی حیثیت سے ادب میں داخل ہوئے اور مزاحیہ شاعری کی آغوش میں رحلت پائی۔ اور خود میرا ذکر تاریخ میں اس طرح آئے کہ یہ محترمہ بڑی شرمیلی واقع ہوئی تھیں مشاعروں میں برقعہ پہنکر شعر سناتی تھیں اور روداد بلنے پر ان کے شوہر سلام کرتے تھے۔ اس تمام گڑبڑ سے محفوظ رہنے کیلئے میری تجویز بھی ہے کہ شاعرات کے لئے لیڈی شاعر یا نام سے پہلے لفظ "شاعرہ" کا آنا ضروری ہے تاکہ تاریخ میں جنسی تبدیلی نہ ہونے پائے۔

خواتین و حضرات! میں مزاحاً نہیں بلکہ واقعی خواتین کی شعر گوئی کا مخالف نہیں ہوں البتہ خواتین یا تو غزل کے اسلوب کو اپنے حسب حال بنالیں یا نظمیں کہا کریں۔ کچھ عجیب لغو سی بات معلوم ہوتی ہے جب کوئی شاعرہ اس قسم کا شعر پڑھتی ہے کہ۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

تو یہ عجیب مضحکہ خیز سی بات معلوم ہوتی ہے۔ یہ مونچھوں والے شعر عورتوں کو زیب نہیں دیتے لہذا وہ "چاہتا ہوں" کو "چاہتی ہوں" تو آسانی سے بنا سکتی ہیں مگر اس کے باوجود یہ زنانہ شعر مشکل بن سکتا ہے اور اس میں نسائی وقار باقی نہیں رہتا۔ یہ بحث طویل ہے میں صرف اس اشارے ہی کام لیکر اس کو تشنہ چھوڑنے پر مجبور ہوں اس لئے کہ اب حاضرات و حاضرین مجھ کو مشاعرے کا پیپر ویٹ سمجھنے لگے ہیں لہذا میں اس مشاعرے کی ابتدا کا اعلان کرتا ہوں۔

روٹی کپڑے کا دعویٰ

شوہرانِ ملک و ملت طرح طرح کی خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ وہ خداوند بن سکے مگر خدا کی ایک بندی کے مجازی خدا تو ہیں ہی جو ان کو "سر تاج من سلامت" قسم کے القاب و آداب سے خط لکھتی ہے اور اپنے سر تاج کی خود سلیبر بنکر رہتی ہے مگر ان شوہروں نے کاش کبھی اس بات پر غور کیا ہوتا کہ یہ عزت و اعزاز، یہ اقتدار اور دبدبہ ان کو کس قدر منگا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے تو اس مجازی خداوندی کی قیمت ان کو مہر کی شکل میں ادا کرنا پڑتی ہے خواہ وہ مہر معجل ہو یا موجل یعنی یا تو وہ مہر فوراً ادا کرتے ہیں یا قرض کا بار اپنے سر لیتے ہیں اس کے بعد نان نفقہ کی ذمہ داری بھی ان کو قبول کرنا پڑتی ہے اور اگر اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں وہ ذرا بھی کوتاہی کریں تو بیوی کی جوتی ایسی سر کو آتی ہے کہ ساری مجازی خداوندی دھری رہ جاتی ہے اور روٹی کپڑے کا دعوی دائر ہو جاتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ اگر اہلیہ محترمہ کو چھوڑنا بھی چاہیں تو بچوں کی کفالت کی ذمہ داری

سے گردن نہیں چھوٹتی اور بیوی کو چھوڑنے کے بعد بھی بچوں کا خرچ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ یا بیوی کو چھوڑنے کی نوبت نہ آئے بلکہ بیوی خود ان حضرت پر لعنت بھیج کر میکے جا بیٹھے تو بھی ان حضرت پر نان نفقہ کا دعوی ہو جاتا ہے اور ان کو بیوی بچوں کے اخراجات ادا کرنا پڑتے ہیں۔

قصہ کوتاہ بن تو جاتے ہیں مارے شوق کے مجازی خدا مگر پھر زندگی بھر طبیعت ایسی صا ہوتی ہے کہ اپنی اس خدائی سے خود نجات نہیں ملتی۔ برعکس اس کے وہ ممالک ہیں جہاں بظاہر تو شوہر اپنی بیوی کی اہلیہ بنا ہوا نظر آتا ہے دیکھنے والوں کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اپنی بیوی کے زیادہ سے زیادہ "پرائیویٹ سکریٹری" ہیں مگر یہ "فدوی" نظر آنے والے شوہر بے شمار ذمہ داریوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی بیویاں موٹروں اور شوہروں میں بہت ہی کم فرق سمجھتی ہیں اور وہ موٹروں کے علاوہ اپنے سیکنڈ ہینڈ شوہر کو بھی چھوڑ نئے ماڈل کا شوہر جب چاہتی ہیں حاصل کر لیتی ہیں اور ان حالات میں ان نیلام پر چڑھے ہوئے شوہروں کی کیفیت اکثر نہایت درد انگیز ہو جاتی ہے مثلاً یہ کہ وہ بیمار ہو گئے اور بیوی نے ان کو بستر علالت ہی پر چھوڑ کر خو اپنے لئے کسی تندرست شوہر کی جستجو شروع کر دی یا وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر کچھ لنگڑے لولے وغیرہ ہو گئے اور بیوی نے ان کو ناقابل مرمت سمجھ کر بجائے ورکشاپ میں

کے ہی مناسب سمجھا کہ ایک نئے ڈیزائن اور نئے ماڈل کا شوہر ہی حاصل کر لیا جائے
یہ حالات ایسے ہیں کہ مغربی ممالک کے شوہروں کی حالت زار پر ترس آتا ہے اور
جی چاہتا ہے کہ وہ حیوانات پر بے رحمی کرنے کے انسدادی قانون ہی کے
تحت کسی طرح آجائیں۔

یہ حالات اس حد تک مغربی ممالک میں درد انگیز ہو چکے ہیں اور بیویوں کی
طرف سے شوہر آزاری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اب برطانوی حکومت ایک
ایسے قانون پر غور کر رہی ہے جس کے نفاذ کے بعد طلاق حاصل کرنے والی
عورتوں کو اب یہ آزادی حاصل نہ رہے کہ وہ شوہر کو دودھ کی مکھی سمجھ کر جب
چاہیں گھر سے نکال دیں یا جب جی چاہے شوہر کو ٹیلیفون کر دیں کہ سنو میاں ع

بس اب خانہ آباد، دولت زیادہ

میں گھر واپس نہیں آ رہی ہوں اس نئے قانون کے ماتحت ان طلاق
حاصل کرنے والیوں کو اپنے متروکہ شوہروں کو گذارہ دینا پڑے گا۔ یہ گذارہ
کسی حالت میں پانچ پونڈ فی ہفتہ سے زیادہ نہ ہوگا یعنی تقریباً ستر روپے فی
ہفتہ۔ صاحب اچھی خاصی رقم ہوگئی یہ یعنی تقریباً ساڑھے تین سو روپے ماہوار
مگر اس گذارے کے حصول کے لئے ہر شوہر کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ وہ اس کا
مستحق ہے یعنی اس کو ضعیفی کی وجہ سے بیوی نے چھوڑ دیا ہے لہذا اس کو بیوی

سے پنشن دلوائی جائے یا بیماری کی وجہ سے بیوی نے چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ بیوہ نہ ہونے پائیں یا کسی اور ایسی ہی وجہ سے چھوڑا ہے جس میں شوہر کا کوئی ذاتی قصور نہ تھا مثلاً چیچک نکل آئی اور وہ حضرت بد صورت ہو گئے یا گر پڑے اور ٹانگ وغیرہ ٹوٹ گئی۔ ان حالات میں بیوی پر فرض ہو گا کہ وہ گذارہ مقرر کرے۔ البتہ اگر دونوں میں مارپیٹ ہوئی ہو یا اتنا شوہر نے عاجز کیا ہو کہ وہ مجبور ہو گئی ہو طلاق پر تو ان عورتوں میں گذارے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

عام طور پر گذارہ ان شوہروں کو ملا کرے گا جو اس قابل نہ رہ گئے ہوں کہ کوئی عورت ان کو التفات کا مستحق سمجھے اور بحیثیت شوہر قبول کرے۔ یہ لوگ بحیثیت شوہر کے ریٹائر کئے جائیں گے تو ان کو پنشن ضرور ملے گی یا ان جوان شوہروں کو یہ گذارہ مل سکے گا جن میں بظاہر کوئی عیب نہ تھا نہایت سعادت مند ہونہار شوہر تھے ہر خوبی جو ایک شوہر میں ہونا چاہیئے تھی ان میں موجود تھی مگر چونکہ بیگم صاحبہ کی خواہش یہ تھی کہ "خوب سے خوب تر" ملے لہذا وہ ان سے بھی زیادہ کسی کی خوبیوں سے متاثر ہو کر اکی ہو رہیں تو یہ سودا کرتے ہوئے ان کو متروکہ شوہر کے ساتھ انصاف کرنے پر غور کرنا پڑے گا اور اس کو گذارہ مقرر کرنا پڑے گا خواہ وہ بھی دوسری شادی کیوں نہ کر لیں۔ اور ان

باوفا شوہروں کو بھی اس گنڈاورے کا مستحق سمجھا جائے گا۔ جو بیوی سے یہ کہہ دیں کہ تم شوق سے شادی کرو مگر میں تمہارے ہی نام پر بیٹھا رہوں گا۔

کتنا فرق ہے ہم مجازی خداؤں میں اور ان نیاز مند بلکہ "عبدالزوجہ" شوہروں میں۔ یعنی ہم یہاں پر نان ونفقہ کا دعوے ہو سکتا ہے اور وہاں شوہر یہ دعوے بیویوں پر کر سکتے ہیں یہاں ہم روٹی کپڑے کے ذمہ دار ہیں وہاں شوہر الگ کماتا ہے۔ بیوی الگ نوکری کرتی ہے اس کو اس کی آمدنی سے کوئی سروکار نہیں اس کو اس کی آمدنی سے کوئی مطلب نہیں بہت ہی عشق ہوا تو مل جل کر رہ لئے ورنہ وہ علیحدہ ہوٹل میں کھانا کھاتی رہیں گی یہ الگ اسپتال میں مرتے رہیں گے وہ الگ کلب میں ناچے گی یہ الگ تنہائی میں تگنی کا ناچ ناچتے رہیں گے اور جب کبھی آمنا سامنا ہو گیا تو ایک دوسرے سے ہلّو کہہ کر مل بھی لیں گے اور یاد نہ بھی آجائے گا کہ ہم دونوں تو شائد آپس میں میاں بھی ہیں یا اگر بچے ہو گئے تو ان کو بتانے کے لیئے یہ یاد رکھنا پڑتا ہے کہ تمھارا ایک باپ بھی ہے کسی دن آئے گا تو تم کو دکھا دیں گے۔

مصیبت ساری یہ ہے کہ ہم مجازی خداؤں کی یہ حقیقی بندیاں ایسی گھر والیاں ہوتی ہیں کہ ان بیچاریوں کو واقعی ہمارے رحم کرم پر رہنا پڑتا ہے

یعنی اگر ہم کما کر نہ لائیں تو وہ بھوکی مریں لہذا ان کو زیر دست رہنا پڑتا ہے خواہ ہم کیسی ہی زبردستی کیوں نہ کریں مگر وہ خواتین تو خود کفیل ہوتی ہیں ان کو شوہر کی کمائی کی کیا پروا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں خود شوہرانہ شان ہوتی ہے اور چونکہ یہ شان روز بروز بڑھ رہی ہے اور وہ شوہروں کو نیلام پر چڑھائے ہوئے ہیں کہ آج خرید کل بدل دیا لہذا ضرورت اسکی پیش آتی ہے کہ شوہروں کے حقوق کا بھی تحفظ کیا جائے تاکہ وہ بے موت نہ مر سکیں۔ اب جب اس قانون کے ماتحت ان محترمات کو شوہر کا گزارہ دینا پڑے گا تو وہ ذرا سمجھ بوجھ کر طلاق کا نام لیا کریں گی اور طلاق حاصل بھی کریں گی تو شوہر یہ تو کہہ سکیں گے کہ میں فلاں خاتون کا پنشنر شوہر ہوں۔



ریل کا ہم سفر ——— ؟

جاڑے کا سفر سائیں سائیں کرنے والی رات میں شائیں شائیں کرنے والی ٹرین اور شریک سفر بھی کون ؟

ع زبان پہ بارِ خدا یا یہ کس کا نام ......

مگر نہیں، ٹھہریے تو سہی ۔ نام کا بھلا ہم کو کیا پتہ ؟ نام تو نام صورت تک نہیں دیکھی تھی ۔ البتہ اتنا معلوم تھا ۔ کہ حسین ہے اور بے حد حسین ۔ اسکی دلفریبی کی قسم بغیر دیکھے ہوئے اسی طرح کھا سکتے تھے ۔ جس طرح بغیر دیکھے خدا کی سچی تو سچی جھوٹی قسمیں بھی جب جی چاہے کھا سکتے ہیں ۔ ارغوانی رضائی جس پر کامدانی کے ستارے بکھرے ہوئے تھے ۔ اس پیکرِ ناز کے حسن کو چھپا چھپا کر چمکا رہی تھی ۔ یہ رضائی لکھنؤ کی بنی ہوئی تھی ۔ اس لیے کہ رضائی میں کامدانی بنانے کا سلیقہ اور سلیقہ سے زیادہ فرصت کسی شہر کو کہاں

نصیب ہے کا کسی گوشے میں سلیقے سے سجا دے گا وہ کام جو دیکھنے والوں کی نظروں کو جھپکائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قسمت ہو تو ایسی کہ مقابل والی سیٹ پر ہم کو بھی نہایت کشادہ جگہ مل گئی۔ صرف ایک مسافر کونے میں سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ جس کے پاس اوڑھنے کو کچھ نہ تھا۔ دھوتی کا پینچ کھول کر پیروں پر ڈال لیا تھا تاکہ دل کو یہ سمجھا سکے کہ ہم بھی کچھ اوڑھے ہوئے ہیں۔ اس شخص کو بیٹھنا ہی چاہیے تھا۔ اس لیے کہ اگر لیٹ جاتا تو واقعی سردی لگ جاتی۔ سردی تو خیر اب بھی لگ رہی ہوگی مگر جتنی لگنا چاہیے تھی۔ اتنی نہ لگ رہی ہوگی۔ بہرحال اس شخص کے متعلق غور کرنے کی فرصت ہی کسے تھی۔

ہولڈال کو کھول کر سیٹ پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اور یہ غور کرنے لگے کہ آج کس کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے۔

ذرا غور تو کیجیے، ایک حسین عورت تن تنہا۔ اور پھر لمبا سفر۔ لمبے سفر کا اندازہ سونے کے انداز سے ہو رہا تھا۔ کیسی بے فکری کی نیند تھی۔ واقعی جوانی سو رہی تھی۔ سچ مچ حسن حفاظت کر رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اس وقت کہیں سے ایک ستار مل جائے اور خواب ناز کے متعلق جتنی ٹھمریاں، دادرے یا غزلوں کے اشعار ہم کو یاد ہیں سب گا کر رکھ دیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ روح گنگنا رہی ہے اور ہم جھوم رہے ہیں یا ہم جھوم رہے ہیں اور ہم ہی گنگنا رہے ہیں یا روح جھوم رہی ہے اور ہم گنگنا رہے ہیں۔ بہرحال جھومنا اور گنگنانا

بالکل یقینی تھا۔ البتہ تقسیم کار کا صحیح اندازہ اس وقت آسانی سے نہیں ہو سکتا تھا ہم نے اسی عالم جذب و سکر میں اپنے ہولڈال کو بہت قرینہ سے سیٹ پر لگا دیا قرینہ سے مطلب یہ کہ ریشمی سوزنی جو پہلے سب سے نیچے رکھی ہوئی تھی تاکہ سفر میں خراب نہ ہو سب سے اوپر بچھا دی تاکہ جب وہ اپنی دلفریب رضائی کا ایک گوشہ اٹھا کر اپنے ہوشربا مکھڑے کو بے نقاب کریں تو بستر کی کم حیثیتی سے ہمارے متعلق کوئی ایسی رائے قائم نہ کریں کہ ہم کو اس رائے میں تبدیل کرانے میں خواہ مخواہ کچھ وقت صرف کرنا پڑے پھول دار تکیہ اوپر اور سادہ نیچے رکھ دیا۔ ولایتی کمبل نکال کر سوتی کمبل ہولڈال کی جیب میں رکھ دیا۔ ارادہ تھا کہ بس یہی کپڑے پہنے ہوئے لیٹ جائیں مگر اب یہ رائے تبدیل کر دی۔ شب خوابی کے ریشمی سوٹ کی ضرورت نہایت شدت کے ساتھ محسوس ہوئی ورنہ ظاہر ہے کہ وہ بھی کہتیں اپنے دل میں کہ عجیب جانگلو ہے جس کے سونے اور جاگنے کا ایک ہی لباس ہوتا ہے۔ ہائے اس وقت ڈریسنگ گون نہ ہوا۔ وہ اونی نہ سہی ریشمی سہی مگر کچھ تو بہار دے ہی جاتا۔ بہر حال لیٹ گئے۔ رضائی کی طرف ہمہ تن توجہ اور رضائی اٹھنے کے ہمہ تن منتظر۔

اس کا حسین ہونا تو خیر طے تھا۔ کاش حسن کے ساتھ ہی ناکتخدا بھی ہو۔ تاکہ۔۔۔۔ مگر خیر یہ بات تو بہت قبل از وقت ہے معلوم نہیں اس کے والدین اس کی نسبت کو منظور بھی کریں گے یا نہیں۔ لیکن ایک بات ہے کہ والدین کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیئے کہ وہ اس قدر آزاد خیال ہے کہ تنہا

سفر کر رہی ہے۔ اور ناکتخدا بھی اس لیئے ہے کہ نہ تو کوئی بچہ ہے اور نہ بچے کا باپ
یہ بھی سمجھنے کی بات ہے۔ کہ اگر اس حسینہ کی خدانخواستہ شادی ہو چکی ہوتی تو ایسی
حسین بیوی کو تنہا سفر کرنے کی اجازت مشکل ہی سے کوئی شوہر دے سکتا تھا۔
تو گویا اسکی شادی نہیں ہوئی ہے۔ مگر ایک مصیبت یہ بھی تو تھی کہ ہماری شادی
ہو چکی تھی مگر سنیئے تو سہی اگر ہو بھی چکی تھی تو کیا؟ اول تو اس بیچاری کو اسکی
خبر ہی کیونکر ہو سکتی ہے اور خبر ہو بھی تو دوسری شادی کوئی گناہ تو ہے نہیں۔
شفقت ماموں نے دوسری شادی کی تھی۔ پہلی بیوی میکے میں رہتی تھیں۔ اور
دوسری بنگلہ میں، ان کو عدالت کی مقرر کی ہوئی رقم دی جاتی تھی اور ان کو سب
کچھ۔ ان کے بچوں کے بھی یہی باپ تھے اور ان کے بچوں کے بھی...... مگر صاحب یہ
ڈھولی اوڑھنے والا اور سردی میں سکڑنے والا مسافر بھی عجیب بے حس تھا۔
یعنی اس کو سونے اور سردی کھانے کے علاوہ گویا اسکی خبر ہی نہیں تھی کہ عین اسکے
سامنے ہی ایک فتنہ بیدار ہے اور فتنہ گر محو خواب، حالانکہ از روئے قاعدہ اس
بے بستر مسافر کو ہم سے زیادہ خوش نصیب ہونا چاہیئے تھا اس لیئے کہ یہ پہلے ہی
سے ان کا ہمسفر تھا جن کے شریک سفر ہونیکی سعادت ہم کو اب حاصل ہوئی تھی
اور قرینہ یہ بتا رہا تھا کہ یہی سفر ہمارا حاصل زندگی بن کر رہیگا۔ لیٹے لیٹے ایک دم
سے خیال آیا کہ یہ جو ہم سگریٹ پی رہے ہیں اسکا درجہ بیڑی سے کچھ یونہی سا بلند
ہے اور سب سے بڑا نقص اس کمبخت سگریٹ میں یہ ہوتا ہے کہ ناظرین کو اس بات

کا اندازہ کرایا ہی نہیں جا سکتا، کہ یہ سگریٹ ایک آنہ پیکٹ والا نہیں، بلکہ ڈھائی آنے ڈبے والا ہے۔ اسکی لے دیکر بس یہی ایک ترکیب ہے کہ سگریٹ لبوں میں دبا کر اسکا ڈبہ آدمی اپنے ہاتھ میں لیئے رہے۔ سگریٹ ایک سرے سے نہ پینا بھی اپنے کو بیوقوف ثابت کرنیکے برابر ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہایت آسانی سے یہ سوچ سکتی تھیں کہ جس شخص میں ابتک سگریٹ پینے تک بلوغ نہ پیدا ہوا اسمیں ایک عورت کی پذیرائی کا شعور کیونکر ممکن ہے یاد آیا کہ اٹیچی میں پائپ رکھا ہوا ہے۔ ایک دم اچھل پڑے طبیعت باغ باغ ہو گئی بلکہ۔

ع۔ "پسلی پھڑک اٹھی نگہ انتخاب کی"

واقعی پائپ اس قسم کے مواقع کے لیئے نہایت آزمودہ چیز ہے۔ پائپ پینے والے کی طرف عورت اس طرح کشاں کشاں آتی ہے جس طرح ..... جس طرح ..... خیر..... اس وقت کوئی تشبیہ یاد نہیں آرہی ہے۔ بہرحال عورت پائپ کی طرف کھنچی ضرور ہے ہم نے بستر سے اٹھکر فوراً اٹیچی میں سے پائپ نکالا۔ تمباکو کا ڈبہ برآمد کیا اور اپنے حسین شکار کے لیئے پائپ سے مسلح ہو کر پھر لیٹ گئے۔

معلوم نہیں اس قسم کے امتحانی مواقع پر سب کا دماغ اس قدر حاضر ہو جاتا ہے یا قدرت نے یہ خصوصیت ہم ہی کو عطا کی ہے کہ بلا کی سوجھ بوجھ ہو جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر فوراً پہونچ جاتی ہے مثلاً اس وقت ہم کو یہ خیال آیا کہ ہم روشنی کے رخ پر لیٹے ہوئے نہیں ہیں اور ہمارے چہرے پر اندھیرا ہے اگر ہم

اس رخ کو بدل دیں۔ یعنی تکئے اس طرف رکھ دیں جدھر فی الحال پائینتی ہے۔ تو چہرے پر روشنی پڑنے لگے گی اور دیکھنے والے کو رنگ نکھرا ہوا نظر آئیگا۔ یاد رکھیئے کہ بجلی کی روشنی رنگ کے لیئے نہایت مجرب تسلیم کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ یہ سانولا سلونا رنگ ہوتا ہے نا۔ اس کو اگر اندھیرے میں دکھا جائے تو چہرے کا نمک کالا نمک نظر آتا ہے اور بلا وجہ انسان کو سیاہ فام ہونے کی ندامت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ موقع اس قسم کی ندامت کا نہ تھا۔ ہم نے فوراً ہولڈال کا رخ بدل دیا۔ اور رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر دل ہی دل میں کہنے لگے کہ دیکھیں اب ادھر جاتا ہے پروانہ یا ادھر آتا ہے —

مگر صاحب قیامت کی جوان (واللّٰہ)، الحفیظ اور جوان نیند تھی کہ کروٹ تک بدلنے کا ہوش نہ تھا۔ ٹرین کی جنبشوں سے رضائی کے ریشم میں ہلکی ہلکی لہریں سی پیدا ہو رہی تھیں۔ اور ان لہروں کی وجہ سے کامدانی اور جگمگ جگمگ ہو رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ کسی لالہ زار میں کسی بہت بڑے سرمایہ دار جگنو کی برات آئی ہوئی ہو۔ یا بحیرۂ احمر میں ایک دم سے تمام ستارے غسل کرنے کیلیئے اتر آئے ہیں۔ مختصر یہ کہ رضائی جاگ رہی تھی اور رضائی والی تھی کہ کسی طرح جاگنے کا نام ہی نہ لیتی تھی اور یہاں دماغ تھا کہ اسکے جاگنے کے بعد پیش آنے والے واقعات کے تصوروں کا گویا میلہ لگائے ہوئے تھا۔ تقریب ملاقات کی بیشمار تجویزیں ذہن میں آآ کر رد ہو رہی تھیں۔ تعارفی مکالمے کے ریہرسل پر ریہرسل دل ہی دل میں ہو رہے تھے۔ اپنے سوالات کے ساتھ ہی ساتھ ان کے

جو ایات بھی ذہن رسا خود ہی دے رہا تھا کہ ہم اُن سے کہیں گے۔

ہم۔ "معاف کیجئے گا غالباً دو بجے ہوں گے"

وہ۔ "جی ہاں شاید چار ابھی نہیں بجے"

ہم۔ "تو آپ بھی بھوپال تشریف لے جا رہے ہیں"؟

وہ۔ "جی ہاں! تو کیا آپ بھی بھوپال جا رہے ہیں۔؟"

ہم۔ "جی ہاں بھوپال، مجھ کو وہاں کی ایک ادبی انجمن کے سالانہ اجلاس کی ایک نشست کی صدارت کرنا ہے"

وہ۔ "جناب کا اسم مبارک؟"

ہم۔ "مجھے کاشف الکلامی الہابڑی کہتے ہیں۔ روزنامہ غروب کا مدیر اعلیٰ ہوں"

وہ۔ "اوہ۔ اوہ۔ آپ ہی کاشف صاحب ہیں میں نے تو آپ کا نام اکثر سنا ہے۔ آپ کی کتاب "شکور و نصیبن" میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر"

ہم۔ "جو الفاظ میرے جونت دماغ میں محدود تخیل تھے۔ وہ آپ نے ارشاد فرمادیئے اب میں اپنے جذبہ مسرت کو معذور تکلم پاتا ہوں۔ اور زبان بے زبانی ہی کو ترجمانی کا ذریعہ بناتا ہوں"

وہ۔ "ماشاء اللہ صرف قلم ہی میں جادو نہیں بلکہ گفتگو میں بھی وہی تحریر والا سحر موجود ہے"

"میں دریافت کرسکتا ہوں۔ کہ آپ کا...... یعنی...... اسم....."

"جی میرا نام ناہید درخشاں ہے۔ میرے والد خان بہادر طغرل خاں کا نام آپ نے سنا ہوگا۔"

اچھا...... اچھا...... اور آپ کے......

جی نہیں بس اور میرے کچھ نہیں۔ میں ابھی.........

رعنائی میں یکایک جنبش ہوئی۔ اور یہاں ہمارا دہر سل ختم۔ بالوں پر ایک ہاتھ پھیر کر دل ہی دل میں کہا۔ ع آخر آمد زپس پردہ تقدیر پدید! مگر وہ جنبش کامرانی کے ستاروں کو جگمگا کر رہ گئی، ایک لہر سی آئی اور پھر سطح پر سکون طاری ہو گیا مگر یہ اچھا ہی ہوا اس لیے کہ ایک نہایت شدید غلطی کا فوراً احساس ہم کو ہوا کہ ہم نے یہ کیا غضب کیا تھا کہ سر پہ ہاتھ پھیر کر بالوں کو درست کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ بات ہم کو پہلے سے معلوم تھی کہ خواتین عام طور پر بنے سنورے بالوں کو پسند نہیں کرتیں بلکہ وہ مرد کے بالوں میں ایک مستقل ژولیدگی دیکھنا چاہتی ہیں۔ روکھے روکھے سے بال تھوڑے سے الجھاؤ کے ساتھ اگر کسی مرد کے سر پر ہوں تو عورتیں اس کو اس کو آسانی کے ساتھ ادبی قسم کا آدمی سمجھ لیا کرتی ہیں اور بنے ہوئے بالوں والے مرد کے متعلق تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کسی تھیٹر کا ایکٹر ہے یا کسی دفتر کا بابو۔ دوسرے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ الجھے ہوئے نیم پریشان بالوں کے ساتھ پائپ بھی خوب سجتا ہے اور اس سے آدمی کے متفکر ہونے کا اندازہ ہو سکتا ہے ہم نے بالوں پر دو ہاتھ بے ترتیبی سے ادھر ادھر پھیر کر ان کو منتشر کر دیا اور اس طرح دل پر سے یہ بوجھ اتر گیا۔ کہ اب

کم سے کم خوبصورت بلا کے ہیرو تو نظر آئینگے اور نہ حاکم پرگنہ کے اہلمد اور نہ کسی کے اہل خانہ۔

دماغ تو ان احتیاطوں میں مصروف تھا مگر دل کو رضائی والے سربستہ راز کی مستقل طور پر کھوج تھی "تو کیا واقعی اس کا نام ناہید درخشاں ہوگا"؟ بہرحال ناہید درخشاں ہوگا"؟ بہرحال ناہید درخشاں نہ سہی طاؤس رقصاں سہی۔ مہ کنعاں ہی سہی، مگر ہوگا یقیناً کوئی نہایت ہی ادبی قسم کا کھنکھناتا ہوا نام اور اس نام سے پہلے جب اس میں "آرٹسٹ" لگا دیا جائیگا تو واقعی یہی معلوم ہوگا کہ کامدانی پڑی ہوئی ارغوانی رضائی میں کامدار کا سنہری گوٹ لگا دی گئی ہے اس قسم کی شریک زندگی ایک شوہر کو کس قدر سربلند کر سکتی ہے اسکا اندازہ ہر ایک نہیں کر سکتا حد یہ ہے کہ وہ شریک سفر دھول دھپڑ اور سردی کھانیوالا مسافر بھی نہیں کر سکتا جو جمال ہمنشین کی دولت سے مالامال ہونے کے باوجود محروم تھا۔ دراصل یہ لوگ آدمی تھوڑے ہوتے ہیں چوپائے ہوتے ہیں مگر اسوقت ہمارا مستقبل ہمارے پیش نظر تھا۔ چمکتا ہوا جگمگاتا ہوا۔ معطر معطر۔ لطیف لطیف۔ حسین حسین۔ بات یہ ہے کہ زندگی کا بہت بڑا حصہ اسی شرمندگی میں گذر گیا ہے۔ کہ کوئی تقریب ہو، کوئی اجتماع ہو، کوئی محفل ہو ہم اپنی اہل خانہ کو ساتھ نہیں لیجا سکتے۔ سب اپنی اپنی بیویوں کو چمکائے ہوئے اور خود چمکتے ہوئے آتے ہیں اور ہم "واحد حاضر" بنے ہوئے ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ نہ ہوتی بیوی تو کوئی غم نہ تھا مگر بیوی موجود اور ہم تنہا۔ خلوت آباد جلوت ویران۔ گھر میں عیالدار اور باہر بیچارے بات یہ ہے کہ ڈرتے ہیں کہ کہیں

غلط ساری باندھ کر نہ پہونچ جائیں، کوئی بھونڈی بات نہ کہدیں۔ سر کے بال گنواروں کی طرح نہ سمجھ لیئے جائیں۔ ساری۔ جمپر۔ جوتے اور موزے کے رنگوں کا توازن اور تناسب مضحکہ خیز نہ ہو جائے یہ تمام اندیشے محض اس لیئے ہیں کہ بیگم صاحبہ کی تربیت بحیثیت ایک "بٹیا" کے ہوئی ہے بحیثیت "مس بابا" کے نہیں ہوئی ہے۔ اسکول اور کالج میں پڑھی ہوئی نہیں ہیں۔ ایسی بیوی کو کسی محفل میں لیجانا کسی وقت بھی خطرے سے خالی نہیں۔ مگر۔۔۔۔ اب انشاء اللہ العزیز یہ کمی پوری ہو جائیگی اب ہم بھی سوسائٹی میں بیوی کا، فر والا کوٹ اپنے کندھوں پر ڈال کر احباب سے سرخروئی کے ساتھ بات کر سکیں گے۔ اور اب ہماری مسز کے بھی نقرئی۔ طلائی اور گنگا جمنی قہقہے پارٹیوں کے سبزہ زاروں پر زمزمے برساتے اور رقص کرتے نظر آئیں گے۔ ہمارے منہ میں سگار ہے ہاتھ کی جیب میں اور ٹہل رہے ہیں وہ ایک حسین تیتری کی طرح اس صوفے سے اس صوفے پر اور اس صوفے سے اس صوفے پر اڑتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ ہائے کیا زندگی ہوگی۔ سوچتے سوچتے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور دل خود بخود گنگنانے لگا۔

ع میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہی فصل بہار پر

یکا یک رضائی میں پھر جنبش ہوئی۔ ستارے جھلملائے۔ نظریں بہکیں۔ ریشم کے چھوٹے سے سمندر میں ہلکا سا طوفان آیا اور معلوم ہوا کہ ان کو کچھ زیادہ سردی لگ رہی ہے اسلیئے کہ پیر کچھ سکڑ گئے تھے اور رضائی کے نیچے جسم کچھ سمٹا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔ دل نے نعرہ

ایک لاجواب تدبیر سجھائی اور دماغ نے تائید کی ہم ایک دم بستر سے نکل کر ٹرین کے فرش پر کھڑے ہو گئے۔ ولایتی کمبل اٹھا کر اس زرکار رضائی پر آہستہ سے ڈال دیا۔ دیکھئے اس کو کہتے ہیں۔ سوجھ بوجھ، گویا وہ سوتی ہی رہیں اور ہم نے اپنا جادو جگایا اب جب وہ بیدار ہونگی اور اپنے اوپر اس کمبل کو دیکھیں گی تو ان کے سوالیہ نشان بنے بنے ہوئے حسین چہرہ کے سامنے ہمارا صرف مسکرا دینا کافی ہوگا۔ اور اس مسکراہٹ پر ان کی وہ محبوب شکر گزاری اور ہماری شرافت کا وہ خاموش اعتراف بجائے خود نہایت لاجواب قسم کا تعارف ہوگا۔ اس قسم کے تعارف میں عدم واقفیت والی بیگانگی اور تکلف بالکل نہیں ہوتا بلکہ دراصل تعارف تو پہلے ہی حاصل ہو چکتا ہے کچھ یوں ہی سی خانہ پری باقی رہ جاتی ہے مقصد تو یہ ہے کہ ان کے دل میں جگہ پیدا کرنے کا ذریعہ چونکہ رسمی تعارف نہ ہو سکتا تھا۔ لہذا سبحان اللہ یہ ترکیب ذہن میں آگئی۔ اور ہم خوش ہو کر گنگنانے لگے۔ ؎

ہائے اس اون کے کمبل کی یہ قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو محبوب کی سردی کھونا

ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی۔ شاید کوئی اسٹیشن قریب تھا۔ چند ہچکولے کھانے کے بعد ٹرین ٹھہر گئی اور ٹرین کے ٹھہرتے ہی ہمارے ہی ڈبہ میں مسافروں کا وہ سیلاب آیا کہ الٰہی توبہ۔ گٹھری نما پگڑ باندھے ہوئے درجنوں لٹھ بند۔ گھونگھٹ نکالے ہوئے بچوں کو چمٹائے بیسیوں عورتیں۔ اور پھر ان سب کا سامان بستر۔ پوٹلے۔ پوٹلیاں

مختلف قسم کی ترکاریوں کے جھابے۔ برتنوں کی بوریاں، گھی کے پیپے، حقے، ٹوکرے، ٹوکریاں، ایک آفت ہی آ گئی۔ کسی نے کسی کے سر پر قدم رنجہ فرمایا تو کوئی کسی کا نے پانک بن کر گود میں بیٹھ گیا۔ کوئی کسی سے ہاتھا پائی میں مصروف ہو گیا۔ اور کسی نے محض بحث و مباحثہ کو کافی سمجھا۔ خود ہمارے بستر پر ایک محترمہ ایک گز کا گھونگھٹ نکالے اپنے لختِ جگر کو کلیجہ سے لگائے دودھ پلا رہی تھیں۔ اور ان کے دوسرے صاحبزادے ہمارے پھول دار تکیہ پر بیٹھے اپنے والد بزرگوار کو بھی وہیں بیٹھ جانے کی تاکید فرما رہے تھے مگر خود ہم اپنے بستر کی طرف سے بے فکر رضائی ڈالی کا سپر بنے کھڑے تھے کہ کوئی اُن کے خواب ناز میں مخل نہ ہو۔ مگر آخر کب تک؟ جب لوگوں کو کہیں جگہ نہ ملی تو ادھر بھی متوجہ ہوئے اور ہم نے ایک گنوار کو ڈھکیلتے ہوئے کہا۔

"آنکھیں ہیں منہ پر یا نہیں، دیکھ رہے ہو کہ ایک عورت لیٹی ہے۔ اور گھسے پڑتے ہو۔"

"لیٹی ہیں تو اٹھا کے بٹھا دو نا ان کو بابو جی۔ ہم آخر کہاں بیٹھیں گے؟ کلوا کی ماں بیٹھ ادھر تو۔"

"نہیں یہاں کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔"

"بیٹھ کیسے نہیں سکتا۔ ہم نے بھی ٹکٹ لیا ہے۔"

"نہیں مانو گے تم، ارے بھائی کہیں اور بیٹھ جاؤ۔ میرے بستر پر بیٹھ جاؤ۔"

رضائی کو پھر جنبش ہوئی۔ کمبل کھسکا۔ تارے جگمگائے اور "استغفراللہ" کہتے ہوئے ایک بزرگ رضائی سے برآمد ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم نے مسافروں سے لڑتے لڑتے ان بزرگ کو دیکھا۔ اگر گاڑی کھڑی نہ ہوتی تو شاید زنجیر کھینچ لینے کو دل چاہتا۔ مگر اب اس بوڑھی گھوڑی کی وہ لال لگام دیکھ رہے تھے۔ جس پر کامدانی کا ہر تارہ معلوم نہیں رو رہا تھا یا ہنس رہا تھا۔ دھوتی اور ڈھیلے والا مسافر اب تک بیٹھا ہوا سو رہا تھا۔ اور کمبل کے باوجود ہماری نیند غائب تھی۔



ہائے میں فدا ہو جاؤں ــــ!!!

دریائے گومتی کے کنارے سرکاری طور پر ایک شہر آباد ہے جس کو لکھنؤ کہتے کہتے ہیں۔ مگر ماہرین آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ یہ ہرگز وہ لکھنؤ نہیں ہے جو دراصل لکھنؤ تھا۔ بلکہ خاص لکھنؤ اسی لکھنؤ میں خدا جانے کہاں روپوش ہو گیا ہے۔ اور ہم سب کے پیش نظر بناسپتی لکھنؤ ہے جس کو لکھنؤ کہنے کے لیے ہم اس لیے مجبور ہیں کہ اسٹیشن پر یہی نام لکھا ہوا ہے۔ خاص لکھنؤ کے روپوش ہونے کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں۔ مگر سب سے زیادہ قرین قیاس یہ روایت ہے کہ بیرونی میل جول سے بچانے اور ٹکسال باہر کو ٹکسال اندر کرنے کے خوف سے لکھنؤ وانستہ چھپا دیا گیا ہے اور اس کا پتہ ایک ایسا راز ہے جس کے جاننے والے رفتہ رفتہ کم ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی یہ راز روز بروز محفوظ ہو رہا ہے۔ لکھنؤ کے محل وقوع کے راز میں ہونے کی وجہ سے حدود اربعہ بھی

ڈاواں ڈول پھر رہا ہے اور بڑے بڑے سراغ رسانوں کا خیال یہ ہے کہ جس دن حدود اربعہ مقرر اور متعین ہوگیا۔ محل وقوع کا پتہ لگنا اور زیادہ مشکل نہ رہیگا۔ چند چیزیں جو مدّت کی کوششوں کے بعد معلوم ہو سکی ہیں۔ وہ بہت امید افزا ہیں۔ مثلاً آب و ہوا کے متعلق خیال یہ ہے کہ وہ اب تک جوں کی توں ہے بشرطیکہ آب و ہوا دونوں کو علیحدہ علیحدہ نہ کیا جائے۔ ورنہ اُن دونوں کے علیحدہ ہو جانے کی صورت میں اندازہ آسانی سے ہو سکتا ہے کہ خالص لکھنؤ میں نہ آب تھا نہ ہوا ۔ اس لیے کہ اگر یہ دونوں چیزیں ہوتیں تو میونسپل بورڈ کو نلوں کے ذریعہ آب کا اور بجلی کمپنی کو پنکھوں کے ذریعہ ہوا کا انتظام کرنے کی زحمت ہرگز نہ ہوتی بلکہ یہ دونوں محکمے کچھ اور مفید خدمات انجام دیتے جدید لکھنؤ کو جب یہ محسوس ہوا کہ زندگی کے لیے ہوا اور پانی بھی ضروری ہیں۔ تو انہوں نے دو محکمے خاص طور پر ان ہی اغراض کے لیے قائم کیے۔ چنانچہ اب پانی ملے یا نہ ملے مگر جن گھروں میں نل ہیں وہاں یہ اطمینان ضرور رہتا ہے کہ اگر پانی ہوگا تو ملے گا ضرور۔ بالائی مکانات چونکہ لکھنؤ کی عام سطح سے بلند ہوتے ہیں لہذا وہ حدود میونسپلٹی میں نہیں آتے۔ اور وہاں تک پانی پہنچانے کی کوئی اخلاقی ذمہ داری بھی مشکل ہی سے لی جا سکتی ہے۔

عام آب و ہوا کی طرف سے اہل شہر اب مطمئن ہیں کہ اس کے بدولت کم سے کم آبادی بڑھنے نہیں پاتی۔ لکھنؤ کی کشش نے سارے ہندوستان کو اپنی طرف سمیٹ لیا تھا اور اندیشہ تھا کہ لکھنؤ کو ہندوستان نہ بننا پڑے۔ اس لیے بہت

دنوں کی کوششوں کے بعد اب آب و ہوا کو ایسا بنایا جا سکا ہے کہ آبادی کا توازن قائم رہے۔ طرح طرح کے وبائی امراض ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لائے گئے۔ اور ان کو جدید سائنٹیفک اصولوں سے ترقی دی گئی۔ تو اب آبادی کے سلسلہ میں آمد و خرچ برابر ہو سکا ہے اور انتظام ایسا ہو گیا ہے کہ آئندہ بھی یہ توازن گڑبڑ نہ ہونے پائے گا۔

آبادی کے سلسلہ میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ کی ذاتی آبادی اب کچھ نہیں ہے لوگ باہر سے آکر آباد ہو جاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لکھنوی بن کر رہ جائیں۔ اس سرزمین نے جن کو پیدا نہیں کیا ہے۔ ان کو بھی نہایت شفقت سے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے پھر یہی لوگ اپنے نام کے ساتھ لکھنوی لکھ لکھ کر یہ ثابت کرتے رہتے ہیں۔ کہ لکھنؤ کی اپنی ذاتی آبادی بھی ہے اور لکھنؤ ہر چند کہ نہیں ہے مگر ہے ضرور۔

جن چیزوں کا اب تک پتہ چل چکا ہے ان میں سے ایک پیداوار بھی باہر لکھنؤ کی خاص پیداوار یہاں کے شاعر ہیں جو عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ اور اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ گذشتہ مردم شماری کے اعداد سے شاعروں کی تعداد زیادہ تھی۔ شاعر لکھنؤ میں اس شخص جگہ یا چیز کو کہتے ہیں جس کے نام کے ساتھ ایک تخلص بھی لگا ہو۔ لکھنؤ کی یہ مخلوق شعر کہتی اور داد کے سہارے جیتی ہے۔ اس مقصد کے لیے آئے دن مشاعرے منعقد ہوتے

رہتے ہیں تاکہ داد ملتی رہے اور شاعر باقی رہیں اس پیداوار کو فروغ دینے کے لئے اس کی عام اجازت ہے کہ جس کا جی چاہے شاعر بن جائے نہ کوئی اخلاقی پابندی ہے نہ کوئی قانونی روک تھام۔ مشاعرے بھی بغیر حکام کی اجازت حاصل کئے ہوتے رہتے ہیں۔ اور قابل دست اندازی پولیس نہیں سمجھے جاتے۔

تجارت کے سلسلہ میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ ہمیشہ سے تاجر ہونے کے بجائے گاہک ہونا پسند کرتا چلا آیا ہے۔ پھر بھی چونکہ ایک شہر کے لیے بازاروں کا ہونا اور بازاروں میں دکانوں کا ہونا ضروری ہے۔ لہذا یہاں بھی کنکوؤں کی تجارت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ویسے بالائی اور شیرمالوں کی دکانیں بھی پائی جاتی ہیں۔ بید مشک کی کھپت بھی زیادہ ہے۔ اور دکانیں بھی کافی ہیں۔ مگر یہ تجارت کوئی نفع کی غرض سے نہیں کی جاتی بلکہ محض اخلاقاً اور اس طرح کہ گویا مقطع میں سخن گسترانہ بات آ پڑے۔

صنعت و حرفت کے سلسلہ میں لکھنؤ کو خاص شہرت حاصل رہی ہے یہاں کی خاص صنعت یہاں کی زبان ہے زبان کے بہت بڑے بڑے کارخانے ہیں جہاں زبان ڈھالی جاتی ہے محاورے تیار کئے جاتے ہیں۔ تیار شدہ محاوروں کی مرمت ہوتی ہے۔ زبان کے عیوب نکالے جاتے ہیں اس کو صاف کیا جاتا ہے اس میں شیرینی پیدا کی جاتی ہے اس کو نرم اور لطیف بنایا جاتا ہے۔ اس میں نہایت دل آویز لوچ اور نہایت دلکش لچک پیدا کی جاتی ہے باہر سے

آئی ہوئی زبان درازیوں کو جانچا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ زبان کے سلسلہ میں تمام خدمات انجام پاتی ہیں حرفت میں یہاں کا تکلف خاص طور پر مشہور رہا ہے اس میں علم مجالس نشست و برخاست۔ ملنے جلنے۔ بات کرنے۔ کپڑا پہننے۔ کھانا کھانے مختصر یہ کہ ہر موقع کے لیے پُر تکلف آداب وضع کیے جاتے ہیں اور جو آداب وضع ہو چکے ہیں۔ ان کی حفاظت کی جاتی ہے بات کرنے کے اوزان مقرر ہیں اور ان اوزان کی پابندی سے بات کرنا بجائے خود صنعت بھی ہے اور حرفت بھی۔

تعلیم کے سلسلہ میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ یہاں تعلیم کی چنداں ضرورت نہیں۔ تعلیم کا مقصد شعور پیدا کرنا ہے اور شعور یہاں بغیر تعلیم کے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لہذا اس تضیعِ اوقات کی ضرورت بہت کم محسوس کی جاتی ہے۔ پھر بھی بہت سی بیکار چیزوں کی طرح یہاں بھی کافی تعلیمی ادارے ہیں جن میں کھیل کود کا شغل رہتا ہے۔

روزگار عموماً بے روزگاری کا ہے اور اگر بے روزگاری کا سلیقہ کسی خطہ میں پایا جاتا ہے تو لکھنؤ میں، یہاں کا بے روزگار سے بے روزگار انسان بھی اس قدر مصروف نظر آتا ہے۔ گویا بیک وقت کئی محکموں کا انچارج ہے یہاں تک کہ آپ اس کو بے روزگار کہنے کی جرأت مشکل ہی سے پیدا کر سکتے ہیں عام حالات یہ ہیں کہ یہاں کبھی عام حالات پیدا نہیں ہوتے۔ ہر عمومیت

میں ایک نہ ایک خصوصیت ضرور ہوتی ہے۔ یہاں کی غریبی بھی عام غریبی سے مختلف ہے اور امیری بھی عام امیری سے جداگانہ۔ غرباء میں ایک خاص وقار اور امراء میں ایک خاص انکسار بھی پایا جاتا ہے۔ اپنی اصل حالت کوئی کسی کو نہیں بتاتا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بات بھی عام نہیں ہونے پاتی اور کسی قسم کے حالات عام حالات نہیں بنتے۔

انہی باتوں کے معلوم کر لینے کے بعد بھی سراغ رسانوں کو گمشدہ لکھنؤ کا اب تک پتہ نہیں چلا مگر تحقیقات جاری ہے اور تفصیلات کا انتظار، خیال غالب ہے کہ لکھنؤ اگر واقعی اب تک موجود ہے تو ضرور مل کر رہے گا۔ اور ایک مرتبہ مل جانے کے بعد پھر اس کا گم ہونا اس محکمہ آثارِ قدیمہ کے دور میں آسان نہ رہے گا۔

کہا جاتا ہے کہ۔

ع۔ خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے

اس ایک مصرعہ میں "پھر" اور "غنیمت" لکھنؤ کی بربادی پر بہے ہوئے دو آنسو ہیں۔ جس "پھر بھی غنیمت" لکھنؤ کو ہم اب دیکھ رہے ہیں وہ بھی اس تیزی سے اپنی روایات کو بھلا رہا ہے کہ کچھ ہی دنوں میں اس مصرعہ کا "پھر" اور اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے "غنیمت" بھی غائب ہو جائیگا۔ البتہ یہ دعا

شائد مقبول ہوجائے کہ لکھنؤ آباد ضرور رہے گا۔ مگر اپنی لکھنویت کے ساتھ نہیں بلکہ ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں کی طرح کا ایک شہر بن کر لکھنؤ کے متعلق معلوم نہیں یہ نیک فال ہے یا بدشگونی بہرحال جو کچھ بھی ہے اس کے آثار اب خود لکھنؤ میں نظر آنے لگے ہیں کہ لکھنؤ کی جس تہذیب اور تکلف کا مذاق باہر والے اڑایا کرتے تھے۔ اب اسی تہذیب اور تکلف پر خود بخود مسکرانے لگا ہے۔ پہلے آپ' اور نہیں حضرت پہلے آپ، قسم کے تکلفات پر پہلے وہ لوگ ہنسا کرتے تھے جو ان آداب کی پابندی کرنا نہیں جانتے تھے۔ لیکن اب ان آداب کو بھولنے والے بھی لکھنؤی تہذیب کی ان نزاکتوں کو چونچلہ اور ڈھکوسلہ وغیرہ کہہ کر ان تکلفات کو اپنے لیے تکلیف دہ پاتے ہیں۔ اور خدا بھلا کرے ذوق کا، جو ان بے تکلف لوگوں کے لیے ایک سدا بہار عذرِ لنگ ارشاد فرما گئے ہیں کہ ؎

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے ہیں وہ جو تکلف نہیں کرتے

مگر تکلف کی گہرائیوں میں جائیے تو تکلف کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے۔ حضرت آدم نے پتوں سے ستر پوشی کی تھی یہ تمام بالوں کی آرائشیں لباسوں کی کانٹ چھانٹ اور اسی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں ہر قسم کا سلیقہ سوائے تکلف کے اور ہے کیا۔ گو آرام سے وہ رہ سکتے ہیں جو انسانیت کے قریب ہی نہ آئیں۔ اور

چوپایوں کی بے تکلفی سے سبق لیں۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ نے تکلفات کی حد کر دی تھی۔ مگر اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ شاہی زمانے کے تمام درباری تکلف اہل لکھنؤ کے لیئے روز مرہ بن گئے تھے۔ اور چونکہ وہ ان تکلفات کے عادی ہو گئے تھے۔ لہٰذا ان کو کوئی تکلیف نہ ہوتی تھی۔ اور ان کی شائستگی خود ان کے لیئے ایک بے ساختہ سی چیز بن کر رہ گئی تھی۔ علم مجلس نشست و برخواست صرف مجلسی زندگی تک محدود نہ تھا۔ بلکہ گھر میں اور باہر یکساں قسم کی باقاعدگی سی معلوم ہوتی تھی۔ برابر والوں سے ملنے، چھوٹوں سے ملنے اور بڑوں سے ملنے کے کچھ الگ الگ آداب تھے۔ جن کی پابندی وہ اپنے اوپر فرض سمجھتے تھے تاکہ ان کی شاہانہ تہذیب اور لکھنؤ کی شائستگی پر حرف نہ آئے۔ اسی مہذب نشست و برخواست سے صاحب محفل نہایت خاموشی کے ساتھ اہل محفل کو یہ بتا دیتا تھا کہ ہر نئے آنے والے سے اس کے تعلقات کس قسم کے ہیں اور اسکا درجہ اس کی نظروں میں کیا ہے۔ مثلاً کسی کے لیئے سرو قد کھڑے ہو کر اور لب فرش تک جا کر استقبال کرنے کے معنی یہ ہوئے کہ آنے والا صاحب محفل کے لیئے بزرگ و برتر کا درجہ رکھتا ہے اور چونکہ صاحب محفل ان کو یہ عزت دے رہا ہے لہٰذا تمام اہل محفل پر اسکا احترام فرض ہے۔ سب کھڑے ہو جائیں گے اور اس وقت تک کھڑے رہیں گے جب تک کہ وہ بیٹھ نہ جائے کوئی اس سے کم مرتبہ کا شخص آیا تو

صاحب محفل صرف کھڑے ہو کر تعظیم دیں گے۔ لب فرش تک جانے کی ضرورت نہیں۔ اس سے بھی کم درجہ کا شخص آیا تو صرف ساٹھ ڈگری کے زاویہ تک اُٹھنا کافی ہوگا کسی کے لیۓ محض تیس ہی ڈگری کا زاویہ کافی ہوگا۔ اور کسی کے لیۓ بیٹھے ہی بیٹھے یہ کہدینا کافی ہے کہ "تشریف لائیے جناب" یا کوئی بے تکلف دوست آگیا تو نہایت تکلف کے ساتھ بے تکلفی ہوگئی کہ "تشریف لایئے سرکار!" ع

بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے

کسی اور نے ایک چھینٹا مارا کہ حضرت :-

"ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا"

ایک تیسرے دوست نے برجستہ کہدیا:-

"کہیں یہ نہ پوچھ لیجۓ کہ عنان گیر کون تھا"

مگر یہ باتکلف بے تکلفی بھی ان بزرگ کی موجودگی میں مشکل ہی سے ہو سکتی ہے جن کے لیۓ لب فرش تک استقبال کیا گیا تھا۔ ان کے سامنے تو خود صاحب محفل ان کو صدر میں بٹھا کر دوزانو بیٹھیں گے۔ ان کو کوئی چیز پیش کریں گے تو کھڑے ہو کر ان سے کوئی چیز لیں گے تو متعدد تسلیمات کے بعد مگر ایسے بزرگ خود بھی خوردوں کی محفل میں زیادہ نہ ٹھہرتے تھے۔ مگر ان کے تشریف لے جانے کے بعد بھی برابر والے بے تکلف دوستوں کی اس محفل میں بھی شائستگی باقی رہتی تھی۔ کوئی ایک دوسرے کی طرف پشت کر کے نہ

نہ بیٹھنا۔ گفتگو میں بھی آپ اور جناب۔ حضور، اور سرکار۔ حضرت اور بندہ نواز کے علاوہ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا۔ کہ کوئی ایسی بات بے تکلفی میں بھی زبان سے نہ نکل جائے جس سے کسی کی ہتک کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ یا مخاطب کو یہ محسوس ہو سکے کہ اس کی عزت کرنے میں کوتاہی سے کام لیا جا رہا ہے پیچوان اور خاصدان تک کے پیش کرنے میں اس قسم کی احتیاطوں سے کام لیا جاتا تھا۔ کہ ملازم صاحب محفل کے پاس پیچوان یا خاصدان رکھ گیا ہے تو خود صاحب محفل اٹھ اٹھ کر حاضرین کو پیش کریں گے اور حاضرین کھڑے ہو ہو کر یا مختلف زاویوں سے کھڑے ہو کر سلام کر کر کے لیں گے۔ بذلہ سنجیاں ہوں گی۔ لطیفہ گوئیاں ہوں گی۔ شعر و شاعری کا ذوق ہے تو اس کا چرچا رہے گا۔ علمی ذوق ہے تو علمی مباحث چھڑ جائیں گے۔ مگر جو کچھ بھی ہوگا تہذیب کے دائرے میں۔ اگر کسی نے کسی کے لطیفے کی داد دی۔ اور وہ آداب بجا لاکر کھڑا ہو گیا۔ کسی نے کسی کے شعر کو سراہا اور وہ تسلیمات عرض کرتا ہوا دست بستہ ہو گیا کہ "میں کس قابل ہوں یہ سب ذوقِ سماعت ہے" یا شعر پیش کرتے ہوئے خاص طور پر توجہ دلانے کے لیے اپنے بہت اچھے شعر کو یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ "شاید کسی قابل ہو" یہ چند باتیں بھولے ہوئے سبق کی طرح لکھنؤ کے مشاعروں میں اب تک نظر آجاتی ہیں۔ مگر اب وہ مشاعرے بھی ختم ہو رہے ہیں۔ فرش

کی جگہ مشاعرے کرسیوں پر ہونے لگے ہیں۔ دور مشاعرہ قائم ہونے کے بجائے پلیٹ فارم اور اسٹیج کا رواج بڑھ رہا ہے۔ شمع محفل کب کی گل ہو چکی۔ پیچوانوں کی جگہ مشاعروں میں سگریٹ اُچھلنے لگے ہیں۔ اور پانوں کی شاہانہ منڈھی کاغذی ہانڈیوں کی جگہ رکابیوں میں بیا بیڑے تقسیم ہوتے ہیں۔ مگر اس قسم کے فقرے مشاعروں میں اب تک سننے میں آ جاتے ہیں" کہ آداب بجا لاتا ہوں۔ دل بڑھاتے ہیں آپ، ملاحظہ ہو شاید کوئی نئی بات عرض کی ہے" ورنہ اب تو مشاعروں کا یہ رنگ ہے کہ داد کی جگہ تالیاں بجتی ہیں۔ اور شاعر سلام کرنے کی اس طرح اکڑ جاتا ہے کہ سلام کس بات کا۔ زمانہ ہمارا ایک حق تھا جو ہم کو ملا کسی نے بخشش تھوڑی دی ہے کہ سلام کیا جائے۔

سلام پر یاد آیا کہ لکھنؤ کے "آداب عرض" اور "تسلیمات عرض" پر بھی لوگ ہنستے ہیں کہ یہ کلائی کے قریب کوئی کمانی فٹ ہوتی ہے۔ یا کیا کہ ایک سلام کرنے کے لیے خدا جانے جلدی جلدی کتنی ہی جنبشیں دے دی جاتی ہیں۔ ورنہ سلام کا عام طریقہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ پیشانی کی طرف ہاتھ گیا اور قصہ ختم، ہو گیا سلام، یہ کیا کھڑے لچکا رہے ہیں ہاتھ بید کی طرح، اور تسلیم بھی نہیں بلکہ کہہ رہے ہیں۔ تسلیمات کو نشانہ اس بات پر ہنسنے کی جگہ اگر ذرا بھی غور کیا جاتا تو یہ بات سمجھ میں آ سکتی

تھی۔ سلام کا یہ طریقہ بھی شاہی دربار سے نکلی ہوئی ایک چیز تھا۔ دربار میں سلاموں کی تعداد مقرر تھی۔ اسی طرح امراء کے لئے بھی سلام مقرر تھے۔ مثلاً سات سلام یا پانچ سلام یا تین سلام، سلام کا مقصد تعظیم دینا ہے اور سلام ہمیشہ چھوٹا بڑے کو کرتا ہے۔ لہذا لکھنؤ کے سعادت مند خوردوں نے اپنے شفیق بزرگوں کو وہی تعظیم دینا شروع کر دی جو رعایا بادشاہ کو دیتی ہے یا غریب امیر کو دیتے ہیں۔ تسلیم کے بجائے تسلیمات اور کورنش کی جگہ کورنشات کا متعدد سلاموں سے مطلب ہے کلائی کو بار بار جنبش دینے کا مقصد بھی یہی ہے کہ کئی سلام کر لیے۔ اسی طرح "آداب بجا لاتا ہوں" کا تفصیلی مطلب ہے کہ وہ تمام آداب بجا لاتا ہوں۔ جو ایک خورد کو اپنے بزرگ کے سامنے، ایک کمتر کو اپنے بہتر کے سامنے جھک کر متعدد سلام کر کے اور دست بستہ کھڑے ہو کر بجا لانا چاہیں۔

اسی طرح لکھنؤ کے لب و لہجہ میں اور گفتگو میں "چناں چنیں" یہ بھی لوگ سنتے ہیں۔ مگر اس پہ بھی غور کیا جائے تو شاہان اودھ کی وہ تاریخ سامنے آ جائے گی۔ جس نے یہ تمام طریقے اپنے دربار میں پروان چڑھائے تھے۔ شاہان اودھ کی دلچسپیوں کے مرکز ان کے محلات ہوا کرتے تھے۔ وقت کا بیشتر حصہ بیگمات کے ساتھ گذرتا تھا لہذا قدرتی طور پر زبان

ہیں وہی لوچ اور نزاکت پیدا ہو گئی۔ جو بیگمات کی زبان میں ہوا کرتی تھی۔ لب و لہجہ میں بھی نسائیت سما گئی اور بادشاہ نے سرِ دربار بھی یہی محلسرائی زبان اختیار کی نتیجہ یہ ہوا کہ اہل دربار کی زبان بھی وہی بن گئی اور رفتہ رفتہ لکھنؤ کی اصل زبان بیگماتی زبان قرار پائی مگر اس میں شک نہیں کہ اس زبان کی لطافت کچھ اور نکھر آئی عام زبان اور خاص زبان میں پتھراؤ اور گل افشانی کا نمایاں فرق محسوس ہونے لگا مثلاً ایک معمولی سا فقرہ ہے:"والد صاحب مرحوم و مغفور کہا کرتے تھے" اسی بات کو اگر یوں کہا جائے کہ" ابّا جانی جنت مکانی کا ارشاد تھا" اب دونوں کا نمایاں فرق محسوس کریئے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے جملے نے سماعت پر کچھ پتھر برسائے تھے اور اس جملہ نے پھول برسائے ہیں۔ والد صاحب مرحوم و مغفور میں وہ محبت بھی محسوس نہیں ہوتی جو ابّا جانی جنت مکانی میں ہے۔

رہ گیا "چناں چنیں" والا اعتراض، یہ ہے تو درست مگر اس کی وجہ بھی زیادہ تر شائستگی ہے۔ لکھنؤ کی شاہانہ تہذیب نے اس کی اجازت کبھی نہ دی کہ کسی ناگوار بات کو براہ راست ناگوار طریقہ پر ادا کر دیا جائے۔ اگر ایک ناگوار بات بھی خوشگوار طریقہ پر کہی جا سکتی ہے تو کیوں نہ کہی جائے۔ مثلاً غصہ میں کسی سے یہ کہنا کہ میں تمہاری شرارتوں کو خوب

سمجھتا ہوں۔ پھر میں جو کچھ کہونگا تو تم کو بُرا لگے گا"۔ بظاہر اس جملہ میں بھی غصہ کو دبیکتے ہوئے شائستگی موجود ہے مگر اس موقع پر ایک خالص لکھنوی کچھ اور ہی کہے گا اس کے تیور ہی کچھ اور ہونگے۔ وہ پہلے تو غصہ کو پیئے گا پھر شائستگی کا سہارا لیکر سنبھلے گا اور آخر میں یہ کہہ دیگا۔ کہ:۔

آپ ہی اپنے ذرا لطف وکرم کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

شرارت کی جگہ لطف وکرم کہنا "چناں چنیں" ہے مگر غور تو کیجئے شرارت میں وہ زہر نہیں ہے جو لطف وکرم میں ہے اس قسم کی چناں چنیں ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے کہاں تک کوئی کونین پر شکر لپیٹنے کا خیال رکھ سکتا ہے مگر اہل لکھنؤ جو اپنی اس خصوصیت کو بھولتے جاتے ہیں پہلے بے تکلفی اور روانی کے ساتھ اسی قسم کی گفتگو کیا کرتے اور اس ورپاری احتیاط نے رفتہ رفتہ عادت کی صورت اختیار کر لی تھی۔

اور کچھ نہ بھی سہی تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اس تکلف اور شائستگی نے لکھنؤ میں جو بلا کی قوت برداشت اخلاق کے نام سے پیدا کر دی تھی اسکا اب کہیں پتہ نہیں چلتا کسی کے ساتھ ہمدردی کرنا یا نہ کرنا یہ دوسری بات ہے مگر ایک دوسرے کا درد دل انتہائی یگانگت کے ساتھ سنتے تھے اور اس قسم کی گفتگو کرتے تھے کہ پریشان حال کو محض الفاظ سے تسکین ہو جایا کرتی تھی۔ آجکل کی سوسائٹی میں

تو اگر کوئی شخص اپنی ماں یا باپ کی بیماری کا ذکر کر دے تو لوگ اس کو بدتمیز سمجھتے ہیں۔ مگر ذرا دیکھیے ان باوضع اہل لکھنؤ کو جو احباب کی بٹیروں تک کا حال پوری ہمدردی سے دلچسپی سے گھنٹوں سنا کرتے تھے اور کیا مجال کہ چہرہ پر ذرا بھی بے توجہی پائی جائے۔ کسی کا بس یہ کہہ دینا شرط ہے کہ:۔

”کیا عرض کیا جائے بٹیر جنگ کی علالت نے اور بھی رہے سہے اوسان کھو دیے ہیں۔“

دوسرے صاحب فوراً تشویش کیساتھ کہتے ”نصیب دشمناں کب سے علیل ہے؟“

تیسرے صاحب بولتے ”حضرت علیل کیا ہے ہمیشہ بھائی صاحب سے عرض کیا کہ نظر اتار دیا کریں۔ میری آنکھوں میں خاک اس کے تیور ہی ایسے ہیں کہ نظر لگ جائے پچھلی پالی میں دیکھا نہیں آپ نے۔ چشم بددور وہ پٹھا تان کر کھڑا ہوا ہے کہ میرا تو کلیجہ دھک سے ہو گیا تھا کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے بلکہ میں نے بھائی صاحب کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ پیشانی پر کاجل کا ٹیکہ لگا دیں یا کوئی سیاہ ڈورا گلے میں باندھ دیں۔

بٹیر والے صاحب فرماتے ہیں ”حضرت کونسی جھاڑ پھونک ایسی تھی جو نہ کی ہو اب میرن صاحب کے نسخے سے کچھ افاقہ ہوا ہے۔“

دوسرے صاحب کہتے ہیں ”بھئی شکر ہے کہ افاقہ کا مژدہ تو سنا میرے تو پیروں تلے کی زمین ہی نکل گئی تھی۔“

یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی بٹیر کی جان ہرگز عزیز نہ ہوگی۔ مگر مروّت بھی کوئی چیز ہے۔ ایک دوست کی اس تفریحی مصیبت تک سے سب بظاہر پریشان ہو گئے۔ اس دوست کو کچھ اور نہیں تو کم از کم یہ اندازہ تو ضرور ہوا ہوگا کہ مجھ سے ہمدردی کرنیوالے اس دنیا میں موجود ہیں جو بٹیر کی بیماری پر اس قدر ہمدردی کر سکتے ہیں وہ انسان کی بیماری پر تو ظاہر ہے کہ اس سے بھی کچھ آگے بڑھ جاتے ہونگے۔ مگر اب تو وہ مروت، وہ ہمدردی اور وہ رفاقت ہی تاریخ بن کے رہ گئی ہے۔ بٹیر کی علالت پر ہنسنے کو سب ہنس دینگے مگر بٹیر کے بہانے جس اخلاق کا مظاہرہ ہوا ہے اسکی گمشدگی پر رونیوالا ایک بھی نہ ہوگا بلکہ کہنے والے ڈھٹائی سے یہی کہدیں گے کہ شکر ہے وہ ریاکاری گئی۔ حالانکہ یہ کہنے کا حق اس وقت حاصل ہوتا ہے جب بٹیر کے لئے نہ سہی کسی انسان کے لیئے اس جھوٹی ہمدردی کی طرح کی سچی ہمدردی اپنے اندر پیدا کر لیں۔ جھوٹی ہمدردی تو خیر گئی۔ مگر رونا تو یہ ہے کہ سچی ہمدردی پیدا نہ ہوئی اور جھوٹی بھی ہاتھ سے گئی۔

لکھنؤ کے شاہانہ تکلفات کا تو کہنا ہی کیا۔ یہ تو صرف چند اوپری باتیں ہیں جو دربار سے نکل کر اہل لکھنؤ کی عام زندگی بن گئی تھیں ورنہ درباری لباس، درباری دسترخوان، درباری محفلیں، درباری نشست و برخاست وغیرہ کے تکلفات کا تو اگر ذکر بھی کیا جائے تو لوگ یہی کہیں گے کہ یہ درباری جھوٹا ہے اور ایسے جھوٹے آجکل نہیں ملتے۔

(ختم شد)



www.urdukutabkhanapk.blogspot.com